آسودگانِ خاک

تالیف

مورّخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

۱۹۱۶ء ۱۹۹۶ء

اڈیٹر ماہنامہ البلاغ ممبئی - انڈیا

ترتیب

قاضی سلمان مبشر مبارکپوری

(فاضل دار العلوم دیوبند)

خادم تدریس دار العلوم حسین آباد، انجان شہید ضلع اعظم گڑھ

ناشر

قاضی اطہر اکیڈمی مبارکپور

ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش انڈیا

Mob 993638117/

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمحات سکوں موت ہیں میرے لئے اطہر
طوفان حوادث میں بقاء میرے لیے ہے

زمیں فانی، زماں فانی، مکیں فانی، مکاں فانی
خدا کی ذات باقی ہے، بقیہ کل جہاں فانی

قاضی اطہر مبارکپوری

تفصیل کتاب

سلسلۂ مطبوعات (۵)

نام کتاب : آسودگانِ خاک

تالیف : مورّخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

ترتیب : قاضی سلمان مبشر مبارکپوری

کمپوزنگ : القاضی کمپیوٹر مبارکپور ضلع اعظم گڑھ 9336606298

صفحات : ۳۳۵

باراول ۱۱۰۰

سن طباعت : ۱۴۳۰ھ - ۲۰۰۹ء

ناشر

قاضی اطہر اکیڈمی

مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ، اترپردیش، انڈیا

Tel 0091-5462-250640

Mob 0091-9936381171

شجرۂ نسب خانوادۂ قاضیان

مبارک پور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش انڈیا

قاضی شیخ علی

قاضی شیخ امام بخش

قاضی محمد رضا — قاضی شیخ حسام الدین

قاضی شیخ رجب

میاں جی حاجی لعل محمد — میاں جی ولی محمد

میاں جی محمد شفیع — میاں جی حاجی محمد عمر

میاں جی عبداللہ — میاں جی حاجی اسداللہ — میاں جی حاجی محمد حسین — میاں جی حاجی محمد حسن

مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری — قاضی حیات النبی — قاضی ضیاء النبی — قاضی غلام النبی — قاضی عبدالعزیز

قاضی خالد کمال — قاضی ظفر مسعود — قاضی سلمان مبشر — قاضی حسان احمد

قاضی فوزان طارق — قاضی فرحان احمد — قاضی عدنان احمد — قاضی ریحان احمد

قاضی فیصل — قاضی محمد — قاضی ریان احمد

فہرست مضامین

عرض مرتب

از: قاضی سلمان مبشر مبارکپوری

الحمدللّٰه الذی خلق الانسان ثم اماته فاقبره
والصلوٰة والسلام علیٰ سیدالانبیاء والمرسلین
ومن تبعهٗ باحسان الیٰ یوم الدین۔ اما بعد

والدگرامی مورّخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ تقریباً ۲۵ رسال تک ماہنامہ ''البلاغ'' بمبئی کے اڈیٹر تھے، اس میں آپ کے مضامین اور اہم شخصیات کی وفیات کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔

''آسودگانِ خاک'' آپ کے تعزیتی شذرات ومضامین کا مجموعہ ہے، جو ماہنامہ ''البلاغ'' اور روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی میں وقتاً فوقتاً اشاعت پزیر ہو چکے ہیں، اربابِ کمال کی وفات حسرت آیات پر آپ کا قلم اشکبار رہا ہے اور ایک ایسا بھی وقت آیا کہ آپ کی رحلت پر اہل علم وارباب قلم اشکبار ہوئے، یہی سنت الٰیہ ہے، یعنی **"کل نفس ذائقة الموت"**۔

جن وفات یافتگان کے تاثراتِ غم کو آپ کے قلم نے لفظوں کی قید میں مقید کر رکھا ہے ان کی تعداد دوسو (۲۰۰) ہے، ان میں تقریباً پچاس لوگوں سے آپ کے ذاتی تعلقات، دید وشنید، سفر وحضر میں ساتھ، اجلاس ومدارس میں ملاقات کا سلسلہ اور ان سے علمی ودینی ربط وتعلق رہا ہے۔

ان علمی شخصیتوں میں ہند وپاک اور عرب کے علماء وفضلاء، ادباء وشعراء، زعماء وخطباء، اہل اللہ اور ارباب علم ودانش شامل ہیں، خاص طور سے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند، حضرت

مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم جمعیت علماء ہند، مولانا ابوالوفاء افغانی صدر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد، محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی امیرالہند، مولانا محمد عثمان فارقلیط اڈیٹر روزنامہ اخبار الجمعیت دہلی، مولانا عبدالعزیز راجکوٹی صدر شعبۂ عربی کراچی یونی ورسٹی پاکستان، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی، مولانا سید فخرالدین شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا سید محمد میاں دیوبندی ناظم جمعیت علماء ہند، مولانا محمد یوسف بنوری کراچی پاکستان، شاہ معین الدین ندوی اڈیٹر معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ، مولانا عبدالماجد دریابادی اڈیٹر صدق جدید لکھنؤ، مولانا ابو سلمہ شفیع احمد بہاری، سید علوی مالکی مکی سعودی عرب، الشیخ عبداللہ زمزمی مکی سعودی عرب، ڈاکٹر عبدالمنعم النمر وزیراوقاف قاہرہ مصر ایسے رجال عصر ہیں جن کی خدمات اور کارناموں کی داستان درازتر اور لطیف تر ہے، ان حضرات کی ذات گرامی اور زندگی علم وعمل اور جہد پیہم سے عبارت تھی جو اہل بصیرت کے لیے درسِ عبرت اور نمونۂ عمل ہے، ان علمائے کرام سے مورخ اسلام کے ربط وتعلق کی نوعیت خالص علمی و دینی تھی جو طمع و دنیاوی مقاصد سے بالاتر تھی، ان سے خط وکتابت بھی علمی اور تحقیقی مسائل وموضوعات کے حوالے سے ہوتی تھی، یہ حضرات اپنے وقت کے اساطین علم اور اپنے ہم عصروں میں رجالِ فن شمار کیے جاتے تھے، ان سے قوم وملت کی آبرو قائم تھی، ان کی کتاب زندگی کے مطالعہ سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ حضرات اپنے علم و عمل کے اعتبار سے جہاد بالقلم والسیف کے مردانِ کار تھے انھوں نے ملک وملت اور قوم کی خدمت کیلئے اپنے آپ کو وقف کردیا تھا زندگی کے مختلف میدان میں کارہائے

نمایاں انجام دیئے تھے اور اس راہ میں مشاکل ومصائب سے بھی دوچار ہوئے تھے ان حضرات کی زندگی ہمارے لئے باعث عبرت ونصیحت ہونے کے ساتھ ساتھ قابل تقلید بھی ہے۔

انھیں آسودگانِ خواب میں ہمیں اس آتش رفتہ کا سراغ لگانا ہے جو ہماری زندہ روح میں بالیدگیاور علم وعمل کی حرارت پھونک دے جس کی ترجمانی علامہ اقبال کا یہ شعر کررہاہے۔

میں کہ مری نوا میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

جناب مفتی محمد صادق صاحب مبارکپوری مدرس جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ، ہماری طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے آسودگانِ خاک کو کتابی شکل دینے میں کافی تعاون کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان تمام علمائے کرام کی علمی و دینی خدمات کو قبول فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین یارب العالمین۔

طالب دعاء

قاضی سلمان مبشر مبارکپوری

مدیر قاضی اطہر اکیڈمی

مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ، اتر پردیش، انڈیا

المرقوم=۲۷ / رجب ۱۴۲۹ھ

مطابق ۳۱ / جولائی ۲۰۰۸ء

بسم اللہ الرّحمٰن الرحیم

تعارفِ مصنف

مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

کی مختصر سوانح حیات

از- قمرالزماں مبارکپوری سکریٹری جعفرلائبریری مبارکپور ضلع اعظم گڑھ اترپردیش

مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کا خاندانی نام عبدالحفیظ بن شیخ حاجی محمد حسن ہے۔ انھوں نے ۴ر رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷ر مئی ۱۹۱۶ء کو محلّہ حیدر آباد، قصبہ مبارکپور، ضلع اعظم گڈھ، صوبہ اترپردیش کے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو مغل بادشاہ ہمایوں کے دورِ حکومت میں راجہ سید شاہ مبارک رحمۃ اللہ علیہ بانیِ مبارکپور کے ہمراہ ضلع الہ آباد کے کڑا مانک پور سے ترکِ سکونت کر کے یہاں آباد ہوا تھا۔

مولانا کے خاندان میں ایک عرصہ تک نیابتِ قضا کا عہدہ قائم تھا۔ اسی لئے آپ بھی قاضی کہے اور لکھے جاتے ہیں، انگریزوں کے آخری دور میں محکمہ قضا ایک اعزازی محکمہ تھا، مبارکپور کے قریب محمد آباد گوہنہ دارالقضا تھا اور قاضی محمد سلیم متوفی ۱۲۶۶ھ ربیع الآخر ۱۲۵۰ھ سے سولہ برس تک محمد آباد گوہنہ کے قاضی القضاۃ رہے۔ جنھوں نے مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے جد اعلیٰ شیخ امام بخش کو مبارکپور کا نائب مقرر کر کے اس حلقہ میں اقامت دین و امامت جمعہ وعیدین، پیش آمدہ وقتی مسائل، نکاح، طلاق، وراثت، اختلاف بین المسلمین کے قضایا وغیرہ کی انجام دہی کی ذمہ داریاں سپرد کیں۔

مورخِ اسلام مبارکپوریؒ کے پردادا شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا کے دو صاحبزادے تھے، میاں جی حاجی لعل محمد اور میاں جی ولی محمد، میاں جی ولی محمد کے دو لڑکے تھے، میاں جی محمد شفیع مرحوم اور میاں جی حاجی محمد عمر مرحوم۔ میاں جی حاجی لعل محمد زندگی بھر کسی نہ کسی درجہ میں خاندانی

روایات کے حامل رہے، حج وزیارت کی دولت حاصل کی تھی۔ انکی اولاد میں ۴؍صاحبزادے اور دو لڑکیاں تھیں۔ (۱) میاں جی عبداللہ متوفی ۱۵؍رجب ۱۳۵۷ھ (۲) میاں جی حاجی اسداللہ متوفی ۲۵؍صفر ۱۳۸۲ھ (۳) میاں جی حاجی محمد حسین متوفی ۲۵؍رجب ۱۳۶۵ھ (۴) میاں جی حاجی محمد حسن متوفی ۱۸؍فروری ۱۹۷۸ء۔ الحمدللہ میاں حاجی لعل محمد کے چاروں صاحبزادوں نے متاہل زندگی گزاری اوران کا خاندان اپنے وطن مبارکپور میں رہتا ہے۔

مورخ مبارکپوریؒ کے والد شیخ حاجی محمد حسن بھائیوں اور بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے، ان کے کل چھ اولادیں ہوئیں، جن میں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی۔ سب نے متاہل زندگی گزاری، جن کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:

(۱) مورخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ متوفی بروز یکشنبہ ۲۸؍صفر ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴؍جولائی ۱۹۹۶ء، اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے، اور آپ کی کل آٹھ اولادیں ہوئیں، جن میں چھ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

(۲) محمودہ خاتون متوفیہ ۱۹۹۵ء، ان کی کل آٹھ اولادیں ہیں، جن میں چھ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں

(۳) قاضی حیات النبی متوفی ۱۹۸۰ء، ان کے دو لڑکے ہیں۔

(۴) قاضی ضیاء النبی متوفی ۱۹۹۴ء کل پانچ اولادیں ہیں، جن میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔

(۵) قاضی غلام النبی بقید حیات ہیں، اور چھ اولاد کے والد ہیں، جن میں دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔

(۶) قاضی عبدالعزیز باحیات ہیں، اور انکی کل نو اولاد ہیں، جن میں ۷؍لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں آپ کے تمام بھائی اور انکی اولاد مبارک پور میں رہائش پذیر ہیں اور زندگی کی دوڑ میں جدوجہد کر رہے ہیں۔

مولانا نے گھر پر اپنے والدین مکرمین سے ابتدائی ناظرہ پڑھا اور محلّہ کے ایک گھریلو مکتب میں تیسرا پارہ پڑھنے کے دوران جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں داخلہ لیا۔ یہاں حافظ علی حسن سے ختم قرآن کر کے، منشی عبدالوحید لاہرپوریؒ سے اردو، منشی اخلاق احمد سے ریاضی اور مولانا نعمت اللہ مبارک پوریؒ سے فارسی وخوش نویسی کی تعلیم پائی۔ صفر ۱۳۵۰ھ تا شعبان ۱۳۵۹ھ تک تقریباً دس برس اسی مدرسہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے باصلاحیت اساتذہ: حضرت مولانا

مفتی محمد یٰسین مبارکپوریؒ متوفی ۲۲ محرم ۱۴۰۴ھ سے اکثر و بیشتر کتابیں، مولانا شکراللہ مبارکپوریؒ متوفی ۵ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ سے منطق و فلسفہ کی زیادہ تعلیم، مولانا بشیر احمد مبارکپوریؒ متوفی ۳ شوال ۱۴۰۴ھ سے علم منطق کی بعض کتابیں، مولانا محمد عمر مظاہری مبارکپوریؒ متوفی ۱۳ اپریل ۱۹۹۵ء سے تفسیر جلالین اور اپنے حقیقی ماموں مولانا محمد یحیٰی رسولپوریؒ متوفی ۱۱ صفر ۱۳۸۷ھ سے عروض وقوافی اور ہیئت کے بعض اسباق کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اردو، فارسی اور عربی میں صاحبِ کمال ہوئے۔ آخری سال دورۂ حدیث کے لئے جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد گئے اور وہاں حضرت مولانا سید فخرالدین احمد متوفی ۱۳۹۲ھ سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد، مولانا سید محمد میاں متوفی ۱۶ شوال ۱۳۹۵ھ سے سنن ترمذی، دیوان حماسہ اول، مقاماتِ زمخشری اور مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلیؒ متوفی ۱۳۹۵ھ سے صحیح مسلم پڑھ کر ۱۳۵۹ھ میں سند فراغ حاصل کی۔

مولانا اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی میں اپنی قوتِ مطالعہ اور کثرت مطالعہ کتب بینی کی وجہ سے عربی زبان وادب کے متعلقات ومبادی جیسے لغت، اشتقاق، خاصیاتِ ابواب، صلات نحو، صرف، وغیرہ کے باب میں بڑی صلاحیت وبصیرت حاصل کر چکے تھے۔ ان کے عربی کا ذوق مقاماتِ حریری، دیوان حماسہ، دیوانِ متنبّی، سبعہ معلقہ کے درس اور لغت وادب کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، ابتداء میں کڑی محنت ومطالعہ کی برکت تھی کہ قاضی صاحب نے اپنی تعلیمی زندگی میں مشکل مقامات کو حل کرنے کی پوری پوری صلاحیت پیدا کر لی تھی، جس کی وجہ سے اس دور کو انھوں نے نہایت نشاط علمی کے ساتھ گزارا۔ یہی وجہ تھی کی قاضی صاحب کو اپنی طالب علمی کے دور ہی میں مدرسہ احیاء العلوم کے عربی تلامذہ کی بعض درسی کتابوں کی تدریس وتفہیم کی ذمہ داری اربابِ بست وکشاد کی طرف سے سونپی گئی، جس کو مورخ مبارک پوریؒ نے نہایت خوش اسلوبی اور تمام ترعلمی کامیابیوں کے ساتھ سرانجام دیا۔

مولانا کو ابتدا ہی سے کتابوں کے جمع کرنے اور خریدنے کا شوق تھا، انھوں نے جلد سازی کر کے اس کی رقم سے بڑی اہم اہم کتابیں جمع کیں، کتاب ومطالعہ کے اسی ذوق کی وجہ سے ان میں مضمون نگاری اور شعر وشاعری کا رجحان پیدا ہوا، اس طرح مولانا کا پہلا مضمون ''مساوات''

کے زیر عنوان رسالہ ” مومن بدایوں “ کے دسمبر ۱۹۳۴ء مطابق ۱۳۵۳ھ میں شائع ہوا جوان کے حصولِ تعلیم کی مدت ہے، اسی طرح مولانا کی پہلی نظم فرقان بریلی کے شمارۂ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ میں ” مسلم کی دعا “ کے عنوان سے چھپی۔

مولانا مبارکپوری تکمیلِ تعلیم کے بعد شوال ۱۳۵۹ھ سے محرم ۱۳۶۴ھ تک یعنی ساڑھے چار سال تک اپنی مادرِ علمی احیاء العلوم میں عربی کے مدرس رہے۔ کچھ وقفہ کے بعد شوال ۱۳۶۶ھ سے صفر ۱۳۶۷ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء تا جنوری ۱۹۴۷ء کل پانچ ماہ تک اسی مدرسہ میں عربی کے عارضی مدرس بھی رہے۔

مولانا فراغت کے بعد کافی مالی پریشانی میں رہے، امرتسر اور لاہور گئے۔ وہاں جنوری ۱۹۴۷ء میں مولانا عثمان فارقلیط مدیر روزنامہ ” زمزم “ کے نائب اڈیٹر بنائے گئے، اوران کی رہنمائی میں صحافت میں قدم رکھا لیکن وہ ۱۰/ جون کو تقسیم ھند کی شورش سے وطن لوٹ آئے اور پھر کبھی نہ جاسکے۔ محرم ۱۳۶۷ھ/ نومبر ۱۹۴۷ء تا رجب ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء بہرائچ میں ہفتہ وار اخبار ” انصار “ کے مدیر رہے، جو سات ماہ کے بعد حکومت اتر پردیش کی معاندت کے بعد بند ہوگیا۔ شوال ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء سے شعبان ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۹ء تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس رہے۔ یہاں کا ایک سالہ تدریسی دور مولانا کے علمی و قلمی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔ رجال السند والہند کی ابتداء یہیں ہوئی جو علمائے سندھ اور ہند کے احوال وکوائف میں ایک اہم کتاب سمجھی گئی ہے۔

تلاش معاش میں قاضی صاحب ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ نومبر ۱۹۴۹ء میں بمبئی گئے، اور وہاں جمیعتہ العلماء صوبہ بمبئی کے دفتر میں کام کرنے لگے، اس طرح آٹھ ماہ گزارنے کے بعد جب ۱۵/ جون کو ۱۹۵۰ء کو روزنامہ ” جمہوریت “ بمبئی کا پہلا شمارہ اشاعت پذیر ہوا تو مولانا اس کے نائب مدیر بنادیئے گئے، آپ کی محنت اور لگن کی وجہ سے روزنامہ چند ہی دنوں میں بمبئی کا مقبول ترین روزنامہ سمجھا جانے لگا، اور روزنامہ ” انقلاب “ بمبئی کی مقبولیت اور دائرہ اثر کو بھی متاثر کرنے لگا، فروری ۱۹۵۱ء سے مقبول ترین اخبار ” انقلاب “ سے وابستہ ہوکر اس کے نائب

مدیر کے فرائض انجام دینے لگے، مولانا کے مضامین اور قلمی نوادر کی وجہ سے ''انقلاب'' کو بہت فروغ ملا، اس اخبار میں مولانا کے تو ہونے کو تین تین چار چار کالم ہوتے تھے، مگر اس میں احوال و معارف کو جو ہر قسم کی معلومات کا خزانہ ہوا کرتا تھا۔ قدیم و جدید دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل تھی۔ ۲۳ر فروری ۱۹۵۱ء سے ۱۰راپریل ۱۹۹۱ء تک کے ''انقلاب'' میں مطبوعہ احوال و معارف کو اگر کتابی صورت میں الگ الگ عنوان کے تحت مرتب کیا جائے تو کئی معیاری کتابیں صورت پذیر ہوسکتی ہیں۔ اور اس طرح منتشر اور پھیلا ہوا کالم علمی حلقوں میں مصادر و مراجع کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ مگر یہ کام ایک مرد کار کی توجہ سے ہی انجام پا سکتا ہے۔

جب ۱۴ر مئی ۱۹۵۴ء کو ہفتہ روزہ ''البلاغ'' کا اجرا ہوا تو اسی کے ساتھ ماہ نامہ ''البلاغ'' بمبئی کی تاسیس بھی ہوئی اور دوسرے دو مدیروں کے ساتھ مولانا کو بھی اسکی ارادت میں شریک کیا گیا، کچھ دنوں کے بعد دونوں مدیروں نے رسالہ سے ترکِ تعلق کرلیا، مگر مولانا مبارک پوری نے تقریباً ۲۶ر سال تک ''البلاغ'' کا مدیر تحریر رہ کر اس کو جاری رکھا۔

مولانا کی علمی زندگی علمی و قلمی انہماک واشتغال، سادگی و پرکاری، توکل و استغنا، ایمان و یقین، خوداعتمادی خوش اعتقادی، حزم واحتیاط، نظم و ضبط، کم گوئی و استغراق، تفکر و تبحر، محنت و جاں فشانی، جگر کاوی و دل سوزی، یکسوئی و دل جمعی، ترتیب و تنظیم، تہذیب و شائستگی، خوش نظری و جہاں بینی اور خوش روئی و خوش خلقی سے عبارت تھی۔ بمبئی جیسے دولت کے شہر میں رہکر مولانا کو دنیا داری اور دولت کمانے کے بہت سے مواقع نصیب ہوسکتے تھے، مگر مولانا میں جو دنیا بیزاری، علم پروری اور اخلاص کا جذبہ تھا، اس نے دولت کمانے کے تمام راستوں سے گریز کیا، سعودی عربیہ اور عرب ممالک کے سلطانوں، رئیسوں، تاجروں اور قدردانوں میں اپنا علمی اثر و نفوذ رکھنے کے باوجود اس طرح کی تمام پیشکش کو انھوں نے ٹھکرا دیا، جس سے دولتِ دنیا میں اضافہ ہوسکتا تھا، مولانا اپنے دینی و علمی اور قلمی اشتغال میں یوں کھوئے رہے کہ قوتِ لایموت سے صرف تعلق باقی رکھا، دوسرے تمام رشتوں اور رسم دل بستگی و دل جوئی کو اپنی ذاتی زندگی میں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی، آپ کو پانچ مرتبہ حج و زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔

مولانا صرف ایک ادیب وشاعر ہی نہیں تھے، وہ دین وسیاست کے ساتھ عملی زندگی سے بھی ربط رکھتے تھے، اور دوسری تحریکوں سے دلچسپی رکھنے کے دوش بدوش علمی ودینی اداروں کی تاسیس میں بھی گرمی دکھاتے تھے، ۱۱؍ جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ ۱۹۵۱ء کو مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی کو جاری کیا، جو آج بھی ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے، اسی طرح مبارک پور میں تصنیف و تالیف کے لئے دائرہ ملیہ قائم کیا، اس ادارہ کے ذریعہ آپ کی کچھ کتابیں شائع ہوئیں، جدید تعلیم کے لئے ۱۰؍ اپریل ۱۹۷۶ء کو انصار گرلس اسکول مبارک پور اور ۱۴۰۰ھ میں مدرسہ حجازیہ کی تاسیس عمل میں آئی۔

قاضی صاحب کے اساتذۂ احیاء العلوم میں کوئی ادیب وشاعر، صحافی وانشاپرداز مصنف و مرتب نہیں تھا، مگر انھوں نے اپنی ذاتی صلاحیتوں اور خداداد مہارت سے اس تصور کو عملاً سچ کر دکھایا کہ اگر انسان میں شاہین کا تجسس اور چیتے کا جگر ہے، نیز عزم وحوصلہ کی کمی نہیں ہے تو وہ چھوٹی جگہ رہتے ہوئے بھی، مرحلۂ وہم وگمان سے گزر کر رجال علم کی صف میں اپنی جگہ بنا سکتا ہے، اور معاشرہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلا سکتا ہے۔ مولانا مرحوم کی ایک ایک سطر اپنے اندر علمی وتعلیمی نشاط، تاریخی وکتابی جذبۂ شوق، بلند حوصلگی، عالی ہمتی، خودسازی وعہدسازی کا تموج واہتزاز رکھتی ہے۔

مورخِ اسلام مبارک پوری کے زرنگار قلم سے پچاس کتابیں منصۂ شہود پر آئی ہیں، سب سے پہلی کتاب ''اسلامی نظامِ زندگی،، ۱۹۴۹ء میں بمبئی سے شائع ہوئی اور سب سے آخری کتاب وفات سے چند روز پہلے ۱۹۹۶ء میں ''خواتینِ اسلام کی دینی وعلمی خدمات،، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی، انکی اکثر کتابیں دوبارہ شائع ہو رہی ہیں، آپ کی کتاب ''عرب و ہند عہدِ رسالت میں،، اور ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں،، کا عربی وسندھی زبان میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، اسی طرح ''رجال السند والہند،، کا اردو ترجمہ منتظر اشاعت ہے، آپ کی زندگی میں بعض کتابیں شائع نہیں ہو سکی تھیں، جنکی

اشاعت کی اب تیاری ہو رہی ہے، آپ کی مطبوعہ تصانیف کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

(۱) ائمہ اربعہ (۲) اسلامی نظامِ زندگی (۳) افاداتِ حسن بصری (۴) اسلامی شادی (۵) آسودگان خاک (۶) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (۷) آثار و اخبار (۸) بناتِ اسلام کی دینی و علمی خدمات (۹) تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہدِ سلف میں (۱۰) تاریخ اسماء الثقات (عربی) (۱۱) تذکرۂ علمائے مبارک پور (۱۲) تدوین سیر و مغازی (۱۳) جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول (عربی) (۱۴) جواہر القرآن (۱۵) الحکومات العربیۃ فی الہند والسند (عربی) (۱۶) حج کے بعد (۱۷) خلافت راشدہ اور ہندوستان (۱۸) خلافتِ امیہ اور ہندوستان (۱۹) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان (۲۰) خیر القرون کی درسگاہیں (۲۱) خواتین اسلام کی علمی ودینی خدمات (۲۲) دیارِ پورب میں علما اور علماء (۲۳) دیوانِ احمد (۲۴) رجال السند والہند الی القرن السابع (عربی) (۲۵) صالحات (۲۶) طبقات الحجاج (۲۷) العرب والھند فی عہد الرسالۃ (عربی) (۲۸) العقد الثمین فی فتوح الھند ومن وردفیھا من الصحابۃ والتابعین (عربی) (۲۹) علی و حسین (۳۰) علمائے اسلام کے القاب وخطابات (۳۱) عرب وھند عہدِ رسالت میں (۳۲) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک (۳۳) قاضی اطہر مبارکپوریؒ کے سفر نامے (۳۴) علمائے اسلام کی خونیں داستانیں (۳۵) کاروانِ حیات خودنوشت سوانح (۳۶) مآثر و معارف (۳۷) معارف القرآن (۳۸) مسلمانوں کے ہر طبقہ میں علم اور علماء (۳۹) مئے طہور (۴۰) محمد کے زمانے کا ہندوستان (۴۱) مطالعات وتعلیقات (۴۲) مکتوب امام احمد بن حنبل (۴۳) ھندوستان میں علم حدیث کی اشاعت (۴۴) مسلمان (۴۵) الھند فی عہد العباسیین (عربی) (۴۶) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

مولانا مرحوم کے ان مستقل تصنیفی کاموں کے علاوہ سینکڑوں علمی، دینی اور تاریخی مقالات و مضامین ''البلاغ'' بمبئی، ''معارف'' اعظم گڑھ، ''برہان'' دہلی، ''صدق جدید'' لکھنؤ، دارالعلوم دیو بند اور دیگر

اخبار ورسائل میں شائع ہوئے ہیں، ان بکھرے ہوئے علمی و دینی جواہر پاروں کو کتابی شکل دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

مولانا کی علمی و قلمی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، حکومتِ ہند نے ۱۹۸۵ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ دیا، ۱۹۸۴ء و ۱۹۸۶ء میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے اعترافِ علمی میں دیگر تحائف اور نشانِ پاکستان دیا، اسی کے ساتھ پاکستانی دانشوروں کی طرف سے ''محسنِ سندھ'' کے خطاب سے نوازے گئے۔

مولانا انجمن تعمیراتِ ادب، لاہور کے معتمد، مدرسہ مفتاح العلوم ہندوستانی مسجد بھیونڈی مہاراشٹر، انصار گرلس انٹر کالج مبارکپور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش، جامعہ حجازیہ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش کے بانی، دارالسلام ادری ضلع مئو اتر پریش کے نگراں، ادارہ التراث العربی کویت کے مشیر علمی، جمعیۃ العلماء مہاراشٹر کے صدر، دینی تعلیمی بورڈ مہاراشٹر کے صدر، انجمن خدام النبی بمبئی کے رکن، رویتِ ہلال کمیٹی بمبئی کے رکن، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تاسیسی، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے سربراہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رفیق اعزازی، برہان دہلی کے اعزازی مدیر، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ حسینیہ لال دروازہ ضلع جونپور اتر پریش اور جامعہ اشرفیہ نیا بھوج پور (بہار) کے رکن مجلس شوریٰ بھی بنائے گئے۔

اللہ نے مولانا کے علم، اولاد اور مال میں بڑی برکت دی، جو کسی کسی کے ہی حصہ میں آتی ہے، یہ مولانا کے دینی اخلاص، علمی انہاک، باطنی طہارت، تزکیۂ نفس اور دنیا بیزاری کا نتیجہ ہے، علمی دنیا کا یہ بطلِ عظیم اور رجلِ کریم یکشنبہ ۲۷ صفر ۱۴۱۷ھ/۱۴ جولائی ۱۹۹۶ء کو شب ۱۰ بجے علائقِ دنیا سے رشتہ توڑ کر اپنے مالکِ حقیقی سے جاملا، اللہ تعالیٰ آپ کو رحمت وانوار کی بارشوں میں رکھے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اولاد واحفاد

مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ دنیاوی نعمتوں کے اعتبار سے بھی خوش نصیب تھے، مولانا مرحوم کی کل آٹھ اولادیں ہوئیں، جن میں چھ اولاد ذکور اور دو اولاد اناث ہیں، مولانا کے دو بچے شریف انور اور انور جمال صغر سنی ہی میں فوت ہو گئے، مولانا نے علم و دین داری کی جو روایات آگے بڑھائیں، ان کی اولاد میں بھی تعلیم و تعلم اور دین و دیانت کی وراثت پروان چڑھی، اور سب کے سب لڑکے اور لڑکیاں تعلیم یافتہ اور صاحبِ صلاحیت ہیں، بلکہ یہ سلسلہ اب اولاد سے گزر کر احفاد تک بھی آ گیا ہے، اور ''این خانہ ہمہ آفتاب است،، کی بہترین مثال پیش کر رہا ہے۔

(۱) مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ مرحوم کے سب سے بڑے فرزند مولانا خالد کمال مبارکپوریؒ تھے، یکم دسمبر ۱۹۳۸ء ان کی تاریخ ولادت ہے، بڑے ذہین وفطین وخوش مزاج تھے، ابتدائی اردو کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کرنے کے بعد دو سال تک دار العلوم دیو بند میں دورۂ حدیث مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں سند فراغت حاصل کی، تکمیلِ تعلیم کے بعد جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر اپنے والد مرحوم کے ۱۹۵۱ء میں قائم کردہ مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے، اس دوران آپ کی ذہانت وصلاحیت سے متاثر ہو کر حکومتِ مصر کے قونصل جنرل عبدالمنعم النجار نے مشہور علمی درسگاہ جامعہ ازہر میں سرکاری وظیفہ پر داخلہ کے لئے زور دیا، لیکن مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ اسلامی تہذیب وشرافت کی اقدار پر دل وجان قربان کئے ہوئے تھے، انھیں یہ دیکھ کر سخت ذہنی اذیت ہوتی تھی کہ جامعہ ازہر سے پڑھ کر واپس آنے والے اسلامی لباس سے عاری اور بے ریش ہو جایا کرتے تھے، اور اپنے رہن سہن، میں یہود ونصاریٰ کا نمونہ بن جاتے تھے، اس لئے مولانا کو وہاں بھیجنے میں سخت تکدر وتامل تھا، مگر جب مدینہ یونیورسٹی قائم ہوئی، تو مولانا نے اپنے فرزند کے علمی وفنی کمالات اور دینی حمیت میں اضافہ کے لئے

نشاط وانشراح کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل کرادیا، پانچ برس تک لائق اساتذہ سے علمِ دین کی تکمیل کر کے ۱۹۶۷ء میں مدینہ منورہ کی کلیۃ الشریعہ سے فارغ ہوئے، اور حکومت سعودی عرب کی وزارت اسلامی امور کی طرف سے گھانا مغربی افریقہ میں مبعوث بنا کر دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے مامور کئے گئے، مغربی افریقہ میں مولانا خالد کمال کی علمی ودینی اور اصلاحی وتبلیغی سرگرمیوں نے قومی ودینی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں، ان کی کوششوں سے سعودی حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیکر حج سے روکا، مولانا خالد کمال نے گھانا میں چودہ برس تک اہم دینی وعلمی خدمات انجام دیں، وہاں انگریزی میں ''اطہر،، کے نام سے ایک ماہ نامہ بھی جاری کیا، حکومت سعودی عرب نے مولانا خالد کمال کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں ۱۹۸۱ء میں نیوزی لینڈ تبادلہ کر دیا، جہاں وہ اپنی وفات ۵؍دسمبر ۱۹۹۹ء تک برسر کار رہے، آپ نے پندرہ بار حج بیت اللہ ادا کیا۔

نیوزی لینڈ میں مولانا خالد کمال مبارک پوری صاحبؒ نے ایک عظیم الشان اسلامک سینٹر قائم کر کے اس میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کی یہ پہلی مسجد قرار پائی، اس کی تعمیر وتزئین کے لئے مولانا خالد کمال نے یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا۔ مولانا خالد کمال میں بہت سی خوبیاں تھیں، وہ ادیب وشاعر اور اسلامی دانشور بھی تھے، طالب علمی کے زمانے ہی میں والد صاحب کی طرح قرطاس وقلم کی امانت انھیں حاصل ہوگئی تھی، ان کے مضامینِ نظم ونثر وجو''البلاغ،، اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے، ان سے علمیت وادبیت کا احساس ہوتا ہے، مولانا بڑے ہنس مکھ اور محفل کو زعفران زار بنا دینے والے تھے، وہ جہاں بھی رہتے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے تھے، انھیں اداروں کو ترقی دینے اور انھیں قومِ مسلم کے لئے کارآمد بنانے کا بہت اچھا سلیقہ معلوم تھا، ۵؍دسمبر ۱۹۹۹ کو نیوزی لینڈ میں غریب الوطنی کی موت آئی، وہیں پیوند خاک ہوئے۔

مرتبہ بخشنے شہادت کا موت پردیس ہی میں آدھمکی

مولانا خالد کمال مبارک پوری کے ایک لڑکے فوزان طارق اور باقی اولاد پانچ میں لڑکیاں ہیں، مولانا کی تمام اولاد دس متاہل زندگی گزار رہی ہیں، اور سب کی سب نیوزی لینڈ میں

مقیم ہیں، وطن آنا جانا رہا ہے۔

فوزان طارق کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں ہوئی، پھر نیوزی لینڈ میں یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم حاصل کی، پھر عربی پڑھنے کے لئے قاہرہ بھی گئے، فوزان طارق اس وقت نیوزی لینڈ میں سرکاری صیغۂ ملازمت سے وابستہ ہیں۔

(۲) مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ کے دوسرے صاحب زادے قاضی ظفر مسعود صاحب ہیں، ان کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۴۱ء/۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ ہے، انھوں نے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور سے پرائمری درجات پاس کرنے کے بعد ایم پی انٹر کالج مبارک پور سے ۱۹۶۰ء میں ہائی اسکول پاس کیا، پھر دینی و مذہبی تعلیم کے لیے مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ لیا، اور ۱۹۶۹ء میں مدرسہ مفتاح العلوم مئو سے پہلی پوزیشن میں عالم کا امتحان پاس کیا، دو مرتبہ شرف حج بیت اللہ حاصل کیا۔ ۱۹۶۸ء میں فخر المحد ثین علامہ سید فخر الدین شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند نے آپ کی علمی لیاقت سے خوش ہوکر خصوصی سندِ حدیث سے نوازا، قاضی ظفر مسعود کی علمی و دینی سرگرمیوں سے کئی میدان سرسبز ہیں۔ انھیں مشاعروں، ادبی تقریبات اور علمی گفتگو سے خاص تعلق ہے، مطالعہ کے موضوعات میں بڑا تنوع اور پھیلاؤ ہے، مبارک پور میں لڑکیوں کی پہلی انگریزی درس گاہ انصار گرلس انٹر کالج کے بانیوں میں سے ہیں، اس سے پہلے بھی کئی انجمنوں، لائبریریوں اور اداروں کو وجود میں لانے کا فخر حاصل کر چکے ہیں۔ انھیں موقع محل کے اچھے اور معیاری اشعار خوب ازبر ہیں، اور انکے استعمال میں بڑی برجستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، انھوں نے مولانا قاضی اطہر کے سلسلے میں کئی اشاریئے ترتیب دیے ہیں، جو تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی کا بہترین فریضہ انجام دے سکتے ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے ۹؍ اولاد کی ولدیت کا شرف بخشا ہے، جن میں صرف ایک لڑکے مولوی قاضی فرحان ظفر سلمہٗ ہیں، ان کی ولادت ۱۱؍ نومبر ۱۹۷۶ء کو ہوئی، ان کی ابتدائی اردو اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں ہوئی اور فراغت ایشیا کی شہرۂ آفاق درس گاہ دار العلوم دیو بند سے ہوئی، گھر پر عائلی زندگی گزار رہے ہیں، اور کاروبار میں اپنے والد کے مدد گار بنے ہوئے ہیں۔

مورخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری علیہ رحمہ کے تیسرے فرزند مولانا قاضی سلمان مبشر مبارک پوری (ولادت یکم جنوری ۱۹۵۱ء) ہیں، اردو عربی اور فارسی کی تعلیم احیاء العلوم میں پانے کے بعد ایک سال کے لئے دارالعلوم دیو بند گئے، اور وہاں سے سندِ فراغ لینے کے بعد ۱۹۷۴ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا، اور ۱۹۷۸ء میں کلیۃ الدعوۃ و اصول الدین کی تکمیل کر کے سعودی عرب کی وزارت اسلامی امور کی طرف سے مبعوث بنا کر گھانا مغربی افریقہ میں مامور کیے گئے، وہاں فیملی کے ساتھ ۱۴ر برس رہے، اور دینی خدمات سرانجام دیں، ۱۹۹۲ء میں سعودی حکومت نے تبادلہ کر کے ہندوستان بھیج دیا، اور مختلف مدارس میں انھوں نے تعلیم دی، اس وقت ''دارالعلوم حسین آباد انجان شہید میں استاذ حدیث ہیں، آپ نے چھ مرتبہ حج کیا، اپنے والد مورخِ اسلام مبارک پوریؒ کے علمی و دینی کارناموں کو منظر عام پر لانے کے لئے دل میں تڑپ رکھتے ہیں، اور اس سلسلہ میں مختلف افراد و ادارہ سے مسلسل رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں، مولانا مرحوم کی جن کتابوں کے ایڈیشن ختم ہو گئے ہیں، انکی اشاعتِ ثانی اور جو کتابیں منتظر اشاعت ہیں، ان کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی تگ و دو میں اپنے وقتِ عزیز اور صرف کثیر کو لگا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت بخشے مولانا قاضی سلمان مبشر کے حبالہ عقد میں مورخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کے حقیقی ماموں حضرت مولانا محمد یحیٰ صاحب رسول پوریؒ کی صاحبزادی نزہت خاتون ہیں، جن کے بطن سے پانچ اولاد ہیں، جن میں تین اولاد ذکور اور دو اولاد اناث ہیں، بڑے صاحبزادے قاضی فیصل نے ابتدائی تعلیم غانا (مغربی افریقہ) میں حاصل کی، اور ۱۹۸۸ء میں اپنے تایا مولانا مولانا خالد کمال کے سایۂ عاطفت میں رہ کر نیوزی لینڈ میں تعلیمی مراحل طے کرنے لگے، وہاں کے مختلف اسکول، کالج یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کی، وکٹوریہ یونیورسٹی ولنگٹن سے کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ قابلیت حاصل کر کے اسی شعبہ میں ملازمت کرلی، پانچ سال کے بعد سڈنی (آسٹریلیا) میں کار منصبی کی انجام دہی کے لئے چلے گئے، جہاں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بر سر کار ہیں، دوسرے صاحبزادے قاضی محمد ہیں، جن کی ابتدائی تعلیم غانا میں ہوئی ۱۹۹۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ منتقل ہو گئے، یہاں سے ۲۰۰۳ء میں ایم۔اے ویسٹ

ایشیا اسٹڈی میں ٹاپ کیا، اور مڈل کے مستحق ہوئے، اس وقت اسٹریلیا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ تیسرے لڑکے قاضی ریان ہیں، جنھوں نے گھانا میں پڑھنے کے بعد مدرسہ احیاء العلوم کے شعبۂ فارسی میں داخلہ لیا، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ سے بی کام کیا۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کے سب سے چھوٹے بیٹے قاضی حسان احمد (متولد یکم جمادی الآخر ۱۳۷۷ھ ہیں جنھوں نے مدرسہ احیاء العلوم میں اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کیا، اور شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج اعظم گڑھ سے بی اے کیا، اس کے بعد اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا، اس وقت انصار گرلس کالج میں امورِ مفوضہ کی انجام دہی میں لگے ہوئے ہیں، ان کی پرورش و پرداخت میں آٹھ اولادیں ہیں، جن میں ۲/ذکور اور ۶/اناث ہیں ان کے بڑے بیٹے قاضی عدنان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں ہوئی، اور سندِ فراغ مظاہر العلوم سہارن پور سے حاسل کی، اس وقت ممبئی میں ملازمت کررہے ہیں۔

امۃ الرحمٰن ام سلمٰی (پ یکم مارچ ۱۹۴۸ء ۱۹ی/ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ) مولانا قاضی اطہر کی بڑی صاحبزادی ہیں، جو ننہالی رشتہ میں محمد آباد گوہنہ ضلع مئو کے رہنے والے ماسٹر مصباح الدین محمد رافع سے منسوب ہیں، اولاد میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں ماسٹر مصباح الدین صاحب مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی زوجہ سائرہ خاتون کے ماموں زاد ہیں، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے بی ایس سی کرکے گرکھپور یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا۔ اور ۱۹۶۷ء سے اسلامیہ انٹر کالج فیروزآباد میں بائیلوجی کے لکچرار رہے ۲۰۰۵ء سے پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں، مع اہل و عیال فیروزآباد میں قیام ہے۔

مولانا قاضی اطہر کے نواسے سعد الدین ولد ماسٹر مصباح الدین نے فیروزآباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے فیض درس اٹھایا، اس کے بعد منی پال (کرناٹک) سے ڈینٹل کا کورس کیا، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے نیوزی لینڈ گئے، تکمیل تعلیم کرکے وہیں طبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا کی چھوٹی بیٹی شمیمہ عائشہ (ب ۵/شعبان ۱۳۷۹ھ) ماسٹر رضوان احمد علگ نواده

مبارکپور کے عقد مناکحت میں ہیں جو مولانا کے حقیقی ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوری کے سگے نواسے ہیں، انھوں نے مبارک پور میں تحصیلِ علم کر کے مسلم یونیورسٹی کی راہ لی، اور وہاں رہ کر بی۔اے۔کیا، اس کے بعد ملک سعود یونیورسٹی ریاض (سعودیہ عربیہ) میں تکمیل درس کی، اس وقت ابوظہی میں بسلسلہ ملازمت مقیم ہیں۔ ۶/اولاد میں ۴/اولاد نرینہ اور ۲/اولاد دداناث ہیں، انکے بڑے لڑکے صفوان احمد ہیں، اس وقت سعودی عرب میں ملازمت کر رہے ہیں، دوسرے لڑکے شیبان ہیں، وہ برہان پور (ایم۔پی) میں بی۔یو۔ایم۔ایس۔کا میڈیکل کورس کر رہے ہیں،

اس طرح دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا قاضی اطہر کی علمی وجاہت کے اثرات کو اللہ نے اولاد واحفاد اور قریب تک کے رشتہ میں منتقل کر دیا ہے، یہ خداوندِ قدوس کی بہت بڑی دین ہے۔

قمر الزماں مبارک پوری
یکم جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ
مطابق ۷/مئی ۲۰۰۸ء

تیری عظمت کو سلام

از ساغر ادروی

یہ تاثراتی نظم مورخِ اسلام جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری (نوراللہ مرقدہ) کی عظمتوں اور اعلیٰ صلاحیتوں سے متاثر ہوکر قلم بند ہوئی، جس میں ان کی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ ان کی معرکۃ الآراء تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ہے نگاہوں میں ابھی تک ضوفشاں تیرا جمال
کیسے بھولے گا جہاں تیرا ہنر، تیرا کمال
دل کو تڑپانے لگا ہے، ہر نفس تیرا خیال

کیسے ہم پائیں گے؟ تجھ کامل سخنور سا کوئی!
ڈھونڈ کر لائیں کہاں سے؟ قاضی اطہر سا کوئی!

تھا، جہانِ علم وفن میں تو بڑا ہی نامور،
شخصیت تیری، رہی ہر طرح بنکر معتبر!
تو رہا شہرِ ادب میں صورت لعل وگہر،

تھا، تیرے ہاتھوں میں تہذیب وتمدن کا علم،
کس قدر بیباک اور حساس تھا تیرا قلم!

تو ہمیشہ ہی رہا، اسلام کا بنکر نقیب،
طالبانِ علم وفن کے، تجھ سے جاگے ہیں نصیب!
تو مدبر اور شاعر تو، مفکر اور ادیب،

اَہل دانش میں سدا ہوتا رہا تیرا شمار،
علم کی دنیا میں ہیں، تیری کتابیں شاہکار،

ہے زمانے میں، تیری ہر ایک خدمت سامنے،
تیری کوشش، تیری کاوش، تیری محنت سامنے،
ہے "**رجال السِند**" کی روشن حقیقت سامنے!

کس طرح آخر بیاں ہو، اس کی خوبی اور صفات۔
صورتِ "مخطوطہ" ہے، "تاریخ اسماء الثقات"

تو نے رکھی ہر گھڑی علماء وفقہاء پر نظر،
صَرف کر کے تو نے اپنا "خونِ دل"، خونِ جگر،
لکھ دیئے تو نے یہاں حالات ان کے، سر بہ سر!

ھند میں تشریف لائے جو محدث، تابعین،
اک رسالہ ہے تیرا، عربی میں **العقد الثمین**،

وقت پر "علمائے حق" نے جان دی اور سر دیا،
لکھ کے "خونیں داستانیں" نام روشن کر دیا!
"جوہرِ قرآں" سے تو نے دل کا دامن بھر دیا،

ہے حقیقت میں بہت ہی قابل ذکر و بیاں "
اک صحیفہ، ہے "**خلافتِ راشدہ هندوستان**"

اس میں شامل ہے بہت "فکر و نظر" کی چاشنی،
جن کے طابع تھے کبھی دہلی، کراچی، ممبئی،
ڈالتی ہے اس کے بارے میں مکمل روشنی،

آپ کے عہدِ رسالت "میں رہے "ھندوعرب"
نام دینا ہے مناسب، جس کا "تاریخ ادب"

تیری فطرت میں تھا داخل، فکر وعلم وآگہی،
بکھری، تیری ذات سے، "علم وادب کی روشنی"
تو نے اپنایا تھا "اسلامی نظامِ زندگی"

تو نے بتلایا اماموں کا مقام اور مرتبہ،
جو لکھا تو نے رسالہ ہے " ائمّہ اربعہ"

جب سماج ہونے لگا ہے "مغربیت" کا شکار!
تب سے "مشرق" کا بھی دامن ہو رہا ہے تار تار!
یہ ستائے جاتا ہے احساس دل کو بار بار،

ہے یہ ایماں کا تقاضہ عورتیں ہوں طیبات"
تو نے لکھا ہے، خواتیں" کے لئے" الصالحات"

جب بڑھا دورِ ترقی میں، بہت آگے سماج،
سوچنے کے واسطے، ہم ہوگئے مجبور آج!
بڑھ گیا ہے شادیوں میں کس قدر رسم ورواج،

سرورِ کونین یعنی "دین کے ہادی" کا طریق،
جس نے بتلایا ہمیں، "اسلامی شادی" کا طریق

اس طرح اپنائیں گے گر یہ "طریق بندگی"
ہر زمانے میں، یقیں ہے بن کے "خدامِ نبی"
ہاں! سنواریں گے سبھی حجاج "اپنی زندگی"!

تیرے ہونٹوں پر کہاں سے ذکر آیا ''حج کے بعد''؟
اک رسالہ ہے جس کا نام رکھا ''حج کے بعد''

تیری کاوش سے ہوا ''علم و ادب'' کا ''سبز باغ''
اپنے ''علم و فن'' کا تو نے کر دیا روشن چراغ،
کتنا دور اندیش تھا، بیشک! تیرا ذہن و دماغ،

حلقۂ علم و ہنر میں جب ضرورت آ پڑی ،
اس گھڑی تو نے ''افادات حسن بصری''، لکھی!

اس مقالہ کی یہاں پر ہے بہت ہی ''اہمیت''!
کیا بیاں کوئی کرے گا؟ اس کی ''ادبی حیثیت''!
بڑھ گئی ہے اس سے پاکستانی، سندھی انسیت،

کتنی روشن ہوگئی ''طباعت علم حدیث''
ملک ہندوستاں میں، ''اشاعت علم حدیث''

تذکرہ ان بزرگوں کا، جو ہوئے ''پیوند خاک''
موجزن، جنکے دلوں میں تھا، ہمیشہ ''عزمِ پاک''
جن کے آگے ہوگیا ''باطل'' کا سینہ چاک چاک!

ہے یہ اک ایسا رسالہ ''بے مثال و لاجواب''،
یعنی ہے ''آسودگان خاک'' تیری اک کتاب'' !

تھے تعلق جو عرب، ھندوستاں کے درمیاں،
اس رسالے سے ہمیں ملتا ہے ''ان سب کا بیاں''
''ترجمہ اردو'' تھا، اب ہے، صورتِ عربی زباں''

''العرب والھند فی عہد الرسالۃ'' اک کتاب''
ہے بڑی دلچسپ، جس کی ''خوبیاں'' ہیں بے حساب!

چار ''تاریخی مقالوں'' کا جو ہے اک سلسلہ،
ربط جن کا، ''علمی دینی خانوادوں'' سے ملا،
ہے ''قدیم اسلامی ھندوستاں'' کا نقشہ لکھا۔

اس کو پڑھیے تو لگے، جیسے کوئی ''شہکار'' ہے!
وہ رسالہ اصل میں، ''آثار اور اخبار'' ہے،

جس کا موضوعِ سخن ہے دلنشیں اور شاندار
ہے یہ بے شک ''علم اور تحقیق'' کا اک ''شاہکار''
یہ کتاب ایسی ہے لوگو! جس کو پڑھیے! بار، بار!

قاضی اطہر کا بہت جو ''قیمتی انعام'' ہے!
اس کا ہی ''تدوین اور سیر ومغازی'' نام ہے۔

جس میں بتلایا گیا ہے ہم کو ''تعلیمی نظام''
ہے ''اصول وضابطہ'' پر مشتمل ہر ایک کام،
درسگاہوں میں، ضرورت جس کی رہتی ہے مدام!

ہم کو ملتے ہیں بہت اس میں ''کمالات وفنون''
اک رسالہ ہے جس کا نام ہے ''خیر القرون''

ہے حقیقت میں حسیں تاریخ کی اک ''کہکشاں''،
اس کو پڑھیے تو بڑی دلچسپ ہے اس کی زباں،
ہر ''سطر'' اس کی، بلاشبہ لگے ''جادو بیاں''!

سارے عالَم کا لکھا ہے جو ''خبر نامہ'' نہ پوچھ!
قاضی اطہر کا ہے وہ کیسا ''سفر نامہ'' نہ پوچھ!

تجھ کو رہتی تھی ''نئی منزل'' کی ہر دم جستجو،
تو نے اپنے ہر ''ادب'' میں بھر دیا ''دل کا لہو''
تو رہا بنکر ہمیشہ ''علم و فن کی آبرو''!

ہیں تیری جو ''خدمتیں'' وہ ''لائق توصیف'' ہیں،
تیری ''تصنیفات'' بے شک! ''قابل تعریف'' ہیں!

یاد ہیں ہم کو وہ ماضی کی سبھی ''سرگرمیاں''،
جو ہمیشہ ہی رہیں، ''تہذیب'' کی روحِ رواں!
نقش ہیں ہر ایک دل پر آج بھی جن کے نشاں،

پھر پریشاں کر رہی ہے ''عہدِ شائستہ'' کی یاد!
دل کو تڑپانے لگی ہے ''عظمتِ رفتہ'' کی یاد!

اے ''فدائے علم و دانش''! ''تیری حکمت'' کو سلام،
کہہ رہا ہے ''تیرا ساغر''، ''تیری رفعت'' کو سلام،
اے مؤرخ قاضی اطہر! تیری ''عظمت'' کو سلام!

''روشنی'' جس کی، نہ ہو زائل، تو وہ ''خورشید'' ہے،
مر کے بھی تو اس جہاں میں ''زندۂ جاوید'' ہے!

از

تأثراتِ قلم، ایم اے ساغر ادروی
ادری ضلع مئو اتر پردیش
۷/شعبان ۱۴۲۹ھ

۱۰/اگست ۲۰۰۸ء

بیادگار حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ

سایۂ ہما تھا وہ

از عبدالوحید قاسمی

نقیب موسم گل تھا متاعِ عزت تھا
وہ دورِ شوکتِ و اقبال کی علامت تھا

گزر گیا سریر آرائے علم و حکمت تھا
وہ فخر دین کا پروردہ فخر ملت تھا

اداسیوں کے ہر اِک سمت سلسلے کیوں ہیں
تھکن سے چور ہمارے یہ قافلے کیوں ہیں

یہ کس کے جانے پہ دنیائے علم سونی ہے
فضائے صحن چمن ماتمی ہے، خونی ہے

ادیب و شاعر و راز آشنا و نکتہ داں
خطیب و عالم و فاضل، مورّخِ دوراں

ادب کے گیسوئے پیچاں سدھارنے والا
غزل کی زلف پریشاں سنوارنے والا

وہ تاجدار معارف وہ بادشاہِ قلم
عرب کا نغمۂ شیریں از زبانِ عجم

وہ علم وفن کا نگہبان تھا زمانے میں
وہ عہد ماضی کی پہچان تھا زمانے میں

پیامِ نو تھا ہر اِک فن کے راہ رو کے لیے
خدا تعالیٰ کا انعام نسل نو کے لیے

علوم دیں کی امانت کا پاسبان تھا وہ
دیارِ شرق کی عظمت کا اِک نشان تھا وہ

اب اپنے خواب کی تعبیر کون لکھے گا
ہمارے عہد کی تاریخ کون لکھے گا

اے شمعِ خفتۂ زندہ دلانِ اعظم گڑھ
بہارِ رفتۂ دیں پرورانِ اعظم گڑھ

ہمیشہ یاد میں روئیں گے تیرے ساقی و رند
جہاں میں باقی ہے جب تک رجال سندو ہند

تمہاری ذات تواضع تھی، خاکساری تھی
تھا حسن خلق، بصیرت تھی، بردباری تھی

تجھے سعادت دنیا و دیں میسر تھی
تمہارے نور سے ساری زمیں منور تھی

تم اپنی صورت وسیرت میں رشکِ اختر تھے
تم اسم عرف میں کہتے ہیں لوگ اطہر تھے

حسین پھول تھا وہ ایک باغ امت کا
یہ کس ہوا نے بجھایا چراغ امت کا

اُف اے وحید کہ ابر گریز پا تھا وہ
ہمارے سر کے لیے سایۂ ہُما تھا وہ

چمن اداس تھا کل آبدیدہ شبنم تھی
وحید اس کی جدائی ہمالۂ غم تھی

از

مولانا عبدالوحید قاسمی
پارہ کمال، ضلع جونپور، اتر پردیش
۱۴۱۷ھ - ۱۹۹۶ء

شمع ھدی انوارِ سبحانی

از

مؤرّخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ

سلام اس ذات پر جس کا لقب ہے فخر انسانی
سلام اس ذات پر آئی جو بن کر ظل سبحانی

سلام اس ذات پر جو باعث تکوین عالم ہے
سلام اس ذات پر جس کے سبب کونین کا دم ہے

سلام اس ذات پر جس کا تبسم روح میخانہ
سلام اس ذات پر جس کی نگاہیں جام و پیمانہ

سلام اس ذات پر جس کی ادا صبح حنیفانہ
سلام اس ذات پر جس کی ادائیں شام میخانہ

سلام اس ذات پر جس کی صباحت فخر کنعانی
سلام اس ذات پر جس کی ہیں زلفیں سلک نورانی

سلام اس ذات پر روئے جوامت کی خطاؤں پر
سلام اس ذات پر جس نے دعائیں دیں جفاؤں پر

سلام اس پر جو چمکا کفر کی کالی گھٹاؤں میں
سلام اس پر جو نغمہ بن گیا روتی فضاؤں میں

سلام اس پر جو اٹھا ہاتھ میں تیغِ دودم لے کر
سلام اس پر جو آیا ساتھ باران کرم لے کر

سلام اس پر جو جلوہ گر ہوا روشن جبیں ہوکر
سلام اس پر جو آیا رحمۃ للعالمین ہوکر!

سلام اس پر جو سویا بھی تو حال قوم پر روکر!
سلام اس پر جو راتیں کاٹ دیتا خاک پر سوکر

سلام اس پر جو دیتا ہے فقیروں کو بھی دارائی
سلام اس پر جو دیتا ہے مریضوں کو مسیحائی

سلام اس پر جو ہے شمع ہدا، انوارِ سبحانی
سلام اس پر جو ہے تفسیرِ رحمت فیضِ ربانی

سلام اُن پر ہو اور اُن کے صحابہ کی جماعت پر
سلام اُن پر ہو اور اُن کے فداکاروں کی تربت پر

سلام اُن پر ہو اور اُن کے گلوں کی پاک نکہت پر
سلام اُن پر ہو اور اُن کے لگائے باغِ جنت پر

سلام اُن پر ہو اور اُن کی ادا پر مرنے والوں پر
سلام اُن پر ہو اور اُن کے کنارے سارے ہالوں پر

سلام ان پر ہو اور ان کے فدا پُر جوش لوگوں پر
سلام ان پر ہو اور ان کے کفن بردوش لوگوں پر

ابو سعید بزمی

۱۶؍ستمبر ۱۹۵۱ء

غیر منقسم ہندوستان کی صحافی برادری کے ماہر فن اور مسلمہ صحافت نگار مسٹر ابوسعید بزمی ۱۶؍ستمبر ۱۹۵۱ء کو ہالی ووڈ (امریکہ) کے پلازہ ہوٹل میں قلب کی حرکت بند ہوجانے سے انتقال کر گئے، مرحوم دو ماہ سے امریکی دفتر خارجہ کی دعوت پر امریکہ کا دورہ کر رہے تھے، ان کی وفات جاپان سے معاہدۂ امن کانفرنس منعقد سان فرانسسکو سے واپسی پر ہوئی۔

مرحوم بھوپال کے رہنے والے تھے، ایک زمانہ تک اخبار مدینہ بجنور کو اپنے سیاسی افکار اور بین الاقوامی معلومات سے ملک وقوم کی خدمت کرتے رہے، ۱۹۴۶ء میں لاہور گئے، اور ادارہ زمزم سے منسلک ہوگئے، بندہ بھی ان دنوں مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط کی شاگردی میں اخبار زمزم میں کام کر رہا تھا، مرحوم سے وہیں ملاقات ہوئی، اور کم وبیش دو سال تک ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، مرحوم ایک گریجویٹ ہونے کے باوجود مذہبی قسم کے آدمی تھے، عربی میں درک رکھتے تھے، مرحوم اپنی مشہور کتاب ''انقلاباتِ عالم'' جسے انھوں نے جیل خانہ میں لکھا تھا، جب صاف کر رہے تھے تو اکثر ''حاضر العالم الاسلامی'' لے کر میرے کمرے میں بلا تکلف چلے آتے، اور دیر تک افہام وتفہیم کا سلسلہ جاری رکھتے، اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ امام سرخسیؒ کی ''مبسوط'' بھی لائے تھے، آخر میں تو وہ اسلامیت پر زیادہ لکھنے لگے تھے، زمزم کے بعد انھوں نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے ''اخبار احسان'' لاہور کو منتخب کیا، اور تقسیم کے وقت لاہور ہی میں رہ گئے تھے۔

بہر حال ابوسعید بزمی کی وفات ہندوستان کی سیاسی، فکری، اور ادبی تاریخ کا ایک حادثہ ہے، جسے ہمارے آنسو مٹا نہیں سکتے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ (انقلاب ممبئی ۲۰؍ستمبر ۱۹۵۱ء)

علامہ اقبال احمد خاں سہیل اعظمی

نومبر ۱۹۵۵ء

عہد گل ختم ہوا ٹوٹ گیا ساز چمن　　　اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پرواز چمن

دو دن کی بات ہے کہ اردو زبان کے قدیم محسن اور سرپرست علامہ کیفی اپنی زندگی کے دن پورے کر کے دنیا سے تشریف لے گئے اور پورے ہندوستان میں اردو ادب وفن کی محفلیں سوگوار ہوئیں ابھی علامہ کیفی کے غم سے ہمیں فرصت نہیں ملی تھی کہ اردو شعر وادب کا ایک اور محسن عظیم چل بسا۔ اس محسن عظیم سے ہماری مراد علامہ اقبال احمد خاں سہیل بی اے، ایل ایل بی، ایڈوکیٹ اعظم گڑھ کی ذات گرامی ہے مرحوم ۸/اور ۹/نومبر کی درمیانی شب میں اس دنیا سے رخصت کیا ہوئے کہ شبلی مرحوم کی محفل شعر وسخن کی آخری شمع بجھ گئی اور اب اس دنیا میں شبلی کے ادبی ذوق اور شاعرانہ کمال کا کوئی ترجمان نہ رہا۔ علامہ سہیل مغربی اعظم گڑھ کے ایک گاؤں ''بڑہریا'' کے رہنے والے تھے انھوں نے پوری زندگی اعظم گڑھ میں وکالت کرتے ہوئے گزاری مگر وکالت جیسے خشک پیشہ کے ساتھ علم وادب اور شعر وفن کے چمن کو اپنی نوا سنجی اور نغمہ سرائی سے تر وتازہ اور آباد رکھا۔

مرحوم عربی، فارسی، اردو اور انگریزی چاروں زبانوں کے بہترین ادیب ونقاد تھے اور سب ہی پر عبور رکھتے تھے ان کو عربی اور اردو اور فارسی کا تقریباً سارا سرمایہ علامہ شبلی مرحوم کی ذات سے ملا تھا۔ اور مرتے دم تک انھوں نے اس کی پوری حفاظت کی اور وہ نہایت سلیقہ مندی سے اسے استعمال کرتے رہے۔

سہیل اپنی غزلوں اور قصیدوں میں شبلی ثانی کی حقیقت رکھتے ہیں خصوصیت سے قصیدہ گوئی میں آج کے ہندوستان و پاکستان میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ وہ جب کوئی قصیدہ لکھتے تھے تو اس میں دریا کا تموج، ہوا کی روانی چمن کی خوشبو اور برسات کی بہار کی فراوانی ہوا کرتی تھی۔

علامہ سہیل اپنی غزل گوئی میں الفاظ ومعانی کی رنگینی کے اندر متانت وسنجیدگی کا سماں باندھتے تھے۔ وہ خود بہت پھرتیلے لاپرواہ بے غم اور لاابالی قسم کے آدمی تھے، مگر نظم ونثر میں ان کی یہ باتیں کمالات کا رنگ اختیار کر لیتی تھیں۔ برجستہ لمبے لمبے قصائد کہہ دینا ان کے لئے معمولی بات تھی وہ جب رنگ پر آتے تو سبعہ معلقہ اور دیوان حماسہ کے اور دوسرے قدیم وجدید عربی شعراء کے

پورے پورے قصیدے زبانی سناتے چلے جاتے تھے۔ فارسی کا ذوق بھی شعرالعجم کے مصنف ہی سے ورثہ میں ملا تھا۔

سہیل کا فنی اور شعری کمال اصغر گونڈوی کی ''نشاط روح'' کے بے مثال مقدمہ سے معلوم ہوسکتا ہے جس نے بڑی حدتک اصغر کو اصغر بنادیا، سہیل نے کبھی اپنی غزلوں اور نظموں کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی اور اپنے تمام ادبی اور فنی سرمایہ کو شاعرانہ بے نیازی کی نذر کرتے رہے بڑی تلاش وجستجو کے بعد ان کے کلام کا ایک مجموعہ محمد حسن انٹر کالج جونپور کے میگزین میں 'سہیل نمبر' کی شکل میں بڑے سائز کے ۱۶۸ صفحات پر شائع ہوا تھا اسی طرح ایک طویل نعت ''موج کوثر'' کے نام سے شائع ہوچکی ہے اب جبکہ ''اعظم گڑھ اسکول'' سہیل سے محروم ہوگیا ہے ضرورت ہے کہ ان کے ادبی اور شعری ورثہ کو اخبارات ورسائل کی پرانی فائلوں اور سڑے گلے کاغذوں سے حاصل کیا جائے اسی طرح نظم کے علاوہ نثر نگاری میں وہ شبلی مرحوم کے طرز انشاء کے حامل تھے۔ ان کے ادبی تنقیدی اور مذہبی مضامین ومقالات کو بھی جمع کر کے شائع کرنا علم وادب کی بڑی خدمت ہے اور ساتھ ہی سہیل مرحوم کے حق کی ادائیگی سے سبکدوشی بھی ہے۔

سہیل مرحوم کی شاعری اس اعتبار سے قوم کا بہترین سرمایہ ہے کہ انھوں نے اپنے قصائد میں اسلامی تاریخ کو بہترین اسلوب اور موثر انداز میں جمع کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے مناقب وفضائل کو سہیل مرحوم نے جس والہانہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے وہ اردو زبان کے کسی دوسرے شاعر کے حصہ میں نہیں آیا۔

مشکل سے مشکل بحور وقوافی میں ہر قسم کے معانی کا اداء کرنا بھی سہیل مرحوم کے لئے معمولی بات تھی فارسی نظموں اور غزلوں میں وہ اپنے وقت کے قاآنی خاقانی تھے۔ ان تمام کمالات کے باوجود وہ اپنے دوست احباب سے نہایت بے تکلفی اور شفقت سے پیش آتے تھے، ایک مرتبہ راقم الحروف نے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں شاعری میں شرف تلمذ حاصل کرنے کے لئے علامہ سہیل کو لکھا تو اس کے جواب میں مرحوم نے تحریر کیا کہ

شعراء تلامیذ الرحمٰن'' ہوتے ہیں ان کے لئے کسی استاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر جہاں تک آپ کے تشریف لانے کا تعلق ہے اس کے لئے میرا غریب خانہ خانۂ خدا کی طرح ہر وقت کھلا ہے ضرور آیئے اور بار بار آیئے۔

روزنامہ انقلاب ممبئی

امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ

۲۲؍فروری ۱۹۵۸ء

امام الہند حضرت مولانا محی الدین احمد ابوالکلام آزاد تین چار دن کی کش مکش کے بعد ۲۱؍فروری ۱۹۵۸ء کا دن گزار کر رات کے سوا دو بجے انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۶۹ سال کے لگ بھگ تھی، آپ کے انتقال سے پورے عالم اسلام میں اسلامی فکر ونظر کی دیواریں لرز گئیں، عالمی سیاست وتدبیر کی انجمن میں اداسی چھا گئی اور ہندوستان کی گود ایک ایسے سپوت سے خالی ہوگئی، جو آنکھ کھولنے کے بعد سے آنکھ بند ہونے کے وقت تک دنیا میں سربلند ومعزز رہا اور پوری دنیا نے اس کی شخصیت کو سراہا۔

مولانا آزاد کی پوری زندگی علم وفکر اور کردار جہاد میں گزری، انہوں نے اپنے لئے جو راہ پہلے دن منتخب فرمائی تھی، وہ آخر دن تک اسی راہ پر گامزن رہے۔ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے ''الہلال'' و''البلاغ'' کے ذریعہ ہندوستان کی امت مسلمہ میں دینی زندگی اور ملی حیات کی جو روح پھونکی، اس نے قوم کے فکر ونظر کا مزاج بدل دیا اور تحریر وتقریر میں ایک نیا رنگ پیدا کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد کے کارناموں میں صرف الہلال والبلاغ کو لے لیا جائے تو ان کی شخصیت سازی کیلئے یہ دونوں کافی ہیں اور مزید کسی کارنامہ کی ضرورت نہیں ہے۔ الہلال والبلاغ کو مولانا نے اپنی دعوت فکر ونظر کے لئے بانگ درا بنایا اور پوری قوم کو اس آواز پر بیدار فرمایا، اس کے بعد اپنی تصنیفات وتالیفات کے ذریعہ قوم میں زندگی کی صلاحیت پیدا کی۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالکلام آزاد کو فکر ونظر کے ساتھ ساتھ تحریر وتقریر میں ایک خاص قسم کی امتیازی استعداد عطا فرمائی تھی، جس نے اردو خطابت وصحافت کو جوش، ہوش، تاثیر وتاثر اور زندگی بخشی۔

مولانا نے اپنے خاص اسلوب بیان اور طرز تحریر کے ذریعہ جو کارنامے انجام دیئے ہیں، ان میں آتش بار تقریروں اور روح افزا خطبوں کے علاوہ کئی بلند پایہ تصانیف بھی ہیں، قرآن حکیم کی تفسیر میں ''ترجمان القرآن'' آپ کی علمی اور دینی زندگی کا خاص شاہکار ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کی آزادی اور ملکی سیاست میں کانگریس کو اس طرح اپنایا کہ اپنوں کے طوفان اور غیروں کے زلزلے آئے، مگر آپ نے ہر ہوا کے رخ کا مقابلہ کیا اور اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہٹے، حتیٰ کہ آخر عمر میں وہ آزاد ہندوستان اور کانگریس کی روح بن کر رہے، اور دنیا سے گئے تو دونوں کو اپنے لئے شدید ترین محتاج بنا کر چھوڑ گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد علم وفکر، خطابت، انشا، دوراندیشی، استقامت وضعداری، بے نیازی، حلم وبرداشت، اور عزت ووقار میں اپنے دور میں بس ایک ہی انسان تھے، جو ان تمام اوصاف کے ساتھ دنیا سے چلے گئے، مولانا نے ایک مکتوب میں اپنے بارے میں چند سطریں لکھیں ہیں، جن سے آپ کی زندگی کی پوری آئینہ داری ہوتی ہے، فرماتے ہیں، آپ مرنے والے کی زبان ہی سے اس کا مرثیہ سنیئے:

> ''بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت والم کا ایک عجیب کیف طاری ہوجاتا ہے، علوم وفنون ادب، انشاء، شاعری کوئی وادی ایسی نہیں، جس کی بے شمار نئی راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد کے دل ودماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن لحظہ بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو، بحدیکہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنیٰ کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں، اور ہر منزل کی کرشمہ پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کردیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر ونظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا۔ اسی نے شاید سروسامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا نہ تعلّٰی بلکہ سراسر حقیقت ہے، کاش! مجھے اندازہ شناسی میں شناسائی کا درجہ نصیب ہوتا تو اس کی زبان سے کہتا:
>
> دورہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود
>
> بایزید اندر خراساں'' یا اویس اندر قرن''

(البلاغ مارچ ۱۹۵۸ء)

پروفیسر مولانا الیاس برنی

جنوری ۱۹۵۹ء

جنوری ۱۹۵۹ء میں ہندو پاکستان میں دو ایسی علمی شخصیتوں نے انتقال کیا جو ایک طرف جدید علوم وفنون کی ماہر تھیں اور دوسری طرف قدیم اسلامی علوم وفنون میں اچھی خاصی بصیرت رکھتی تھیں ان میں سے ایک مرحوم مغفور پروفیسر مولانا الیاس برنی کی ذات ہے۔ مرحوم معاشیات کے گویا امام تھے، اور جدید مغربی علوم وفنون کے جامع تھے، ساتھ ہی ملی اور دینی اصلاح وتنظیم سے ان کو شغف تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ''قادیانی مذہب'' نامی ایک ایسی کتاب لکھی جو قادیانی فرقہ کے بطلان پر زبردست دلیل بن کر دنیا میں قبول ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی مرحوم نے مرزائی فرقہ اور دوسرے باطل فرقہ کی رو میں کئی اہم کتابیں لکھیں جن میں سے کئی ایک کے ترجمے انگریزی اور عربی وغیرہ میں ہو چکے ہیں۔ آپ کی ذات قدیم وجدید افکار ونظریات کا بہترین امتزاج تھی۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

دوسرے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مدیر ''ثقافت'' لاہور کی حالیہ وفات سے عالمِ اسلام کے مسائل پر ایک اچھے لکھنے والے کی کمی ہوگئی۔ آپ آج کل ثقافت اسلامیہ پاکستان کے رکن رکین اور اس کے ترجمان کے مدیر اور اسلامی تہذیب وتمدن کے زبردست مبلغ تھے۔

ان دونوں حضرات کی وفات سے ہندوستان و پاکستان کے علمی دینی اور فکری حلقوں میں ایک خاص خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اپنی بے شمار رحمتوں سے نوازے۔ (آمین)

(انقلاب ممبئی ۷ جنوری ۱۹۵۹ء)

حاجی اسداللہ دادا مبارکپوری

۲۸ / جولائی ۱۹۶۲ء

حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن ایک صحابی نے کہا تھا:

للنـــاس همٌ ولي اليوم همـان

هم الجـراب و هم الشيخ عثمان

یعنی سب کے لیے تو آج ایک غم ہے مگر میرے لیے دوغم ہیں، ایک غم جھولے کا اور دوسرا غم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا۔

رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ان صحابی کو کچھ کھجوریں دی تھیں، جن کو انہوں نے ایک جھولے میں رکھ لیا تھا اور اس میں یہ برکت ہوئی کہ اس سے کھجوریں نکال نکال کر کھاتے تھے، مگر ختم نہیں ہوتی تھی، اتفاق سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن وہ جھولا بھی گم ہو گیا تھا۔

کچھ اسی قسم کا حال راقم کا ہے کہ جس دن مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر ملی اسی دن گھر کے خط سے ہمارے بڑے والد حاجی میاں صاحب اسداللہ مرحوم کے انتقال کی خبر ملی کہ مرحوم ۲۵ / صفر ۱۳۸۲ھ مطابق ۲۸ / جولائی ۱۹۶۲ء کو چار بجے دن میں انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم لوگ ان کو دادا کہتے تھے، خاندان کے سب سے بزرگ تھے، اسّی سال کے قریب کی عمر تھی، پوری زندگی باغ و بہار بن کر رہے، تنگی ہو کہ فراخی ہر حال میں یکساں خوش وخرم رہے، خاندان کی تاریخ خوب بیان کرتے تھے، دسویں صدی ہجری میں شاہانِ شرقیہ جونپور کے زمانہ میں حضرت راجہ حامد شاہؒ کے خاندان کے بزرگ راجہ مبارک شاہ کے ساتھ ہمارے خاندان کے لوگ مانک پور کڑا سے مبارکپور آئے اور یہاں برآباد

ہونے کی پوری داستان ان کو ازبر تھی، مبارکپور کا مشہور تاریخی ہندو مسلم جھگڑا جو ''گئو شاہی'' کے نام سے مشہور ہے، اس میں ہمارے دادا بھی ماخوذ تھے، یہ واقعہ ان کی عین جوانی کے زمانہ میں ہوا تھا، جس میں مبارکپور کے مسلمان نوجوانوں نے اپنی جواں مردی کی دھاک اطراف وجوانب میں بٹھائی تھی اور پچاس سال سے زائد تک اس کا چرچا عام تھا، آخری زندگی کے ایام میں صرف نماز وروزہ سے مطلب رہ گیا تھا، خاندان کے بچوں اور بڑوں سب کے دادا تھے اور سب ان سے خوش رہتے تھے، ۱۹۱۲ء میں الٰہ آباد کی مشہور نمائش میں انہوں نے انگریزی حکومت سے سند اور تحفہ پایا تھا، جو اب تک ہمارے یہاں موجود ہے اور ''تاریخ المنوال'' میں اس کا تذکرہ ہے، مسجدوں کی تعمیر ومرمت، میلاد شریف، شبینہ اور اسی قسم کی مذہبی تقریبات کے منتظم اعلیٰ تھے اور ان کو بڑے سلیقہ سے انجام دیتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور انسانی کمزوریوں کو اپنے دامن عفو وکرم سے چھپالے۔ آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ انقلاب ممبئی ۶/اگست ۱۹۶۲ء)

علامہ احمد شبلیؒ

۳ر نومبر ۱۹۶۳ء

۳ر نومبر ۱۹۶۳ء کو علامہ احمد شبلی انتقال فرما گئے، رحمۃ اللہ علیہ، شبلی صاحب شہر بمبئی کے رہنے والے تھے، آبائی وطن مسقط تھا، سلطان مسقط کے معتمد تھے، عربی ادب ومحاضرات اور ادبی نحو ونکاہات پر کافی عبور تھا، فارسی اور حتیٰ کہ مراٹھی بھی اچھی خاصی جانتے تھے، اردو میں شاعری اور مقالہ نگاری بھی کرتے تھے، ایک زمانہ میں بمبئی کی ادبی محفلوں میں ان کا خوب چرچا رہا کرتا تھا، ملنسار ہنس مکھ، اور خوش وخرم آدمی تھے، مجلسی آداب وفنون سے خوب واقف تھے، غرض کہ مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، ان کا نام پہلی مرتبہ بمبئی کے ایک مناظرہ میں حکم اور فیصل کی حیثیت سے دیکھا تھا، پھر بمبئی آنے کے بعد ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، آخری زمانہ میں آکثر بیمار رہا کرتے تھے، آخری ملاقات دولت کویت کے جلسہ استقبال میں تاج محل میں ہوئی تھی، علامہ شبلی کے انتقال سے بمبئی کی علمی وادبی دنیا میں بڑی کمی پیدا ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ

۱۳؍رجب ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء

۱۳؍رجب ۱۳۸۶ھ کو مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ نے پاکستان میں انتقال فرمایا۔ قاضی احسان صاحب اپنے زمانہ کے بہترین قادر الکلام خطیب تھے، وہ بیک وقت محراب ومنبر اور مدرسہ کی رونق تھے، عرصہ دراز تک حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے رفیق کار اور مجلس احرار کے قائد رہے، بڑے باغ و بہار آدمی تھے، مجلس احرار کے دور شباب میں جب ہم لوگوں کا بچپن تھا، ہندوستان کے گوشے گوشے میں مشہور تھے، ان سے راقم کی آخری ملاقات لاہور میں ۱۹۴۵ء سے وسط ۱۹۴۷ء تک رہیں، دفتر مجلس احرار میں حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ قیام کرتے تھے، بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے تھے۔ اس زمانہ میں راقم کی حیثیت شاعر کی تھی اور ہندوستان کے مختلف اخباروں اور رسالوں میں غزلیں اور مذہبی سیاسی نظمیں چھپتی تھی، مرحوم ان میں سے بعض کو اپنی پسند کی بنا پر یاد کر لیتے تھے اور جب ملاقات ہوتی تو پوری پوری نظم زبانی سناتے اور خوب اس کی داد دیتے تھے، حالاں کہ اس زمانہ میں راقم طالب علم تھا اور وہ صاحب زادے اور شیخ زادے اور بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (انقلاب ممبئی)

احمد غریب صاحب میمنی

۱۴؍جولائی ۱۹۶۷ء

افسوس کہ عالیجناب احمد غریب صاحب نے ۶؍ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ/۱۴؍جولائی ۱۹۶۷ء کو جمعہ کا دن گزار کر شنبہ کی رات میں کراچی میں انتقال کیا رحمۃ اللّٰہ رحمۃً واسعۃً مرحوم احمد بھائی کی وفات برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کی ملی تاریخ کا بڑا المیہ ہے، ان کے ساتھ اسلامی، دینی واصلاحی، اور تبلیغی کارناموں کی وہ شاندار روایات چلی گئیں، جو مسلمان تاجروں اور ارباب دولت و ثروت کے بارے میں مشہور ہیں، وہ ایک مدت سے کم و بیش چودہ پندرہ اداروں کے مستقل سرپرست و نگراں تھے، جن میں انجمن خدام النبی، رسالہ البلاغ، صابو صدیق مسافر خانہ، پورٹ حج کمیٹی اور بمبئی کے اوقاف و مساجد کے ادارے سماجی کمیٹیاں، اصلاحی انجمنیں سب ہی شامل ہیں۔ وہ ایک صاحب دل تاجر کے چار سپوتوں میں سے ایک تھے، ان بھائیوں کی نوعمری ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، والدہ مرحومہ نے ان چاروں جگر گوشوں کی پرورش کی، ان کی دینی تربیت کی، خاندانی سرمایہ حالات زمانہ کی نذر ہو چکا تھا، مگر والدہ کی تعلیم و تربیت اور لڑکوں کی صلاحیت نے بہت جلد کاروبار میں دن دونی رات چوگنی ترقی کی اور بمبئی کے کامیاب تاجر بن گئے، چوں کہ چاروں بھائیوں کا مزاج صالح اور زندگی دینی تھی، اس لیے انہوں نے دین اور اہل دین سے ہمیشہ تعلق رکھا اور اس راہ میں وقت، محنت اور دولت کا نہایت فراخ دلی سے اور انشراح قلب کے ساتھ استعمال کیا، ان میں ہر ایک اپنی ذات سے ایک انجمن اور ادارہ تھا مگر مرحوم احمد بھائی صاحب اپنی سلامتی طبع، عزت، نفس، دینی و علمی تعلق اور روحانی نسبت میں ممتاز مقام رکھتے تھے، وہ شکل و صورت کے اعتبار سے جدید طبقہ کے آدمی معلوم ہوتے تھے مگر دل و دماغ کے اعتبار سے سچے مسلمان اور پکے دین دار تھے،

روحانی زندگی اور احسانی نسبت کا یہ حال تھا کہ تلاوت قرآن مجید ہی نہیں اوراد ووظائف بھی ان کے معمولات زندگی میں سے تھے، ہندوستان، پاکستان اور سعودی عرب کے اکثر ارباب دین ودیانت اور اہل علم وفضل سے ان کے تعلقات نہایت خوشگوار اور شگفتہ تھے، دینی اداروں اور مدرسوں سے گزر کر علمی ودینی افراد کی دل کھول کر مدد کرتے تھے، حج اور حجاج کا موضوع تو گویا ان کی عملی زندگی کا نمایاں پہلو تھا۔ وہ اپنے پیچھے کتنے ہی اداروں اور افراد کو غمگین چھوڑ گئے، بمبئی میں دینی تعلیمی کنونشن بھی ان کا اور ان کے بھائیوں کا بہترین اور یادگار ملی کارنامہ ہے، مسافر خانہ صابوصدیق کو ان کے دور سرپرستی میں تعمیر ومرمت کا بہترین موقع ملا، تبلیغی جماعت سے ان کا قلبی اور عملی دونوں قسم کا تعلق تھا، وہ گجراتی کے بہترین مضمون نگار اور اردو زبان کے اچھے لکھنے والوں میں سے تھے، ان کی تالیفی وتصنیفی یادگار میں ''غریب کا حج'' اردو اور گجراتی زبانوں میں مناسک حج کے موضوع پر منفرد کتاب ہے، البلاغ کے شذرات مدتوں تک وہی لکھتے رہے، اس کے علاوہ متعدد مقالات ومضامین حج اور دوسرے موضوعات پر لکھے، آل انڈیا بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے اسلامی تقریبات پر ان کی تقریریں نشر ہوتی تھیں، وہ گجراتی، انگریزی، میمنی زبانوں کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم وجدید عربی زبان سے واقف تھے، انہوں نے راقم سے تقریباً پندرہ سال تک حدیث کا درس لیا تھا اور اس مدت میں ریاض الصالحین، خلاصہ مسلم شریف اور المنتقیٰ لابن جارود کو سبقاً سبقاً مع ان کے جملہ مباحث ومطالب کے پڑھا، وہ اپنی زندگی بھر شعلہ جوالہ رہے، قلم ہاتھ میں گردن میں دبا ہوا ٹیلیفون کان پر اور زبان بات چیت میں، اس طرح دوکان پر وہ بیک وقت تین کام کرتے تھے، دیانت وامانت اور صاف گوئی کا یہ عالم کہ بڑے بڑے غیر مسلم تاجر بھی ان کے یہاں تجارتی معاملات سلجھانے اور ان سے فیصلہ کرانے آتے تھے، اور لاکھوں کی امانتیں بلا تکلف ان کی میز پر رکھ کر چلے جاتے تھے، ایسے مقبول وہر دلعزیز احمد بھائی کا دنیا سے بیک وقت رخصت ہو جانا بڑے ابتلاء کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے نیک کاموں کی بہترین جزا دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ (البلاغ اگست ۱۹۶۷ء)

سید احمد مدنیؒ

افسوس کہ گزشتہ چند مہینوں میں حجاز مقدس کی تین اہم علمی و دینی شخصیتوں نے وفات پائی، علامہ شیخ سید علوی مالکی مکی، مولانا سید احمد صاحب مدنی اور شیخ محمد نصیف جدہ رحمہم اللہ تعالیٰ، علامہ سید علوی مالکی کے بارے میں لکھا جاچکا ہے، مولانا سید احمد مدنیؒ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب کے بھائی تھے، اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں ہی رہ بس گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی وجاہت ومقبولیت دی تھی، سعودی حکومت کے خاص معتمدوں میں سے تھے، دنیاوی جاہ وجلال حاصل تھا اوراثر ورسوخ کے مالک تھے، ترکوں اور شریف مکہ کے زوال اور سعودی حکومت کے اقتدار کے سرد وگرم سے گزرے تھے، مدینہ منورہ میں خاص کر بہت سے اہم علمی، دینی اور سماجی کام کئے۔ حرم محترم سے خاص شغف تھا، بالالتزام گھر سے مسجد نبویؐ میں نماز کے لئے آیا کرتے تھے، مدتوں مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ کی سرپرستی کی، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ (البلاغ ۱۹۷۱ء)

الحاج ابراہیم صاحب موتی والے

افسوس کہ اس درمیان میں ہمارے بمبئی حلقہ کے ایک بزرگ الحاج ابراہیم موتی والے صاحب نے اپنے وطن دھوراجی سوراشٹر میں انتقال کیا، وہ بمبئی کے مشہور تاجروں میں تھے، اور میمن برادری میں اپنی علمی اور دینی معلومات اور زندگی کی وجہ سے نمایاں حیثیت کے مالک تھے، اردو زبان کے اچھے بولنے، لکھنے والے اور بدعات وخرافات سے بہت دور تھے، توحید اور کتاب وسنت کے بارے میں ان کی شدت مشہور تھی، مطالعہ کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے، ان کا کتب خانہ علمی اور دینی معیاری کتابوں پر مشتمل تھا، انہوں نے کئی سال ہوئے اپنے ایک صاحب زادے کی شادی کے موقع پر راقم کو اپنے وطن بلالیا تھا، اس سفر کے کوائف اسی زمانہ میں البلاغ میں شائع ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے، آمین۔ (البلاغ فروری ۱۹۷۰ء)

مفتی امین الحسینی سابق مفتی اعظم فلسطین

۶/ جولائی ۱۹۷۴ء

افسوس کہ ۶/ جولائی ۱۹۷۴ء کو مفتی امین الحسین سابق مفتی اعظم فلسطین نے بیروت میں تقریباً ۷۶ سال کی عمر میں انتقال کیا، وہ عرب ممالک کے بلکہ عالم اسلام کے ان قائدین میں سے تھے، جن کا تعلق علامہ جمال الدین افغانی، شیخ عبدالرحمٰن کواکبی، امیر شکیب ارسلان، رشید رضا، زغلول پاشا وغیرہ کے فکر ونظر سے تھا، ۱۹۲۰ء میں جب برطانیہ سے فلسطین کو ارض یہود بنانے کا اعلان بالفور ہوا، اس وقت سے مفتی صاحب مرحوم میدان جہاد میں نکلے اور پوری دنیا میں اس کے خلاف سرگرمی دکھائی، اس درمیان میں ہر اسلامی تحریک میں وہ پیش پیش رہے اور یورپ، ایشیاء اور افریقہ کے متعدد ممالک کا دورہ کیا، اس سال رابطہ عالم اسلامی کے سالانہ جلسہ میں مکہ مکرمہ میں ان کی زیارت ہوئی تھی، وہ تبرک ہو چکے تھے مگر ان کی خطابت میں بلا کا زور اور جوش تھا۔ انہوں نے کہا کہ میرے سامنے کی بات ہے کہ یہودیوں کی انجمن اتحاد وترقی نے سلطان عبدالحمید کو بھاری دولت کی پیش کش کر کے فلسطین کو وطن یہود بنانے کی درخواست کی تھی مگر سلطان نے صاف جواب دیا کہ فلسطین کی ایک مٹھی خاک تمہاری دنیا بھر کی دولت سے میرے نزدیک اعلیٰ وافضل ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور مسلمانوں کو ان کا نعم البدل دے۔

(البلاغ اگست ۱۹۷۴ء)

حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب افغانی

۲۳ر جولائی ۱۹۷۵ء

یہ المناک خبر برصغیر ہندو پاکستان ہی میں نہیں پورے عالم اسلام بلکہ پوری دنیا کے اہل علم میں نہایت رنج وغم کے ساتھ سنی گئی کہ حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب افغانی صدر لجنۃ احیاء المعارف حیدرآباد ۱۳ر رجب المرجب ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۳ر جولائی ۱۹۷۵ء کو بروز چہارشنبہ صبح ۶ بجکر ۵۵ر منٹ پر ذات الجنب کے مرض میں وفات کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون رحمہ اللہ تعالیٰ وغفرلہ، وفات کے آخری وقت ذکر الٰہی اور رجوع الی اللہ کی وہی کیفیات تھیں، جو علماء ومشائخ اور سلف صالحین کے حق میں مبشرات کی حیثیت رکھتی ہیں، اس وقت ان کی عمر ۸۵ سال کی تھی، ان کا نام سید محمود شاہ بن سید مبارک شاہ قندھاریؒ تھا۔

مولانا مرحوم ایک طرف کامل درویش، عابد وزاہد اور باخدا بزرگ تھے اور دوسری طرف زبردست عالم ومحقق اور علمی دنیا کی مسلمہ شخصیت کے مالک تھے، ان کی ذات میں علمیت اور شخصیت کا جس قدر کامیاب امتزاج پایا جاتا تھا، اس کی مثال شاید اب نہیں مل سکے گی، ان کی علمی خدمات نے ان کو علمی دنیا میں صف اول کے علماء میں جگہ دی تھی، پوری علمی دنیا سے ان کے تعلقات تھے حتیٰ کہ یورپ کے مستشرقین ان سے استفادہ کرتے تھے، حضرت مولانا کا سب سے بڑا دینی اور علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تلامذہ اور متوسلین کی ایک مختصر سی جماعت لے کر حیدرآباد میں لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور نہایت خاموشی اور اخلاص کے ساتھ اس کی طرف سے ائمہ احناف کی امہات کتب کو یورپ اور ایشیا کے کتب خانوں سے تلاش کر کے اور ان کی تعلیق وتصحیح کر کے شائع کیا، تقریباً پچاس سال تک یہ ٹھوس خدمات انجام دیں، جس سے حنفیہ کی

امہات کتب دنیا میں پہلی بار منظر عام پر آسکیں۔

راقم کے حضرت مولانا سے نیازمندانہ اور علمی تعلقات تقریباً ۲۵ سال سے زائد برابر قائم رہے، میری علمی زندگی میں ان کی توجہات اور دعاؤں کو بڑا دخل ہے۔ میری تصنیف پاکر نہایت خوش ہوتے اور بزرگانہ شفقت ومحبت کے ساتھ ہمت افزائی کرتے اور دعائیں دیتے۔ مولانا مرحوم نے پوری زندگی علم وعمل میں رہ کر مجرد بسر کی۔ حیدرآباد کی اپنی علمی وعملی سرگرمی کا مرکز بنایا۔ مدرسہ نظامیہ میں مدرسی کی، دائرۃ المعارف کے رکن ومصحح رہے، اور اپنے ادارہ کی سرپرستی کرکے اپنی ذات کو انجمن بنایا، ان کے تلامذہ ومتوسلین کے حلقہ میں قدیم وجدید دونوں قسم کے اہل علم وفضل ہیں، مگر ان سب پر علمیت ومشیخت غالب ہے۔

مولانا مرحوم افغانی تھے اور افغانی روایات کے شدت سے پابند تھے، اس سلسلہ میں زہد وتقویٰ، اخلاص وایثار اور بےنفسی کے ساتھ علمی وتحقیقی سرگرمی نے ان کی ذات کو اہلِ علم اور اربابِ روحانیت دونوں کے لیے بڑی پُرکشش بنا رکھا تھا اور دونوں حلقے کے لوگ ان سے مل کر بڑا انشراح وانبساط محسوس کرتے تھے، اسی سال ۱۶/محرم جمعہ کو مولانا مرحوم کے یہاں حاضری ہوئی تھی، اور تین دن تک قیام رہا، ان دنوں کی محبت وشفقت او رتوجہ کا جو حال رہا، وہ ان کی محبت وشفقت کا تقاضا تھا، ورنہ ہم جیسے چھوٹوں کے ساتھ مولانا مرحوم جیسے بڑے عالم ومرشد کی اس بزرگانہ شفقت کی کوئی وجہ نہیں تھی، مولانا نے اپنے پیچھے اپنا علمی ودینی ورثہ اور اپنے تلامذہ ومتوسلین کی ایک جماعت چھوڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو جگہ دے، سلف صالحین کی ایسی یادگاریں اب نظر نہیں آئیں گی۔

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
ہزار شمع جلاؤ گے روشنی کے لیے

(البلاغ جولائی ۱۹۷۵ء)

مولانا انعام کریم صدیقیؒ

۸/جون ۱۹۷۹ء

۸/جون ۱۹۷۹ء کو مولانا انعام صدیقی رحمۃ اللہ علیہ نے مدینہ منورہ میں دورہ دل پڑنے سے بعد مغرب انتقال کیا اور دوسرے دن صبح کو جنت البقیع میں دفن کیے گئے، مولانا مرحوم کا وطن دیوبند تھا، مدت دراز سے مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ کے منتظم ومنصرم کی حیثیت سے وہیں قیام پذیر تھے، ہندوستان میں آمدورفت بھی رہا کرتی تھی، نہایت نیک وصالح، خوش خلق وضعدار اور شریف النفس انسان تھے، ان میں نفاست ونزاکت فطری تھی۔ ہندوپاک کے اہل علم کے مرجع تھے، ہم لوگوں سے بھی نہایت شگفتہ تعلقات تھے اور جب اور جہاں ملاقات ہوتی تھی، نہایت خلوص ومحبت سے ملتے تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (البلاغ جولائی ۱۹۷۹ء)

مولانا اسعد اللہ مظاہریؒ

۱۱/جون ۱۹۷۹ء

۱۱/جون ۱۹۷۹ء کو مولانا اسعد اللہ صاحب مظاہری رحمۃ اللہ علیہ نے انتقال کیا، مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے قدیم مدرس اور استاذ العلماء تھے، ان کے وصال سے قدیم طرز کی درسگاہوں کے ایک قدیم وتجربہ کار بزرگ سے محرومی ہوئی، جس کی مثال نہیں ملے گی، نہایت قانع ومتواضع اور ذی استعداد عالم ومدرس تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(البلاغ جولائی ۱۹۷۹ء)

مولانا احمد عبداللہ میمنی

ستمبر ۱۹۷۹ء

مولانا احمد عبداللہ صاحب میمنی نے مدینہ منورہ میں بروز چہار شنبہ ۱۹؍ شوال ۱۳۹۹ھ ستمبر ۱۹۷۹ء کو انتقال فرمایا، رحمۃ اللہ علیہ ان کی عمر اسی اور نوے برس کے درمیان رہی ہوگی، گزشتہ پچیس سال سے مستقل طور سے حجاز میں مقیم تھے، جس میں زیادہ مدت مدینہ منورہ میں قیام رہا، بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے، مختصر سا کاروبار تھا، نہایت مخلص متقی اور بے لوث بزرگ تھے، پوری زندگی علماء حق سے متعلق رہے، شہر بمبئی میں علمائے دیوبند کو سب سے پہلے بلانے والے اور ان کو وعظ کرانے والے مولانا احمد عبداللہ صاحب میمنی ہی تھے، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ، مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کو مختلف اوقات میں یہاں بلایا اور ان کا وعظ کرایا، اس زمانہ میں یہاں ان علمائے دین کا نام لینا گویا اپنی موت کو دعوت دینا تھا، آخری دور میں تبلیغی جماعت اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سے تعلق بہت بڑھ گیا تھا، ضیق النفس کے پرانے مریض تھے، چلنا پھرنا مشکل تھا، گزشتہ سال ہی مع اہل وعیال کے ہندوستان آئے تھے اور مختلف علمی اور دینی مقامات پر جا کر اپنے بزرگوں اور دوستوں سے آخری ملاقات کی۔

راقم کے ساتھ بے حد محبت وشفقت فرماتے تھے، قیام بمبئی ہی کے زمانے سے ان سے علمی اور دینی تعلق تھا، جو حجاز شریف لے جانے کے بعد بھی قائم رہا۔ جب بھی مدینہ منورہ حاضری کی سعادت نصیب ہوتی، مولانا مرحوم کے یہاں کم از کم ایک وقت دعوت ضروری تھی، ویسے بھی دکان پر آنا جانا رہتا تھا، میرے دونوں لڑکے خالد کمال اور سلمان مبشر سلمہما اللہ جب تک جامعہ اسلامیہ میں زیرِ تعلیم رہے، مولانا مرحوم ان کے مشفق ومربی رہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت سے نوازے اور اعلیٰ علیین میں ان کو جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ (البلاغ ستمبر ۱۹۷۹ء)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ستمبر ۱۹۷۹ء

گزشتہ ماہ ستمبر ۱۹۷۹ء کے آخر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ۷۶؍سال کی عمر میں امریکہ میں انتقال کیا۔ رحمہ اللہ وغفرلہ وہ موجودہ دور میں ''مفکر اسلام'' کہے جانے کے بجا طور پر مستحق تھے اور کہے گئے۔ پورے عالم اسلام میں ہی نہیں، پوری دنیا میں ان کی تصانیف اور ان کے تراجم نے اسلام کے تعارف میں بڑا کام کیا۔ ان کے بعض آراء وافکار اور تعبیرات سے اختلاف کے باوجود ماننا چاہیے کہ اس دور میں ان کی اسلامی تحریک نے عالم اسلام میں فکری بیداری پیدا کی اور غیروں میں اسلام کا تعارف اچھے انداز میں کرایا۔ وہ جدید علم کلام کے نمایاں علمبرداروں میں تھے۔ ان کی تصانیف کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئے، جس سے ان کی افادیت کا پتہ چلتا ہے، وہ اس بارے میں بھی اپنے معاصر علماء میں ممتاز ہیں۔

وہ ابتدا میں صحافت کے میدان میں آئے اور ان کا جوہر دہلی میں جمعیۃ علماء کے اخبار ''الجمعیۃ'' مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا محمد الیاس صاحب شیخ التبلیغ کی وابستگی کے بعد نمایاں ہوا۔ پھر حیدرآباد جاکر ادارہ عالمگیر تحریک ترجمہ قرآن کے مجلّہ ''ترجمان القرآن'' کو اپنے افکار وآراء کا ترجمان بنایا اور تصانیف کا سلسلہ شروع کیا۔ درحقیقت یہیں سے ان کی اسلامی تحریک کو فروغ ہوا، اس کے بعد باقاعدہ جماعت اسلامی کی تاسیس کی۔ پٹھان کوٹ (مشرقی پنجاب) کو اس کا مرکز بنایا۔ ابتدا میں ہندوستان کے کئی نامی گرامی علماء ان کی تحریک کے ساتھ ہوئے مگر بعد میں تقریباً سب ہی علیٰحدہ ہوگئے۔ تقسیم کے بعد مولانا مودودی پاکستان تشریف لے گئے، آخر عمر میں جماعت کی تمام تر ذمہ داری اپنے رفقاء پر ڈال دی تھی۔ ان کے اسلامی کارناموں کے صلہ میں ان کو شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا، جو عالم اسلام کا سب سے معزز انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کو ان کی خدمات کا بہترین بدلہ دے۔ (البلاغ اکتوبر ۱۹۷۹ء)

مولانا احمد علی لاہوریؒ

یہ خبر ہندوستان بھر کے دینی اور علمی حلقوں میں بڑے رنج وافسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مشہور مفسر قرآن، محدث وفقیہ اور انجمن خدام الدین شیوران والا لاہور کے امیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ رمضان المبارک میں ۲۴رفروری کو وفات پاگئے۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ۔ مولانا ادھر پچھلے کئی سال سے فالج میں مبتلا تھے۔ مگر علمی ودینی معلومات میں حتیٰ المقدور فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ چنانچہ انتقال کے دن بھی جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں آئے مگر دردشکم کی شدت سے بغیر نماز ادا کیے واپس چلے گئے، مغرب کی نماز کے بعد قدرے سکون ہوا، مگر حالت پھر بگڑی تو سنبھل نہ سکی، اور ساڑھے نو بجے شب میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا پنجاب میں حق وصداقت کی صاف ستھری آواز تھے۔ اور حق بات کہنے میں کسی قسم کی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ قرآن حکیم کی تفسیر اور تفسیری نوٹ میں مشہور تھے۔ ایک زمانہ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے فارغ التحصیل طلبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور شعبان سے لے کر شوال تک کی درمیانی مدت میں ان کو مولانا قرآن کی تفسیر اور اس کے متعلق ضروری نوٹ لکھا دیا کرتے تھے، جس کی شکل ایک مستقل کورس کی تھی۔ تقسیم سے پہلے قیام لاہور کے دوران میں راقم اکثر جمعہ کی نماز مولانا مرحوم کی مسجد میں پڑھتا تھا، اوران سے ملاقات کیا کرتا تھا، ان کی تقریر اور گفتگو میں بالکل سلف صالحین کی سی بات ہوتی تھی۔ (انقلاب ممبئی)

حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوریؒ

۷؍فروری ۱۹۸۰ء

کم وبیش پچاس سال تک ریاض رسول ﷺ میں چہکنے والا بلبل، واعظ شیریں بیاں، عالم خوش خلق وخوش زباں، پورے ملک میں اپنی جادو بیانی سے وعظ وتذکیر میں بے پناہ مقبولیت پانے والا بے مثال واعظ ومقرر حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوریؒ پنجشنبہ ۲۰؍ربیع الاول ۱۴۰۰ھ مطابق ۷؍فروری ۱۹۸۰ء کو اپنے وطن میں انتقال فرماگئے۔ رحمة الله علیه و رضوانه.

مولانا مرحوم پچھلے دوسال سے فالج کے مرض میں مبتلا تھے، اور جلسوں میں شرکت اور تقریر سے معذور تھے۔ پھر بھی ان کے بعض قدردان برکت کے طور پر ان کو مدعو کیا کرتے تھے۔ مولانا مرحوم سے راقم کی آخری ملاقات جامعہ حسینیہ نیا بھوج پور (بہار) میں گذشتہ سال ماہ مئی میں ہوئی تھی، ایک زمانہ میں کوئی دینی جلسہ مولانا ابوالوفا صاحب کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا اور ان کی شرکت جلسہ کی کامیابی کا باعث ہوتی تھی۔ مولانا اپنے اوصاف وکمالات میں ایک خاص مقام رکھتے تھے، استغناء، بے نیازی، سیر چشمی، بے تکلفی اور خوش خلقی میں بہت آگے تھے۔ عام طور سے واعظ مستند علم سے خالی ہوتے ہیں۔ مگر مولانا زبردست عالم، بہترین مدرس اور ٹھوس استعداد کے عالم تھے۔ دارالعلوم (دیوبند) دارالمبلغین لکھنؤ اور شاہ جہاں پور وغیرہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دے چکے تھے، کتب بینی اور مطالعہ ہمیشہ جاری رکھتے تھے، علمی اور تحقیقی گفتگو میں حصہ لیتے تھے، شعروادب سے دلچسپی رکھتے تھے، خود بھی شاعر تھے۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے، جمعیۃ العلماء میں رہ کر ملک کی آزادی میں پیش پیش رہے۔ راقم پر زمانۂ طالب علمی ہی سے بے شفقت فرماتے تھے۔ اتنا شفیق بزرگ میں نے کم ہی پایا تھا۔ یہ وضع داری آخری تک باقی رہی۔ ہمارے بہت سے علماء کی طرح مولانا مرحوم نے بھی آخری عمر میں بڑی عسرت اور تنگ دستی کی زندگی بسر کی، اور مسلمانوں نے ان کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو اپنے بہت سے خیر خواہوں کے ساتھ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کرم سے مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو جگہ دے۔ (انقلاب ممبئی ۸؍فروری ۱۹۸۰ء)

احمد عبدالرزاق محبوب صدیقی

۴؍دسمبر ۱۹۸۶ء

۱۹۵۰ء میں بمبئی آنے کے چند ماہ بعد صابوصدیق مسافرخانہ کے پاس مکہ مکرمہ کے ایک نوجوان لڑکے احمد عبدالرزاق محبوب صدیقی سے ملاقات ہوئی، جو ہندوستان پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا وغیرہ کے مشہور معلم شیخ عبدالرزاق محبوب صدیقی کے صاحب زادے تھے، وہ اکثر بمبئی آتے رہے، اور باہمی خلوص للہ فی اللہ بڑھتا رہا، جب بھی حج وزیارت کی دولت نصیب ہوتی اسی خلوص ومحبت اور بے تکلفی سے ملتے رہے، بالکل بھائی چارہ سا تعلق قائم ہوگیا تھا، درحقیقت وہی ہمارے مخلص دوست الحاج مختار احمد جاوید بھٹکلی کے مکہ مکرمہ جانے کا سبب بنے، جہاں موصوف ۲۶، ۲۷ سال سے بسلسلہ ملازمت مقیم ہیں، اور اب یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ ۴؍دسمبر کو برادرِ عزیز احمد عبدالرزاق محبوب صدیقی اللہ کو پیارے ہوگئے، دل کا دورہ پڑا، اسپتال گئے، تو آرام ہوا، مگر پھر طبیعت بگڑی، اور جاں بر نہ ہوسکے، حرم محترم میں نماز جنازہ ادا کی گئی، اور جنت المعلیٰ میں دفن کیے گئے، جہاں ہزاروں صحابہ، اولیاء، اہل اللہ، علمائے دین آسودہ خواب ہیں۔

حجاج کی خدمت میں ہمہ وقت رہا کرتے تھے، اور بحیثیت خادم حجاج کے ان کی ہر خدمت میں لگے رہتے تھے، میں، مختار احمد اور ان کے بمبئی کے دوست واحباب ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں، اور ان کے پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں۔

(انقلاب بمبئی ۱۹ دسمبر ۱۹۸۶)

مولانا ابوالعرفان ندوی جونپوریؒ

۱۸/نومبر کو علامہ شبلی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے یوم وفات کے سلسلہ میں ایک تقریب دارالمصنفین اعظم گڈھ میں تھی۔ اس میں یہ خبر وحشت اثر ملی کہ مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی ۶/ربیع الثانی مطابق ۷/انومبر کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں قلبی دورہ میں انتقال کر گئے، اور جونپور میں تدفین ہوئی۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ

مولانا مرحوم سے تیس سال زائد عرصہ سے راقم کے انتہائی بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ اور جانبین میں ہر ایک دوسرے کا بے تکلفانہ احترام کرتا تھا، دل پر بے حد اثر ہوا اور ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کی، مرحوم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اونچے اساتذہ اور وہاں کی علمی سرگرمیوں کے نگراں اور مجلّہ معارف اعظم گڈھ کے حلقۂ ادارت سے وابستہ تھے۔ منقولات ومعقولات اور عربی ادب کے جامع اور بے تکلفی، سادگی وضعداری کے ساتھ شگفتہ دل اور باغ بہار عالم تھے تعلیم وخطابت میں ان کا انداز بڑا دلنشیں ہوتا تھا جس مجلس میں ہوتے میرِ مجلس بن کر چھائے رہتے تھے۔ زندہ دلی کے ساتھ رکھ رکھاؤ کا بہترین نمونہ تھے۔ مولانا محمد اسحاق صاحب بنارسی مرحوم کے انتہائی بے تکلف دوست تھے۔ جب بمبئی آتے تو ان کے یہاں ہماری مجلسیں جمتی تھیں۔ اور دونوں دوستوں میں مخلصانہ بے تکلفی قابل دید وشنید ہوتی تھی۔ وہ شیراز ہند جون پور کے ایک موضع لپری کے ایک علمی ودینی خاندان کے فرد اور خاندانی روایات کے حامل تھے۔ ان کے مقالات ومضامین اور کتابوں کے علاوہ ہزاروں تلامذہ ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی علمی ودینی خدمات کا بہترین اجر دے، اور ان کے بھائی برادر عزیز مولانا حسان احمد ندوی اور صاحبزادے عرفان احمد سلمہ اور دیگر متعلقین ومتعلقات کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(انقلاب ممبئی)

ادیبؔ سہارنپوریؒ

افسوس کہ گذشتہ دنوں غیر منقسم ہندوستان کے مشہور شاعر و ادیب حضرت ادیب سہارنپوری نے کراچی میں انتقال کیا۔ وہ ۱۹۱۴ء میں اندور میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان دہرہ دون سے تعلق رکھتا تھا، مگر بعد میں سہارنپور مین آباد ہوگیا۔ مرحوم اردو کے معیاری شاعروں میں تھے، اور خوب کہتے تھے قد میانہ لمبائی لیے ہوئے بدن دبلا پتلا اور رنگ سانولا تھا، قیام لاہور کے زمانہ میں ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء مرحوم سے اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی، اس زمانہ میں وہ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اور اخباروں اور رسالوں میں خوب چھپتے تھے، ان کا خاص موضوع غزل تھا، ویسے ہر صنف میں اچھا کہہ لیا کرتے تھے، معلوم نہیں مرحوم کے کلام کی اشاعت کا کیا انتظام ہو رہا ہے، ضرورت ہے کہ اردو زبان کے اس معیاری شاعر کے کلام کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کیا جائے۔

(انقلاب ممبئی)

شاعرانقلاب انور صابری

افسوس کہ اگست میں شاعرِ انقلاب علامہ انور صابری نے انتقال کیا، ایک زمانہ سے مرحوم گمنامی کی زندگی گذار رہے تھے، اور دورافتادگی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں نہیں رہے، اور اب وہ واقعی اس دنیائے فانی میں نہیں رہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور بشری لغزشوں کو اپنے دامن عفو ورحمت میں چھپائے (آمین)

تقسیم ملک سے پہلے علامہ انور صابری کلکتہ سے سرحد تک کے شاعر انقلاب تھے، سیاسی اور مذہبی جلسوں میں ان کی شرکت اور شاعری سے جان پڑ جاتی تھی، اور زود گوئی میں تو شاید ان کا کوئی حریف وہمسر نہیں تھا، بلا مبالغہ وہ قلم برداشتہ اشعار کہا کرتے تھے، اور وہ بھی چالو اور بھرتی کے اشعار نہیں، بلکہ شعر وادب کے معیار پر پورے اترنے والے ہوتے تھے، ایک زمانہ میں ہمارے ان سے بڑے گہرے تعلقات تھے، وہ مبارک پور آکر ہفتوں ہفتوں ٹھہرا کرتے تھے، میں نے بمبئی میں ''تذکرہ علمائے مبارک پور'' کا مسودہ انھیں دکھا کر کہا کہ آپ اس پر کچھ اشعار کہہ دیں، تو فوراً بولے مولانا! یہ تو گھر کی کھیتی ہے، اور قلم کاغذ لیا، اور بلا تکلف پانچ منٹ سے کم وقت میں چند اشعار لکھ کر دیدیئے، جو کتاب کے شروع میں درج ہیں۔

مرحوم اپنے ہم عصر شعراء میں شاید سب سے آخر میں دنیا سے رخصت ہوئے، اور اب ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا، میرے ابتدائی دور کے ایک شعری مجموعہ پر مرحوم نے نظر ثانی کی تھی، جو اب تک میرے پاس مسودہ کی شکل میں موجود ہے۔(۱)

ع خدا بخشے عجب آزاد مرد تھا (انقلاب بمبئی)

(نوٹ) ۱؎ وہ شعری مجموعہ اذان کعبہ کے نام سے ہے اور علامہ انور صابری کا مقدمہ بھی ہے جو (مئے طہور) دیوان قاضی اطہر کے ساتھ ۲۰۰۶ء میں قاضی اطہر اکیڈمی مبارکپور ضلع اعظم گڑھ یوپی، انڈیا سے شائع ہوا ہے: مرتب

سید ابو محمد زیدی

وطن میں سید ابو محمد زیدی صاحب کی وفات کی خبر پڑھی، اور دل کو سخت دھکا لگا، مرحوم عالی ظرفی، وضع داری، طبعی شرافت اور تہذیب وتمدن مین یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین انسان تھے، اخلاق و عادات اور خدمت خلق میں مثالی شخصیت کے مالک تھے، واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف بمبئی میں بلکہ ہندوستان میں اپنے طرز کے بے مثال آدمی تھے۔

راقم سے بے حد محبت وتعلق کا اظہار فرماتے تھے، ان سے میری ملاقات بمبئی میں آنے کے چند ہی مہینوں کے بعد ہوئی تو اس میں اس قدر وسعت ہوئی کہ گویا ان سے عزیزانہ تعلق ہو گیا، اہم معاملات ومسائل میں رائے ومشورہ لیا کرتے تھے، وہ واقعی اتحاد بین المسلمین کے دل سے خواہاں تھے، اور انھوں نے اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں، ایک بار اس سلسلہ میں میرے ہم وطنوں نے ان کے خلاف زہر افشانی کی تو ان کے خلاف مرحوم نے میرے درمیاں پڑنے سے بڑی حد تک درگذر سے کام لیا، جب بھی ملے باغ وبہار ہی نظر آئے، کیا مجال ہے کہ پہلے سلام کرنے کا موقع دیں، میں بھی ان کو اپنے بزرگ کی حیثیت سے جانتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اپنے دامن عفو میں ان کو جگہ دے کر ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کو توفیق دے۔

(انقلاب بمبئی)

مولانا اسلم جیراج پوری

ہندو پاکستان کی علمی اور تحقیقی بزم کی ایک اور شمع گذشتہ ہفتہ گل ہوگئی، اور مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری مرحوم نے جامعہ ملیہ دہلی میں انتقال کیا، اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

مولانا اسلم صاحب ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں جے راج پور کے رہنے والے تھے، جو شبلی مرحوم کے گاؤں بندول سے متصل ہے، اور عام طور سے دونوں بستیوں کو ایک ساتھ ملا کر ''بندول جیراج پور'' بولا جاتا ہے، آپ کے والد مولانا سلامت اللہ صاحب جیراج پوری زبردست اہل حدیث عالم تھے، ان کی زندگی بھوپال میں ''رئیس المذکرین'' کے عہدہ پر بسر ہوئی۔ مولانا اسلم نے بھی ابتدائی تعلیم بھوپال میں حاصل کی، بعد میں علی گڈھ یونیورسٹی میں مدرس ہوئے، جب علی گڈھ میں تحریک چلی تو آپ نے بھی علی گڈھ سے نکل کر دہلی میں جامعہ ملیہ کو اپنا بسیرا بنایا، اور آخر زندگی تک اس سے وابستہ رہے، حتیٰ کہ یہیں دفن ہوئے، آپ ادب اور تاریخ سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، حیات حافظ، تاریخ القرآن، اور تاریخ الامت آپ کی مشہور کتابیں ہیں، مولانا خاندانی طور سے ابتدا میں اہل حدیث مسلک کے عامل تھے، بعد میں احادیث سے بھی آگے بڑھے، اور ان کی قطعیت اور حجیت کے لیے روایت اور درایت کی بحث میں پڑ گئے، جس کی وجہ سے وہ عام علماء سے اور عام علماء ان سے بے تعلق ہو گئے، ویسے مولانا بے حد خلیق، بہت ہی وضع دار اور نہایت سادہ قسم کے دیندار آدمی تھے۔

مولانا نے اپنے علم و تحقیق کی وجہ سے کئی مباحث میں اپنے معاصرین سے اختلاف رائے بھی کیا ہے۔

افسوس کہ مولانا اسلم جیراج پوری کی موت سے ہندوستان و پاکستان میں ایک اچھے عالم و محقق کی کمی ہوگئی، اور اعظم گڈھ اپنے ایک اچھے فرزند سے محروم ہو گیا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اور متعلقین کو صبر جمیل دے۔ (انقلاب بمبئی)

امان اللہ خاں شاہ افغانستان

۲۵/اپریل

خبر ہے کہ افغانستان کے سابق حکمراں شاہ امان اللہ سوئزرلینڈ کے پرائیویٹ اسپتال میں ۲۵/اپریل کو انتقال کر گئے، انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۸/سال کی تھی، مرحوم شاہ امان اللہ خاں اپنے والد امیر حبیب اللہ کے بعد ۱۹۱۹ء میں افغانستان کے بادشاہ ہوئے، مرحوم نے اپنے دور میں یورپ کی سیاحت کی، اور افغانستان میں مغربی طرز زندگی کو رائج کرنے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے عوام میں نہ رہ سکے، اور تخت وتاج سے دست بردار ہوکر باقی زندگی یورپ میں بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔

امیر امان اللہ خان اس میں شک نہیں کہ افغان قوم کی ترقی چاہتے تھے مگر اس کے لئے انھوں نے وقت شناسی سے کام نہیں لیا اور عوام کے مزاج کے خلاف ان پر جبریہ قوانین نافذ کرنے کی جرأت کی، جوان کے حق میں مضر ثابت ہوئی، انھوں نے اس وقت اپنے جذبۂ ترقی سے کام لے کر بہت سے ایسے کام کیے جوان کو نہیں کرنا چاہئے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ امیر امان اللہ خاں اپنے زمانہ میں جو کام نہ کر سکے، اور ان کو ان کی وجہ سے تخت وتاج سے محروم ہونا پڑا، اس سے کئی گنا بڑا کام اسی سال افغانستان میں افغان قوم نے کر دکھایا۔ گذشتہ دنوں روس نے افغانستان کی مدد کے پردے میں جو کام کیا ہے وہ افغان کے سامنے ہے۔

(انقلاب ۴/مئی بمبئی)

پروفیسر بدرالدین علوی

۱۶؍مئی ۱۹۶۵ء

ہندوستان کے قدیم وجدید اسلامی وعلمی حلقوں میں یہ خبر نہایت غم واندوہ کے ساتھ سنی گئی کہ جناب مولانا محمد بدرالدین علوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۶؍مئی ۱۹۶۵ء صبح ساڑھے سات بجے علی گڈھ میں انتقال فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

آپ قصبہ نیگو ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبہ عربی کے پروفیسر تھے، اور پوری زندگی اس مقدس زبان کی خدمت کے لیے مسلم یونیورسٹی میں صرف کی، یہاں تک کہ وہاں سے ریٹائیر ہونے کے بعد بھی عربیت اور دین کا صحیح ذوق رکھنے والے طلبہ کو گھر پر درس دیا کرتے تھے، اوران کے علمی وتحقیقی کاموں کی رہنمائی فرماتے تھے، مولانا بدرالدین علوی عباسی نوری عربی، فارسی اور اردو کے جید عالم تھے۔ اور قدیم دینی وعربی تعلیم کے ماہر تھے۔ اسلامیات میں تبحر تھا۔ استاذ العلماء مولانا لطف اللہ علی گڈھی کے آخری دور کے شاگرد عزیز اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے ہم درس تھے۔

ان کے علمی وادبی کارناموں میں ''المختار من شعر البشار'' اوراس کی شرح کی تصحیح وتحشیہ اور اشاعت بڑی چیز ہے۔ مولانا نے اسے ۱۹۳۴ء میں بڑی آب وتاب سے مصر میں چھپوا کر شائع کرایا تھا، معلوم ہوا ہے کہ مرحوم نے ''ابن درید'' اور'' بشار بن برد'' کے دوادین بھی ترتیب دیئے تھے، نیز مولانا علوی نے بہت سے علمی وتحقیقی مقالات ومضامین معارف، الندوہ، برہان وغیرہ علمی مجلوں میں لکھے، ان کے سیکڑوں شاگرد ہند وپاکستان میں پھیلے ہوئے علمی وادبی اور دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، اگران کے یہ مقالات ومضامین مرتب کر کے شائع کئے جائیں تو یہ ان کی بہترین علمی یادگار کے ساتھ علمی سرمایہ بھی ہوگا۔

مرحوم کی نسلی اور مادی یادگاروں میں دولڑکے اور دولڑکیاں ہیں ، بڑے صاحبزادے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب علوی مسلم یونیورسٹی میں ایجوکیشن ڈیپارٹمینٹ میں پروفیسر ہیں، نیز مولانا کے بھانجے جناب سلطان احمد صاحب صدیقی ایم،اے، ایل، ایل بی، علیگ اُجیّن میں علمی وسماجی خدمات انجام دے رہے ہیں موصوف نے مولانا مرحوم کے بارے میں کئی مفید معلومات دی ہیں۔

مولانا علوی نے اپنے استاد کی طرح پورے اخلاص وانشراح کے ساتھ ساری زندگی علمی ودینی خدمات میں گذاری، اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کو اپنی سرگرمیوں کا محور بنایا۔ دینی علوم و فنون اور عربیت سے جو بے توجہی عام ہے اسے دیکھتے ہوئے مشکل معلوم ہوتا ہے کہ عربیت کا ایسا جید عالم اس ملک میں پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے اور ہمیں ان کا نعم البدل دے۔ آمین.

(انقلاب ممبئی ۲۰ رجون ۱۹۶۵ء)

مولانا بدر جلالی مرادآبادی

اردو صحافت کی بزم دوشیں کی ایک اور شمع بجھ گئی، جس سے اس بزم کی رہی سہی رونق میں مزید پھیکا پن آ گیا، مولانا قاضی بدر جلالی مرادآبادی سالوں کی کش مکش کے بعد ان تمام الجھنوں سے نجات پا گئے، جو انسان کو چلتے چلاتے پیش آتی ہے، خاص طور سے ان آخری الجھنوں سے جو ایثار پسندوں اور مخلصوں کے نصیب میں رہا کی ہیں، مولانا بدر جلالی نے اپنی پوری زندگی صحافت اور سیاست میں گذاری، اپنے نوک قلم سے ملکی مسائل کی بڑی بڑی گھتیاں سلجھائیں اور قوت فکر وعمل سے سیاسی معاملات میں حصہ لیا، مگر چوں کہ ان کو ان میں اخلاص وایثار کی قدریں بہت زیادہ تھیں، اس لیے وہ بیچارے ان حالات سے دوچار ہوئے، جو ہندی مسلمانوں میں ایسی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔

کچھ دنوں ہوئے ان ہی کالموں میں مرحوم کی علالت کی خبر کے ساتھ ان کی امداد کی اپیل چھپی تھی، مولانا بدر جلالی آخری وقت میں جس عسرت اور تنگدستی سے زندگی بسر کی اور بیماری کو جس طرح اس شہر اس شہر لے کر گئے، اس کی گواہی بمبئی، بھوپال اور مرادآباد سے مل سکتی ہے۔

مرحوم آخر تک اردو زبان کے صحافی رہے، اور جب تک ہو سکا، اپنے قلم سے ملک کی خدمت کرتے رہے، مگر ناقدروں کی بے اعتنائی نے ان کو بری طرح نظر انداز کر دیا، جب ہم اردو صحافتوں کے انجام کی مثالیں دیکھتے ہیں، تو یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اردو کے صحافیوں اور اخبار نویسوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں دوسری زبانوں کے ادیبوں اور صحافیوں کی حالت آخر تک ان سے بدرجہا بہتر رہتی ہے، وہ اپنی علمی اور ادبی خدمت سے عملی سبکدوشی حاصل کرتے ہیں تو ان کے سامنے ان کے علمی وقلمی کارناموں کا ایک انبار ہوتا ہے جو ان کے حق میں مستقل جائداد بن جاتا ہے، اور مرنے کے بعد وارثوں میں منتقل ہوتا ہے، مگر اردو کے اخبار نویسوں مصنفوں اور ادیبوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کی قیمت نہ پہلے ملتی ہے، اور نہ بعد میں ان واقعات وحقائق کی روشنی میں اردو کے صحافیوں اور ادیبوں کو اپنے مستقبل کے بارے بہت کچھ سوچنا چاہئے۔ (انقلاب بمبئی)

مولانا بدیع الزماں سعید نورسی ترکی

ترکی کے مشہور دینی رہنما، سیاسی مدبر اور لادینی حکومت کے حریف مولانا بدیع الزمان سعید نورسی کا وصال ۲۲/ مارچ کو صبح چار بجے قریب اورنہ شہر میں ہوا، اور جمعہ کے دن موجودہ ترکی کا سو سالہ مجاہد تقریباً دو لاکھ قدر دانوں کے ہاتھوں دفن کر دیا گیا، جس میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر، سابقہ فوجی افسر، طلباء اور عوام وخواص سبھی شامل تھے، آپ نسلاً عرب تھے، آپ کے آباء واجداد قدیم زمانہ سے ترکی میں آباد ہو گئے تھے، آپ ترکی کے زعیم رہنما اور بزرگ تھے۔ آپ نے ملک کے انقلاب میں مصطفیٰ کمال پاشا کے دوش بدوش رہ کر کام کیا، کئی جنگوں میں کمانڈر رہے، اور اپنے وطن کے دفاع میں قید و بند سے دو چار ہوئے، مگر جب کمال پاشا کے فتوحات کا دور شروع ہوا، اور دینی فتوحات کے نام پر لادینیت کو مسلط کیا جانے لگا، تو آپ نے اپنا مقام وموقف بدل دیا، اور اتاترک کے خلاف ہو گئے، اس کی سزا میں آپ کو پھر قید و بند اور جلا وطنی سے دو چار ہونا پڑا، اور آخر تک اسی حالت میں رہے، آپ ترکی کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی واقف تھے۔

مخالفت کے زمانہ میں اتاترک نے آپ کو رام کرنے کے لیے ''شیخ الاسلام'' کا عہدہ دے کر مشرقی صوبجات میں رکھنا چاہا، مگر اس مرد مجاہد نے اس چال کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اسلام میں دین اور سیاست جدا جدا نہیں ہیں، اور میں ایک پادری بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتا بلکہ مجاہد بن کر زندگی گذارنا چاہتا ہوں، آپ نے ترکی کی لادینی سیاست کے خلاف قلمی جہاد کیا، اور اس سلسلہ میں ۱۳۰/ کتابیں لکھیں۔ آپ

نے مصطفیٰ کمال پاشا سے اختلاف کرنے کے بعد اپنے لیے جو موقف منتخب کیا، اس پر آخری دن تک جمے رہے، آپ کی عزیمت کی برکت یا استقلال کا نتیجہ نہایت خوشگوار صورت میں ظاہر ہوا کہ ترکی کا نظام حکومت مذہبی معاملات میں بدلا اور لامذہبیت کا پاؤ صدی تک تجربہ کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء سے اسلام کو ترکی نے اپنایا، آپ کی وفات سے کچھ دنوں پہلے تو اس سلسلہ میں عجیب وغریب انقلاب ہوئے، اور لادینی سیاست کے ہوش ٹھکانے لگنے لگے، اس طرح آپ کی ذات ترکی میں اسلام کی دوبارہ تشریف آوری کا ظاہری بڑا سبب بنی، اللہ تعالیٰ اس مجاہد کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے، اور اس کے کارناموں کو زندۂ جاوید فرما کر اسے بھی زندہ جاوید رکھے۔

(انقلاب ۱۳/اپریل بمبئی)

ڈاکٹر تاثیر صاحب

ڈاکٹر تاثیر صاحب کی ہمہ گیر شخصیت آسانی سے فراموش نہیں کی جاسکتی، وہ نہ صرف ادیب اور شاعر تھے، بلکہ شاید ہی زندگی کا کوئی شعبہ ہو، جس میں ان کے اثرات محسوس نہ کیے گئے ہوں۔

ڈاکٹر تاثیر کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ براعظم ہندو پاکستان کے چند چوٹی کے اہل اعلم میں تھے، اور پنجاب میں تو گزشتہ پچیس سال سے ادب وشعر کی تمام محفلوں میں چھائے ہوئے تھے۔

مرحوم اردو کے بے مثل ادیب تھے، اور نظم ونثر دونوں میں یدطولیٰ رکھتے تھے، ان کا پایہ بہت بلند تھا، انگریزی زبان میں تو وہ کیمبرج کے ڈاکٹر تھے، ان کا خاص اسلوب نگارش تھا، اردو اور انگریزی کے علاوہ فارسی زبان میں بھی انھیں بہت اچھی دسترس تھی، اور فارسی اساتذہ کے کلام پر کافی عبور رکھتے تھے، عربی بھی پڑھی تھی، اور اسلامی علوم کا خاص ذوق تھا، ان علمی وادبی اوصاف کے علاوہ آرٹ کو سمجھتے تھے، اور اس کے صحیح قدردان تھے، عبدالرحمٰن چغتائی کے آرٹ کے تو وہ شارح تھے۔

ڈاکٹر تاثیر کے انتقال کو تقریباً دو ہفتے ہوگئے، لیکن ہندوستان یا پاکستان کے کسی اخبار نے ابھی تک کوئی تجویز ایسی پیش نہیں کی، جو صحیح معنوں میں ان کی یادگا سمجھی جاتی، ہماری تجویز یہ ہے کہ ڈاکٹر تاثیر کا کلام جو مختلف اور بکھرے ہوئے اوراق کی زیب وزینت بنا ہوا ہے، ایک ''یادگار کتاب'' کی صورت میں پیش کیا جائے۔

روزنامہ (جمہوریت بمبئی ۲۱ دسمبر ۱۹۵۰ء)

تیمور بن فیصل سابق سلطان مسقط

۱۷/اپریل ۱۹۶۵ء

۱۴/ذوالحجہ قریب ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۷/اپریل ۱۹۶۵ء کو سابق سلطان مسقط السید تیمور بن فیصل بمبئی میں انتقال کر گئے۔ مرحوم موجودہ سلطان مسقط سعید کے والد تھے اور تقریباً تیس سال سے بمبئی اور ہندوستان کے دیگر شہروں میں مقیم تھے۔ مشرقی ممالک جاپان، ملایا وغیرہ کا سفر کیا تھا۔ بڑی سمجھ بوجھ کے بیدار مغز حکمراں تھے۔ اخلاق و شرافت کے مالک تھے۔ اور علمی و دینی معلومات رکھتے تھے۔ اخلاقی اعتبار سے بہت بلند تھے، انگریزوں کی چال کی وجہ سے مدت سے بمبئی میں مقیم تھے، ان کا لڑکا سعید مسقط و عمان کا حاکم ہے، معمولی سی رقم وظیفہ کے طور پر ملتی تھی، اس سے گزر اوقات کرتے تھے، ایک ملاقات کے دوران اردو میں بات چیت کی اور یہ کہ فلاں صاحب مجھے اچھی طرح اردو زبان نہیں سکھاتے، بمبئی کے عربوں میں استاد احمد فرید سے بہت زیادہ ربط وضبط رکھتے تھے، اور ان سے بہت مانوس تھے، افسوس کہ ان کے ناظم امور کے انتظام میں ان کے وفات کی خبر بھی ان کے عرب اور غیر عرب دوستوں تک کو نہ ہو سکی، چند آدمیوں نے مل کر دفن کر دیا، اور وہ سلطان ہونے کے بعد دنیا سے یوں گئے کہ فقیر بھی شاید اتنی خاموشی اور بے نیازی سے نہیں جاتا۔ بیٹا مسقط کا سلطان ہے، خاندان مسقط میں ہے اور بڑھاپے میں موت دیار غیر میں یوں آئی کہ اپنے تو اپنے غیر بھی جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

یہ ہے حکومت و سیاست کا کھیل، جو دنیا میں کھیلا جاتا ہے، آج معمولی لوگوں کی لاشیں ہوائی جہاز سے ان کے وطن میں پہونچائی جاتی ہیں اور اس کا سوگ ان کے ملک وقوم میں منایا جاتا ہے مگر سلطان تیمور بیچارے کا حال یہ ہوا کہ غربت کے دوست احباب بھی مٹھی بھر مٹی نہ دے سکے، جو اسلامی وانسانی تقاضا ہے، عمان انگریزوں کی زیر حمایت ایک مستقل حکومت ہے، جو عرب کے مشرقی کنارے پر واقع ہے، یہ تقریباً ۲۱۲۰۰۰ کیلومیٹر میں ہے اور آبادی

تقریبا ۵۵۰۰۰۰ ہے۔ اس کا دارالسطنت مسقط ہے، یہاں کے مشہور شہر رباط، صور، اور صحار ہیں۔ سلطان تیمور تقریباً تیس سال سے دیارِ غیر میں بڑھاپے کے دن کاٹ رہے تھے اور بیٹا سلطان سعید انگریزوں کی شہ پر عمان میں ناپسند حلقوں پر بمباری کرر ہاہے اور اپنے حریف غالب بن علی اور اس کے ہمراہیوں کے جان و مال سے کھیل رہاہے اور عوام کا یہ حال ہے کہ ننگے بھوکے زندگی بسر کرر ہے ہیں، اگر مسقط وعمان میں بھی پٹرول نکلا ہوتا اور سلطان تیمور حاکم ہوتے تو آج ان کی بھی وہی حیثیت ہوتی جو کویت اور قطر جیسی حکومتوں کے حکمرانوں کی ہے۔ دنیا کیا ہے؟ اور یہاں کی سلطانی وفقیری کیا ہے؟ اس کا تماشا سید تیمور سابق سلطان مسقط وعمان کے دیارِ غیر میں اس کسمپرسی کے عالم میں دنیا سے جانے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

(البلاغ مئی ۱۹۶۵ء)

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ

۱۵/ مارچ ۱۹۴۸ء

۱۵/ مارچ ۱۹۴۸ء کو وطن سے دور گوجرنوالہ میں فالج کے اثر سے مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے انتقال فرمایا۔

مولانا مرحوم ہمارے اسلامی ہند کے قدیم لوگوں میں تھے، جمعیۃ العلماء کی بناء میں خشت اول کے معمار آپ بھی تھے، مذاہب باطلہ، قادیانیت، آریت، عیسائیت اور شرک و بدعت کے لیے شمشیر براں تھے، بڑے بڑے معرکے سر کیے، اور بہتوں کو پچھاڑا، علمی اور مذہبی کارناموں میں وہ بڑے حصے کے مالک ہیں، مرحوم اپنے ساتھ اسلامی ہند کی ایک مجموعی تاریخ لیتے گئے، اور جسے اب صفحات میں زندہ جاوید کی حیثیت حاصل ہوگی۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں قیام امرتسر کے زمانہ میں ملاقات ہوئی تھی، مرض ضعیفی گھیرے ہوئے تھے، شکم کی شکایت کے ساتھ ضعف بصارت کا مرض شدت پر تھا، سلام ومصافحہ کے بعد پوچھا کہاں مکان ہے، میں نے عرض کیا: مبارک پور اعظم گڈھ، فرمایا: آپ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (صاحب تحفہ) کے خاندان سے ہیں، عرض کیا نہیں، البتہ تعلقات خصوصی تھے، دور دراز سے آئے ہوئے استفتے سامنے پڑھے جاتے، سن کر زبانی جواب لکھاتے، ایک استفتاء جو اردو میں تھا اور شکستہ کی وجہ سے پنجابی طلبہ پڑھ نہیں سکتے تھے، احقر سے پڑھوایا، اور جواب بھی لکھوایا، چلتے وقت فرمایا کہ کبھی کبھی ملتے رہا کرو، اس وقت مرحوم اپنی تمام اسلامی، دینی اور علمی کارناموں کی زندہ تاریخ تھے، علمی جلالت شان باوجود ضعف ونقاہت کے ظاہر ہو رہی تھی۔

افسوس کہ مرحوم نے ضعیفی میں ہجرت کی مصیبتوں اور جوان لڑکے کا جانکاہ صدمہ سہتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء

ہفتہ وار انصار بہرائچ ۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ مطابق یکم اپریل ۱۹۴۸ء)

پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند

۲۷؍مئی ۱۹۶۴ء

ابھی حال ہی میں کانگریس کا اجلاس ہوا تھا اور اس موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو سے سوال کیا گیا تھا کہ اب پھر آپ بمبئی کب تشریف لائیں گے، تو انھوں نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ جب خدا لائے گا تو آؤں گا۔ یہ جملہ ان کی زبان سے انکی تقدیر نے نکلوایا تھا اور اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخر میں اپنے بارے میں کہہ گئے کہ عزیزو! بس اللہ ہی اللہ ہے چنانچہ خدا ان کو پھر بمبئی نہیں لایا۔ اور وہ دنیا سے چلے گئے۔ ۲۷؍مئی کا دن ان کی موت کے لیے مقرر تھا اور عین وقت پر آ کر رہی۔ وہ مرنے سے پہلے ہشاش بشاش نظر آتے تھے اور اپنی زندگی کے پہلے دن کی طرح آخری دن بھی باہمت، بلند حوصلہ اور خوش وخرم رہے، پنڈت نہرو نے جو محبوبیت اور مقبولیت پوری دنیا میں پائی تھی وہ ان کا حصہ تھی۔ اس دور میں شاید ہی کوئی ایسا انسان حکومت وسیاست کی دنیا میں اس قدر مقبول ومحبوب بنا ہو جس قدر کہ پنڈت نہرو بنے تھے، وہ اپنے فکر ونظر کے اعتبار سے، کردار وعمل کے اعتبار سے اور سیاست وحکومت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے دنیا کے مقبول ترین انسان تھے۔ اس لیے ان کی موت سے صرف ہندوستان کا نقصان نہیں ہوا بلکہ ساری دنیا خسارے میں پڑ گئی، پنڈت نہرو میں طالب علمی اور صاحبزادگی کے زمانہ سے پوری دنیا کے لیے بشمولیت ہندوستان جو تڑپ پیدا ہوئی وہ آخر وقت تک باقی رہی۔ اور اسی تڑپ نے ان کو عالمی انسان بنا دیا تھا۔ اتنی عالمگیر مقبولیت لیے ہوئے شاید ہی کوئی شخص دنیا سے گیا ہو، پنڈت نہرو امن

وانسانیت کے علمبر دار تھے، اور انھوں نے اسی مقصد کے لیے شروع سے اپنے آپ کو تیار کیا۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں مقبولیت دی۔ اور ہندوستان کا نام روشن ہوا، جمہوریت کی تاریخ میں پنڈت نہرو کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب وزیر اعظم ہو جس نے اتنی مدت تک اپنے عہدے کو بلا فصل کے گذارا ہو۔ یہ ان کی مقبولیت اور قابلیت کی کھلی ہوئی دلیل ہے، ہر آنے والے کو جانا ہے، ہر جینے والے کو مرنا ہے اور ہر حیات کے لیے موت ہے۔ اس لیے پنڈت جواہر لال نہرو کی موت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ امن وانسانیت کے جو نقوش پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستان میں چھوڑے ہیں، ان پر ہندوستانی چل کر پنڈت نہرو اور اپنے ملک کا نام دنیا میں روشن کریں، ان کے ہر سوگوار کے لیے یہی بات وجہ سکون ہو سکتی ہے۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی

۱۱/اگست ۱۹۵۱ء

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نواب صدر یار جنگ بہادر ۱۱/اگست ۱۹۵۱ء مطابق ۲۶/شوال یوم جمعہ کو طویل علالت کے بعد وفات پاگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم کے ساتھ گذشتہ پچاس ساٹھ سال کی علمی، ادبی، سیاسی تاریخ کا دور بھی ختم ہوگیا۔ آپ ملک کے محققین اور فضلاء کے صدر نشیں تھے، شبلی وحالی کے دوستوں میں آخری آدمی تھے، مولانا ابوالکلام آزاد کی ''غبار خاطر'' کے اصلی محرک آپ ہی تھے، آپ کے علمی وتاریخی مقالے ملک کے معزز مجلّات وجرائد میں شائع ہوتے رہے، مستقل تصانیف میں آپ ملک کے بلند پایہ کے لوگوں میں سے تھے، شعروادب کے سلسلہ میں بھی اردو فارسی پر یکساں قادر تھے۔

خاندانی رئیس تھے، حبیب گنج ضلع علی گڈھ میں ایک نادر کتب خانہ جمع فرمایا تھا، غیرممالک سے نادر اور علمی کتابوں کے عکس اور نقل کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کتب خانہ کی بدولت آپ نے اپنے گاؤں حبیب گنج کو بغداد وقرطبہ کا ایک دارالعلوم بنادیا تھا، دور دور سے محققین جاتے تھے، اور مہینوں آپ کے کتب خانہ سے استفادہ فرماتے، ان کے قیام وطعام کا انتظام آپ خود فرماتے تھے، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالمصنفین اعظم گڈھ سے اس دور میں بھی متعلق رہے۔

گذشتہ دنوں جب شبلی ہائی اسکول کو شبلی انٹر کالج کیا گیا، تو سنگ بنیاد رکھنے کے لیے آپ ایک طویل سفر کر کے اعظم گڈھ تشریف لائے تھے، آپ کی تصنیفات میں ''سیرۃ الصدیق''، ''علمائے سلف'' مشہور کتابیں اور اپنی آپ مثال ہیں۔

وفات کے وقت مرحوم کا سن ۸۶ سال کا تھا، حیدرآباد میں کئی سال تک صدر الصدور رہے، صدر یار جنگ کا خطاب پایا، آپ کے خصوصی قدردانوں میں علامہ شبلی مرحوم اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد تھے، اس سے آپ کی گراں قدر ذات کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ افسوس کہ گذشتہ محفل علم وادب کی یہ آخری شمع بھی بجھ گئی۔

سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا   یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

(جمہوریت ممبئی ۱۹/اگست ۱۹۵۱ء)

آہ شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحؒ

۵/دسمبر ۱۹۵۷ء

۵/دسمبر ۱۹۵۷ء مطابق جمادی الاول ۱۳۷۷ھ کو جمعرات کے دن ساڑھے تین بجے حضرت مولانا کا وصال ہوا، کسے خبر تھی کہ اس طرح آناً فاناً علم وفضل، جہاد وتقدس اور دین ودیانت کی یہ بے بہا دولت ہم سے چھن جائے گی اور صرف ہندوستان کے مسلمان نہیں بلکہ پورا عالم اسلام ملت کی اس متاعِ گراں مایہ سے محروم ہوجائے گا۔ موت وحیات اللہ کے قبضہ قدرت کی چیز ہے۔

الحمدللہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ تقریباً اسی سال تک اس دنیا میں جئے اور بڑی شان سے جئے وہ ایک تھے مگر انجمن بن کر رہے اور انجمن ہی بن کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ علوم دینیہ میں ان کو خاص طور سے علم حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا موقع ملا اور پوری زندگی اس مقدس علم کی خدمت میں بسر کی، ہزاروں انسانوں کو حدیث رسولؐ کا عالم بنایا اور علوم نبوت کے سرچشمہ بن کر مدتوں دنیا کو سیراب کرتے رہے۔ قبولیت ومرجعیت اور فضیلت وتقدس کا صرف یہی ایک رخ اس قدر درخشاں ہے کہ حضرت مرحوم کی زندگی کامیاب وبامراد ہونے کے لیے کافی ہے۔

حدیث رسول کی اس شان سے خدمت کرنا ہر عالم کے نصیب میں نہیں ہوتا، یہ فضل امت محمدیہؐ میں اربابِ استعداد وصلاحیت ہی کو ملا کرتا ہے، جو اپنے دور میں چند ہی ہوا کرتے ہیں، حضرت مولانا کی اس امتیازی شان کا اقرار واعتراف ہندوستان، پاکستان، حجاز مقدس، شام وروم، چین، روس، ایران، افغانستان، انڈونیشیا، برما وغیرہ تقریباً ہر مشرقی ملک میں ان

کے شاگردوں کے وجود سے مدتوں ہوتا رہے گا۔

اگر کوئی حضرت شیخ الاسلام کی ذات کو غور سے دیکھے تو وہ ایسی شمع نظر آئیں گے، جس کی روشنی میں شب بیداری، تہجد گزاری کی تنویر بھی نظر آئے گی اور ذکر و شغل اور گریہ ودعا کی دنیا بھی، رات میں محراب ومنبر کی آباد دنیا بھی نظر آئے گی، اور دن میں سیف وسنان کی رزم آرائی بھی، درس وتدریس کی بھری محفل بھی نظر آئے گی اور رشد وہدایات کی مجلس بھی...... حضرت مولانا ہندوستان کے اس صف کے مجاہدوں میں سے ایک تھے، جس کا ہر سپاہی، قلم کے ساتھ ساتھ سیف بھی رکھتا تھا، جس کے پاس دل کے ساتھ سر بھی تھا اور علم واحسان کے ساتھ جہاد بھی، جس کی زندگی کا نصب العین تھا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹ رشوال ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں ضلع اناؤ کے ایک قصبہ بانگرمئو میں پیدا ہوئے، آپ کے والد سید حبیب اللہ صاحب حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی شیخ العرب والعجم کے خلیفہ اور مرید تھے، بچپن ہی سے حضرت مولانا روحانیت وتقدیس کی اونچی فضا میں رہے اور پروان چڑھے۔

اس مقدس ماحول نے حضرت مولانا کو علم وفضل اور رشد وہدایت کا وہ مقام عطا کیا، جس سے ایک دنیا فیض یاب ہے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی اور تربیت نے آپ کو محدث وفقیہ کے ساتھ اسلام اور وطن کا اولوالعزم مجاہد بھی بنایا اور یہ رنگ اس قدر نکھرا کہ عام لوگوں نے اسی کو زیادہ اہم سمجھا مگر جو لوگ ذرا بھی حضرت مولانا سے تعلق رکھنے والے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں، مولانا اپنے وصف میں انتہائی عروج پر تھے اور جس پہلو سے ان کو دیکھا جاتا تھا، اس میں وہ مکمل نظر آتے تھے۔

اگر حضرت مرحوم کی سیاسی زندگی کو لیا جائے تو ہندوستان کی سوسالہ تاریخ کی سطر سطر ان کے ذکر کے بغیر نامکمل ہوگی، اگر ان کی تبلیغی وارشادی سرگرمیوں کو لیا جائے تو مسلمانوں کی دینی اور ملی زندگی پر ان کا عظیم الشان احسان نظر آئے گا اگر ان کے علمی اور تدریسی کارناموں کو دیکھا جائے تو علوم وفنون اسلامیہ کی ہر انجمن ان کی روشنی سے فیض یاب معلوم ہوگی، اگر احسان

وسلوک کا جائزہ لیا جائے تو خانقاہیں آپ کے ذکر جمیل کے بغیر سونی نظر آئیں گی، اگر مستقل مزاجی اور جدو جہد کا جائزہ لیا جائے تو آپ عزم وارادہ کے پہاڑ نظر آئیں گے۔ اگر ایثار واخلاص اور حسن نیت کے حسین رخ کی نقاب کشائی کی جائے تو آپ اس کے خدوخال بن کر نظر آئیں گے۔

دور حاضر کی اس جامع شخصیت کا وصال خدا کی قدرت کاملہ کا ایک نمونہ اور ہمارے امتحان وآزمائش کا مرحلہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس منزل کو آسان فرمائے تاکہ آگے چل کر ہمیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی صاحب مدنی کی آنکھ بند ہونے سے اس دور کے عالم اسلام میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ خاص طور سے ہندوستان میں اب مجاہدہ وریاضت، اخلاص ونیکی، ایثار ومروت، جفاکشی ومحنت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور علم حدیث میں اب کوئی بندہ خدا اس مقام پر نظر نہیں آتا، جس کے مالک حضرت المرحوم تھے۔

ہم اس صدی کے اس عالم دین، اس مجاہدِ اسلام، اس مرشد ومربی، اس محدث وفقیہ، اس مدرس ومعلم اور اس مصلح ومبلغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی جناب میں دست بہ دعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس کے اس بلند مقام میں رکھے، جہاں ابوحنیفہ احمد بن حنبل، جنید وشبلی، بخاری ومسلم اور طارق بن زیاد اور ان حضرات جیسے اہلُ اللہ اہلِ نظر علماء اور مجاہدین ہیں نیز اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو صبر جمیل کے ساتھ ساتھ نعم البدل عطا فرمائے کہ ان ہی دو چیزوں سے یہ خلا پُر ہوسکتا ہے رحمۃ اللہ علیہ۔

(البلاغ جنوری ۱۹۵۸ء)

مجاہد ملت

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

۲؍اگست ۱۹۶۲ء

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند ۳۰؍صفر ۱۳۸۲ھ مطابق ۲؍اگست ۱۹۶۲ء کو ۳ بجے رات میں انتقال کر گئے رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً مولانا کے انتقال سے ہندوستانی مسلمانوں کی ملی زندگی میں ایسا خلا پیدا ہوگیا، جس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ حضرت مجاہد ملت اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے مسلمانوں کے جو ہر شب چراغ تھے، وہ اپنی زندگی کی صبح سے لے کر موت کی شام تک متحرک وفعال انسان بن کر رہے اور ایک دن کے لیے سکون نہیں پایا، وہ اپنی وضع قطع افکار وخیالات میں پکے عالم دین تھے، خطابت وتقریر میں آتش بیان مقرر تھے، سیاسی سوجھ بوجھ میں ہندوستان کے چوٹی کے لیڈر تھے، تصنیف وتالیف میں نہایت کامیاب مصنف ومؤلف تھے اور ملک وقوم کی خدمت میں وہ سچے مجاہد اور حقیقی خادم تھے۔

مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات برصغیر ہندو پاک کے لیے حادثۂ عظیم ہے، مولانا مرحوم اپنی جامعیت وخدمت اور مقبولیت میں ان چند لوگوں میں سے ایک تھے، جو اپنی ذاتی قابلیت وصلاحیت کی وجہ سے مقبولیت عام رکھتے تھے اور ہر طبقہ میں یکساں ان کی پذیرائی تھی، انسان کے لیے اچھا ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دنیا والوں میں اچھا ہو۔ مولان مرحوم ہر خوبی میں اپنی مثال آپ تھے، آپ کی زندگی کا ہر پہلو اتنا جلی اور روشن ہے کہ اس میں ان کے خدوخال صاف صاف نظر آتے ہیں اور کسی حیثیت سے اس میں کسی قسم کی کمزوری نہیں پائی جاتی ہے۔ بے نیازی، نڈری، بے باکی، اخلاص، خدمت، جدوجہد، مروت کے مجموعہ کا نام مولانا حفظ الرحمٰن تھا۔ مولانا نے جب سے علم

وعمل اور خدمت وسیاست کی دنیا میں قدم رکھا، اس وقت سے لے کر آخری دم تک جہد مسلسل اور سعی پیہم بن کر رہے، ایک دن بھی ان کی زندگی میں سکون کا نام نہیں ملتا، جب انہوں نے دارالعلوم دیوبند سے نکل کر مدرسہ جامع مسجد اودھ اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی تو وہ ایک بہترین مستعد مدرس ومعلم تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زندگی کا یہی بہترین کارنامہ ہے اور جب انہوں نے تصنیف وتالیف میں قدم رکھا تو ''رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم'' البلاغ المبین، اخلاق وفلسفہ اخلاق، قصص القرآن، اسلام کا اقتصادی نظام جیسی علمی تحقیقی اور مستند کتابیں لکھ ڈالیں اور ان کی تصنیفات کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تصنیف وتالیف کے لیے پیدا ہوئے تھے اور خطابت وتقریر خالص سیاسی ہو یا خالص دینی اور مذہبی دونوں میں یکساں سحر بیان خطیب ومقرر تھے، سیاسی میدان اور جنگ آزادی کی صف میں آئے تو اپنی خدمات میں کسی سے پیچھے نہیں رہے اور دوسرے چوٹی کے سیاسی رہنماؤں کے شانہ بشانہ چل کر ملک وقوم کی پوری خدمت انجام دی اور پھر آخر میں تقسیم کے بعد جب مسلمانوں کی مشکلات میں سہارا بن کر نکلے تو آخری دم تک بے باک انسان کی طرح جہاں تک ہوسکا، کام کرتے رہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تمام میدانوں میں یہ پکے مولوی ہوکر رہے۔ اپنے وضع قطع، فکر وخیال، علم وعمل، بات چیت میں وہ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر تھے۔ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ مسبب الاسباب صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے اور اسی عقیدہ ویقین کے بعد ہم ظاہری اسباب سے کام لیتے ہیں۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب آج کے ہندوستان میں مسلمانوں کے سہارا تھے، وہ ان کی ہر مصیبت میں شریک تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کام کے لیے چن لیا تھا، اب ان کے انتقال کے بعد پورا ملک مسلمانوں کے سچے خادم سے خالی نظر آتا ہے اور ظلمت خانہ میں کہیں کوئی روشنی نہیں معلوم ہوتی۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اسلام اور مسلمانِ ہند کی طرف سے جزائے خیر دے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے کہ انہوں نے ہمارے دلوں کو فتنہ ویلغار کی ظلمتوں میں زندگی کے یقین

سے منور کیا تھا اور اپنے دم قدم سے مسلمانوں میں باعزت جینے کا عزم پیدا فرمایا تھا۔

ہم مسلمانانِ ہند مولانا حفظ الرحمٰن کے غم میں بیتاب ہیں، ہمارے دل غمگین ہیں، ہماری آنکھیں اشکبار ہیں اور ہماری روح بے کیف ہے مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہمارا ایمان ویقین ہے اور صبر واستقامت کے ذریعہ اس حادثۂ عظیم پر نعم البدل کی امید ہے۔

(البلاغ اگست ۱۹۶۲ء)

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ

کی خدمت حدیث کا عہد زرّیں

۱۹/مارچ ۱۹۹۲ء

خطیب بغدادی نے ایک عالم کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کی بستی میں فلاں عالم شہرت وناموری اور دینی وعلمی خدمات میں آپ سے بہت آگے ہیں، حالاں کہ آپ علم وفضل میں ان سے بہت آگے ہیں، اس کے جواب میں اس عالم نے کہا کہ بات یہ ہے کہ وہ اپنی بستی سے نکل کر شہر میں چلے گئے، جہاں ان کو خدمت کے مواقع ملے اور میں اپنی بستی ہی میں پڑا رہا۔ اور میرا حلقہ بہت محدود رہا۔ یہ بات صرف علم تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہر بڑے کام کے لیے باہر سے تعلق پیدا کرنا ضروری ہے۔ اسلامی تاریخ ایسے ائمہ علم وفضل سے بھری پڑی ہے، جو دور افتادہ اور گمنام قریات ودیہات میں پیدا ہوئے اور مختلف ملکوں اور شہروں میں جا کر اپنے کاموں اور کارناموں کی وجہ سے امامت وشہرت کے مالک ہوئے اور ان میں کچھ ایسے اہل علم بھی گزرے ہیں، جو علمیت وقابلیت میں بہت آگے ہونے کے باوجود اپنے محدود ماحول میں رہ جانے کی وجہ سے نہ ان کا فیض عام ہوسکا اور نہ ان کو شہرت وناموری حاصل ہوسکی۔

ہماں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر شد
ندارد تنگنائے شہر تاب حسن صحرائی

ہم اپنے مخدوم ومحترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تیس سالہ زندگی کی علمی ودینی خدمات کو دیکھتے ہیں تو ان کی پچھلی زندگی گمنامی کی زندگی معلوم ہوتی ہے، جو مئو اور اس کے اطراف میں گزری ہے، اس دور میں مقامی مدارس میں اونچی تعلیم اور

مختلف فیہ موضوعات پر بلند پایہ تصانیف ضرور ہیں، مگر ان کی افادیت واہمیت کو وہ عموم حاصل نہ ہوسکا، جو مولانا کے بلند علمی مقام کے شایان شان ہو، البتہ خاص خاص علمی ودینی حلقے اور اہل علم مولانا کے مقام ومرتبے کے معترف تھے، جن میں ملک اور بیرون ملک کے علماء کی اچھی خاصی تعداد ہے، ان میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ، مولانا ابوالوفاء صاحبؒ صدر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد، علامہ شیخ محمد زاہد کوثری قاہرہ، شیخ احمد محمد شاکر قاہرہ جیسے اساطین علم اور مشاہیر امت کے نام ملتے ہیں، اس دور کی تصانیف میں الاعلام المرفوعہ، نصرۃ الحدیث اور رکعات تراویح مولانا کے حدیث وفقہ میں تبحر کی دلیل ہیں، اس کے باوجود یہ دینی وعلمی خدمات دوسرے دور کی شاندار اورتابناک خدمات کی تمہید معلوم ہوتی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم کا یہ چشمہ آہستہ آہستہ بہتے بہتے سیل بے کراں بن کر پھوٹ پڑا۔ اس طرح مولانا مرحوم کی علمی زندگی بلاء کی نام وری کا مجموعہ تھی۔

مولانا نازک مزاج، ذکی الحس، لطیف الطبع اور دور اندیش انسان تھے۔ ۱۹۶۰ء میں جب کہ ان کی علمی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا، ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی، طرح طرح کے عوارض واسقام لاحق ہوگئے تھے، قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوگیا تھا، اس دور کے اکثر خطوط میں بخار، ضعفِ بصارت، دورانِ سر اور دوسرے امراض کا ذکر کیا کرتے تھے، مگر اللہ کی شان کہ اس دور میں ان کو حدیث کی عظیم الشان خدمت کی توفیق ملی اور بڑھاپے میں امراض واسقام کے ہجوم کے باوجود وہ کام کیا، جو جوانی میں کرنے کا تھا، کسی نے کہا ہے کہ:

ع بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ جوش ہوتا ہے

اور کسی پر صادق آئے یا نہ آئے مولانا پر پورے طور سے صادق آتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث کے خدمت گاروں کے حق میں دعا فرمائی ہے: ''نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فوعاها ثم بلغها'' ۔الخ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو تروتازہ اور سرسبز وشاداب اور ہرا بھرا رکھے، جو میری بات سن کر دوسرے کو پہونچائے، اس نبوی دعا کا ظہور

مولانا مرحوم کی آخری زندگی میں یوں ہوا کہ مادی اور جسمانی عوارض وامراض کے باوجود علم حدیث کی خدمت کے لیے بے پناہ قوت وہمت عطا ہوئی اور اس حال میں پورے نشاط وانبساط کے ساتھ مولانا نے وہ دینی وعلمی کارنامے انجام دیے، جو جوانی وصحت کے زمانہ میں کئے جاتے ہیں، یہ بات بھی مولانا کی زندگی کے امتیازات میں سے ہے کہ بڑھاپے میں انہوں نے جوانی سے زیادہ کام کیا، اس علمی ودینی خدمات کے شان دار دور کی داستان ذرا تفصیل طلب ہے، میں ۱۹۵۰ء میں بمبئ گیا، اس کے بعد مولانا محمد اسحاق صاحب بنارسی مرحوم بھی بسلسلہ تجارت بمبئ پہونچے، مولانا سے ہم دونوں کے علمی ودینی تعلقات بہت پہلے سے تھے، اور دونوں ہی مولانا کے بے تکلف معتقدین وخدام میں تھے، مولانا بنارسی تو مولانا کے تلمیذ عزیز ہی تھے، راقم زمانہ طالب علمی سے مولانا کے معتقدین میں تھا۔ مولانا بنارسی صابو صدیق مسافر خانہ کے پاس الکریم منزل میں مقیم تھے اور عربوں کے ساتھ بنارسی کپڑوں کی تجارت کرتے تھے اور میں اسی کے قریب جنجیکرا سٹریٹ میں رہتا تھا، اور روزنامہ ''انقلاب'' اور ماہ نامہ ''البلاغ'' سے متعلق رہ کر لکھنے پڑھنے میں مصروف تھا۔

ان ہی ایام میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد ایوب صاحب مدرسہ مفتاح العلوم مئو کے چندہ کے سلسلہ میں مالیگاؤں سے بمبئ آئے، ہم دونوں کی وجہ سے دونوں بڑے انشراح کے ساتھ کئی دن بمبئ میں مقیم رہے، یہیں سے مولانا کی علمی خدمات کے دوسرے دور کی ابتدا ہوئی، اس کے بعد مولانا سفر حج اور دوسرے مواقع سے بمبئ تشریف لاکر ہفتوں ہفتوں قیام فرماتے رہے، ویسے بمبئ میں مولانا کے قدیم معتقد اور خادم شیخ انجینئر مرحوم تھے، جن کے یہاں مولانا قیام کیا کرتے تھے، مگر اب ان کا زیادہ وقت ہم لوگوں کے یہاں گزرنے لگا تھا، اسی دوران میرے چھوٹے بھائی قاضی حیات النبی مرحوم اور دوسرے چند لوگ بمبئ آگئے اور اچھا خاصا حلقہ بن گیا، جس میں بمبئ کے متعدد قدرداں بھی شامل تھے، ہم لوگ چوں کہ مولانا کے بے تکلف مزاج شناس تھے اور مولانا بھی ہم لوگوں سے مانوس اور افتاد طبع سے واقف تھے، اس لیے کسی قسم کا ذہنی وفکری انقباض محسوس نہیں کرتے

تھے بلکہ ہر وقت خوش وخرم اور پوربی زبان کے محاورہ میں ''بحال'' رہا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں خیال ہوا کہ بمبئی یا مئو میں ایک علمی ادارہ قائم کیا جائے، جس میں تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت کا کام ہو اور اس کے امکانات پر غور کیا جانے لگا، اسی سلسلہ میں مولانا نے میرے نام ۲۲/ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو لکھا کہ ''مالیگاؤں میں ۱۹ دن لگ گئے، اس کے بعد بمبئی میں کسی ادارہ کے لیے بات ہوئی ہوگی، جب معلوم ہو گیا کہ یہ بات نہیں ہے تو کوئی خاص محرک نہیں رہا، اپنے جوار میں اب بھی میرا خیال ہے کہ جیسا ادارہ آپ چاہتے ہیں، قائم ہونا مشکل ہے، اسی طرف (بمبئی) ایسے ادارے قائم ہو سکتے ہیں اور چل بھی سکتے ہیں، اس طرف (اپنے قرب وجوار) میں بخل، حسد اور بے ذوقی نے راستے بند کر رکھے ہیں، لیکن ادھر (بمبئی) جو خرابیاں ہیں، ان کا انکار بھی ممکن نہیں، آپ دور رہتے ہیں اس لیے قرب مطلوب ہے مگر مستقل قرب خاص ہو جائے تو یقین ہے کہ یہاں کے حالات چند ہی دنوں میں......؟ کو مرغوب ومطلوب بنادیں گے، میں آج کل کھانسی سے بہت پریشان ہوں، آج خصوصیت سے زیادہ مضمحل ہوں، بہت جبر کرکے یہ خط لکھ رہا ہوں۔''

میں ادارہ کے قیام کے سلسلہ میں متعدد بار مولانا کی خدمت میں مئو گیا اور وہیں ادارہ کے قیام کی کوشش کی، مولانا کے رفیق خاص مولانا عبداللطیف صاحب مرحوم جو اس وقت مئو میونسپلٹی کے چیئرمین تھے، انہوں نے اس رائے سے بالکلیہ اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کے لیے زمین اور عمارت کا ذمہ لیتا ہوں، تصنیف وتالیف آپ لوگوں کا کام ہے، اس کے باوجود مولانا مرحوم کی شدتِ احتیاط اور اس وقت کی صورت حال کی وجہ سے ادارہ مئو میں قائم نہ ہوسکا، اور مالیگاؤں میں مجلس احیاء المعارف کے نام سے احادیث کے مخطوطات کی نشر واشاعت کے لیے ایک ادارہ عمل میں آیا۔

اس کی صورت یہ ہوئی کہ مالیگاؤں کے مولانا عبدالحمید نعمانی مرحوم جن کا آبائی وطن مبارک پور ہے مولانا کی علمی شہرت سن چکے تھے، انہوں نے مالیگاؤں میں ''معہد ملت'' کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی، اس کے افتتاحی جلسہ میں میری کوشش سے بمبئی میں

دولت کویت کے مدرسہ کویتیہ کے استاد مدحت اسمٰعیل میرے ساتھ شریک ہوئے اور تدریسی خدمت کے لیے مولانا بشیر احمد مبارک پوری مرحوم، مولانا محمد عثمان صاحب مبارک پوری اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب خیر آبادی بلائے گئے، اس کے بعد مولانا نعمانی اپنی بعض تالیفات وتراجم کی کتابت کے لیے بمبئی آتے جاتے رہے اور ہم لوگوں سے ملتے جلتے رہے انہوں نے چاہا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کسی صورت سے سال میں چند ماہ ''معہد ملت'' میں قیام کریں اور ان سے علمی استفادہ کیا جائے۔ مولانا مرحوم اس کے لیے تیار نہ تھے تو مولانا نعمانی نے یہ تجویز رکھی کہ مالیگاؤں میں ایک نشریاتی ادارہ قائم کیا جائے، جس میں حدیث کی نادر ونایاب کتابوں کی تصحیح وتعلیق مولانا کی نگرانی میں ہو اور وہیں سے ان کو شائع کیا جائے، یہ تجویز مولانا کے لیے بڑی پُرکشش تھی، گویا ان کی دیرینہ دلی مراد پوری ہو رہی تھی، مگر جیسا کہ مولانا نے اپنے خط میں لکھا ہے بمبئی اور اطراف بمبئی کے ذہن ومزاج اور حالات سے مطمئن نہیں تھے، جب مولانا نعمانی کا تقاضا زیادہ ہوا تو مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ نعمانی بار بار تقاضا کرتے ہیں، مالیگاؤں چلو اور ادارہ کے قیام کے لیے فضا سازگار کی جائے، چناں چہ بمبئی سے مولانا، میں اور حاجی یحییٰ زبیر صاحب مالیگاؤں گئے اور وہاں کے اہلِ علم میں سے مولانا عبدالقادر صاحب، مولانا محمد عثمان صاحب اور دیگر علماء کے ساتھ معہد ملت کے مذکورہ بالا اساتذہ کی جدوجہد سے مجلس احیاء المعارف کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا اور ایک ہفتہ وہاں رہ کر اس کے لیے جملہ انتظامات کئے گئے، جس سے اسی سال ۱۹۶۰ء میں پہلی کتاب ''انتقاء الترغیب والترہیب'' شائع ہوئی، امام ابومحمد عبدالعظیم بن عبدالقوی شامی مصری متوفی ۶۵۶ھ رحمۃ اللہ علیہ کے حدیث کی مشہور کتاب الترغیب والترہیب کا انتقاء واختصار حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو اس کا پہلا قلمی نسخہ شاہ نعیم بہرائچی صاحب کے کتب خانہ میں ملا، اس کے بعد دوسرا قلمی مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں دستیاب ہوا۔ تیسرا نسخہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں تھا، مولانا فرماتے ہیں کہ بہرائچ والے نسخہ کی طباعت واشاعت کے لیے

میں بے تاب تھا کہ احیاء المعارف مالیگاؤں کا قیام ہوا اور اس کی اشاعت ہوگئی، ادارہ کی پہلی یہ کتاب ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۰ء) میں ۲۲۵ صفحات میں چھپ کر شائع ہوئی، مولانا نے اس کتاب کے تینوں مخطوطات کا مقابلہ کر کے حاشیہ میں اختلاف نسخ کو بیان کیا ہے، اغلاط کی تصحیح کی ہے، اور امام منذری کی اصل کتاب الترغیب والترہیب کو بھی سامنے رکھ کر تعلیق وتصحیح فرمائی ہے، اس کام میں مولانا کے شریک کار بعض اہل علم بھی رہے ہیں، مولانا نے ۲۲/اکتوبر ۱۹۶۰ء کے خط میں مجھ کو لکھا کہ:

> ''الترغیب والترہیب ۱۶ یا ۲۰ صفحات باقی تھے، اب وہ بھی چھپ گئے، تصحیح اغلاط وغیرہ کی طباعت ہو رہی ہے، آئندہ کیا ہوگا؟ کچھ معلوم نہیں، نہ میں نے کوئی بات کی۔''

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

> ''پرسوں سے مولانا وصی اللہ صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، آپ کی کتابیں پیش کردی گئیں، بڑی مسرت سے قبول کیا، الترغیب والترہیب کے صرف ۱۵۰ نسخے باقی ہیں، سب فروخت ہوگئے، دوسرے کام کا ابھی تک کوئی بندوبست نہیں ہے، آپ کو تو زبانی ہی حالات زیادہ معلوم ہوں گے، الحمد للہ آج کل میری صحت اچھی ہے۔''

اس خط میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جس کی وجہ سے ''احیاء المعارف'' پر بھی اثر پڑا اور مولانا کا اندیشہ صحیح ہونے لگا، مجلس احیاء المعارف سے دوسری کتاب ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۶ء) میں حضرت امام عبداللہ بن مبارک متوفی ۱۸۱ھ رحمۃ اللہ علیہ کی الزہد والرقائق شائع ہوئی، جو اپنے موضوع پر ایک عظیم کتاب کا قلمی نسخہ مکتبہ ولی الدین جار اللہ استنبول میں تھا، جس کا عکسی فوٹو حاکم قطر شیخ علی بن عبداللہ اپنے مکتبہ کے لیے نادر ومخطوط کتابوں کے فوٹو جمع کرتے تھے، اور چوں کہ یہ کام حاکم قطر کی اجازت ومرضی سے ہوا تھا، اس لیے مولانا نے مقدمہ میں ان کا

تذکرہ فرمایا ہے، نیز قاہرہ کے معہد مخطوطات سے اس کتاب کے تین فوٹو مجلس احیاء المعارف کے ذریعہ آئے، ان سب سے مولانا نے یہ کتاب مرتب فرمائی ہے، کتاب الزہد کے دو نسخے تھے، ایک ابوعبداللہ حسین بن حسن بن حرب مروزی نزیل مکہ متوفی ۲۴۶ھ کا جو ۵۶۴ صفحات میں ہے، دوسرا نسخہ ابوعبداللہ نعیم بن حماد مروزی مصری متقی ۲۲۸ھ کا جو درحقیقت مروزی کے نسخہ پر زیادت ہے، یہ ۱۳۲ صفحات میں ہے، مولانا نے اس کی تعلیق وتصحیح میں بڑے ذوق وشوق کا مظاہرہ کیا ہے، اوراس میں ان کے روحانی اوراحسانی ذوق کی پوری جھلک موجود ہے، زہد کے موضوع پرنہایت وقیع معلومات جمع کی ہیں، امام عبداللہ بن مبارک کے حالات نہایت تفصیل سے درج کئے ہیں، کتاب الزہد کے راویوں کے تراجم کی تحقیق کی ہے، کتاب کے موضوعات، اس کی مسند ومرفوع احادیث، موقوفات صحابہ، موقوفات تابعین وتبع تابعین، حضرات انبیاء اوران کی احادیث کی علیحدہ علیحدہ مفصل فہرست مرتب کی ہے، جو بجائے خودنہایت وقت اورمحنت طلب کام ہے، آخر میں استدراکات وتعقیبات ۱۵ صفحات میں دیئے ہیں، جن میں نہایت نادرونایاب معلومات ہیں، اس کتاب کی تحقیق وتعلیق میں پچاس کتابوں کی فہرست بھی دیدی ہے، الغرض یہ کتاب مولانا کے علم وتحقیق وتعلیق میں اور حدیث وفقہ اوررجال میں تبحر کا مظہر بن گئی ہے، اوراس آئینہ میں ان کے علمی کمالات کی پوری عکاسی ہے، تعلیقات میں احادیث کی تخریج کرکے بتایا ہے کہ مشہور ومتداول احادیث کی کتابوں میں یہ حدیثیں کن کن کتابوں میں ہیں، مشکل الفاظ کی شرح کی ہے، سند کے رجال پر روشنی ڈالی ہے، نسخوں کے اختلافات درج کئے ہیں۔

۱۱ر فروری ۱۹۶۶ء کے خط میں کہتے ہیں ''کتاب الزہد پوری چھپ گئی، صرف فہرستیں باقی ہیں، پورا ایک مہینہ گزرگیا اوراب تک نہیں چھپیں، اب میں عنقریب مالیگاؤں آرہا ہوں، امید یہی ہے کہ ۲۰ر فروری سے پہلے انشاءاللہ پہونچ جاؤں گا اوراپنے سامنے چھپواکر آپ کو جتنے نسخے مطلوب ہوں گے، آپ کو اور کچھ نسخے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ مولانا افغانی کے یہاں کتاب الزہد مطبوعہ بھجوادیئے تھے کہ مختصر سی

تقریظ لکھ دیجئے تو لکھا کہ فرصت نکال کر لکھ دوں گا مگر غالباً اب تک لکھ کر بھیج نہیں سکے، خیال تھا کہ رمضان کے آخر میں کتاب پریس سے نکل آتی تو حجاج کے ہاتھ حرمین روانہ ہوسکتی تھی۔

کتاب الزہد والرقائق کی اشاعت سے پہلے ہی مولانا کی علمی مشغولیت کا شہرہ ملک کے خاص خاص علمی واشاعتی اداروں تک پہنچ گیا اور وہ مولانا کی علمی خدمت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگے، چناں چہ مجلس علمی ڈابھیل، سورت کے ارکان نے مصنف عبدالرزاق صنعانی کی تعلیق وتصحیح کا کام بہت پہلے مولانا کے سپرد کردیا، جو آپ کی دلی خواہش کے عین مطابق تھا۔ کتاب الزہد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

"وما كنت لا نتمكن من اختلاص الفرصة لذالك، لا نصراف همتي بالكلية الى تحقيق المصنف للامام عبدالرزاق بن همام الصنعاني منذ الاعوام الخ"۔

اس زمانہ میں مشہور ہندوستان کے مشہور علمی ادارہ دائرۃ المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے مولانا سے مدد چاہی بلکہ مستقل طور سے حیدرآباد میں قیام کی دعوت دی، مولانا نے ۱۴ر رمضان ۱۳۸۶ھ کے خط میں لکھا کہ حیدرآباد کے متعلق آپ نے جو سنا ہے صحیح ہے ان کے کئی خطوط آئے تو میں نے اتنا لکھ دیا کہ میں جو کام (مصنف عبدالرزاق کا) کررہا ہوں اس کو مؤخر نہیں کرسکتا، بس اس میں ہی سے وقت نکال کر یا اس سے فاضل وقت میں اکمال (الاكمال لابن ماكولا) وانساب (كتاب الانساب سمعاني) کا کام کروں گا، پھر دوسرے خط میں انہوں نے خواہش کی کہ حیدرآباد ہی آجائے، میں نے لکھا، یہ کیوں کر ممکن ہے، وہاں آکر معلّمی صاحب (شيخ عبدالرحمن معلمي يماني مصحح دائرة المعارف) کو کیا دیتے تھے، ان حالات میں کیا امید ہے کہ میں اکمال وانساب کا کام کرسکوں گا۔

اس کے بعد مولانا نے مجلس علمی ڈابھیل کے علمی کام میں تعاون کو مستقل طور سے

پسند فرمایا اور احادیث کی متعدد قدیم ونادر کتابوں کی تصحیح وتعلیق کر کے عالم اسلام کو ممنون فرمایا اور مصنف عبدالرزاق کے ساتھ مسند حمیدی کو ایڈٹ کیا، جو دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

امام ابو بکر عبداللہ بن زبیر حمیدی مکی متوفی ۲۱۹ھ رحمۃ اللہ علیہ امام سفیان بن عیینہ کے شاگرد اور امام بخاریؒ کے استاد ہیں، ان کی مسند ابتدائی مسانید میں شمار ہوتی ہے، اس کے چار قلمی نسخے مولانا کو ملے، ایک دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ سے، دوسرا کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد سے، تیسرا کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے اور چوتھا نسخہ اثنائے طباعت میں کتب خانہ ظاہریہ دمشق سے عکسی فوٹو کے ذریعہ، یہ تمام نسخے مولانا نے ذاتی طور سے حاصل کیے اور مجلس علمی ڈابھیل کے اراکین نے اس کو شائع کیا۔

مسند حمیدی کے بارے میں ۳۰/جنوری ۱۹۶۲ء کے خط میں مولانا کہتے ہیں کہ منصف عبدالرزاق کی تحقیق کا کام میں نے شروع کر دیا ہے، حمیدی کا جزء اول عنقریب شائع ہوگا۔

منصف عبدالرزاق جیسی عظیم وضخیم کتاب کی تحقیق کے ساتھ مولانا نے مسند حمیدی کے بعد سنن بن منصور خراسانی مکی متوفی ۲۲۷ھ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق وتعلیق کی خدمت بھی انجام دی، جو ۱۳۸۷ھ (۱۹۶۷ء) میں مجلس علمی کی طرف سے شائع ہوئی، حدیث کی اس قدیم ونادر کتاب کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدرآبادی مقیم پیرس نے دریافت کیا اور ترکی کے کتب خانہ محمد پاشا کوبریلی سے ان کو اس کا ناقص نسخہ ملا، جو القسم الأول من المجلد الثالث کے عنوان سے شائع ہوا، اس کا مقدمہ بھی ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے اور تصحیح وتعلیق کا سارا کام مولانا مرحوم نے انجام دیا ہے، سنن سعید بن منصور کے اس حصہ میں فرائض، وصایا، نکاح، طلاق اور جہاد کے ابواب پر احادیث میں مولانا ۲۴/مارچ ۱۹۶۴ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''سنن سعید بن منصور کا کام ختم ہوگیا، والحمدللہ، پر مغز مقدمہ، فہرست مضامین اور اغلاط نامہ کے علاوہ یہ کتاب ۴۱۰/صفحات میں چھپی ہے، اس طباعت میں مشکلات درپیش تھیں، مولانا ۲۴/رمضان ۱۳۸۷ھ کے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ سنن سعید کی طباعت بالکل بند ہے،

دونوں کمپوز رگھر چلے گئے، وکیل صاحب زبردستی اپنے لڑکے سے کام لے رہے ہیں، جو مجھے پسند نہیں ہے، مالیگاؤں کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ وہ عید سے پہلے بالکل مکمل کردیں گے۔

مسند حمیدی اور سنن سعید بن منصور پر میرے مفصل مضامین ''معارف'' اعظم گڑھ میں اسی زمانہ میں شائع ہوئے تھے اور میری کتاب ''مآثر و معارف'' میں شامل ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہوا کہ کتاب الزہد والرقائق کی تحقیق کے دور ہی میں مولانا نے مصنف عبدالرزاق صنعانی کی تحقیق شروع فرمادی تھی، اس وقت لکھا کہ اس کے لیے اہل علم کی ایک جماعت ہوتی تو کام بہت آسان ہوجاتا مگر مولانا نے بڑھاپے اور امراض کے باوجود اپنے صاحب زادے مولانا رشید احمد صاب کو لے کر اتنا عظیم علمی کام انجام دیا ہے، جو ایک اکیڈمی کے کرنے کا ہے، یہ کتاب محتاج تعارف نہیں ہے، گیارہ جلدوں میں بیروت سے شان دار طباعت میں مجلس علمی کی طرف سے شائع ہوچکی ہے، اور اس ٹکر کا دوسرا علمی کارنامہ مصنف ابن ابی شیبہ متوفی ۲۶۲ھ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جس کو مولانا نے اپنی حیات کے آخری ایام میں انجام دیا ہے اور ان کی زندگی میں تین یا چار جلدیں مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ سے شائع ہوسکیں، اللہ تعالیٰ بقیہ جلدوں کا جلد انتظام فرمائے۔

یہ کتابیں احادیث کے قدیم ترین ذخیرے ہیں، جو اب تک دست برد زمانہ سے محفوظ رہ کر مختلف کتب خانوں میں پائی جاتی تھیں اور ان کے نام کتابوں میں دیکھے جاتے تھے، یہ کتابیں درحقیقت بعد کے ائمہ حدیث اور صحابہؓ وتابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے درمیان ''واسطۃ العقد'' کی حیثیت رکھتی ہیں، اور یہود ونصاریٰ کے اس مزعومہ کا جواب ہیں کہ بعد کے علمائے اسلام نے احادیث کو وضع کیا ہے، ان سے پہلے احادیث کو کتابی شکل میں نہیں تھیں، مذکورہ بالا کتابوں کی سندوں کی اشاعت کے بعد ان ہفوات کی کوئی حقیقت نہیں رہ گئی، نیز مولانا مرحوم نے ان احادیث کی تخریج کرکے بتادیا کہ بعد کی کتب احادیث میں یہ حدیثیں کن کن مقامات میں ہیں اور ان کے دوسرے طرق واسناد بھی ہیں، اور ان مذکورہ بالا کتابوں کے مصنفین نے بہت سے مقامات میں احادیث کے متن اور سند اور ان کے مفاہیم

ومعانی سے بحث کی ہے، جو بعد کی کتابوں میں نہیں ہیں، ان کے ذریعہ صحابہؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے بہت سے آثار واقوال محفوظ ہو گئے ہیں۔

ان قدیم ترین اور بنیادی کتب واحادیث کے علاوہ اس دور میں مولانا نے کئی نادر ونایاب کتب احادیث کی تحقیق فرمائی، جو مختلف احادیث کے اداروں سے شائع ہوئی ہیں، ان میں حافظ ابن حجر متوفی ۸۶۲ھ کی ''المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانیة '' چار ضخیم جلدوں میں ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں دولت کویت کی وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ کی طرف سے نہایت شان دار طباعت کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس کتاب کا نصف حصہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں تھا، اور دو مکمل نسخے شیخ محمد سلطان نمنکانی صاحب المکتبة العلمیة مدینہ منورہ سے ملے، ان میں ایک سند کے ساتھ تھا، اور دوسرا سند سے خالی تھا، دونوں نسخے ترکی سے حاصل کیے گئے تھے، مولانا نے نسخہ مجردہ عن السند کی تحقیق فرمائی ہے۔

نیز اسی دوران کشف الاستار عن زوائد مسند بزار ہیثمیؒ کی تحقیق وتعلیق کی اور ۱۳۹۹ھ میں چار جلدوں میں دمشق سے شائع ہوئی، اسی طرح محدث محمد بن طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ کی تلخیص خواتم جامع الاصول آپ کی تحقیق سے ۱۳۹۵ھ میں شائع ہوئی۔

ان ہی ایام میں محمد بن طاہر گجراتی پٹنیؒ کی مجمع بحار الانوار جو حدیث کی لغت کی مشہور وعظیم کتاب ہے، اس کی تحقیق مولانا عبد الحفیظ بلیاویؒ مصنف مصباح اللغات نے مولانا کی زیر نگرانی کی اور مولانا نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کو انجام دیا، کہنا چاہیے کہ اس عظیم لغت حدیث کی تحقیق بھی مولانا ہی نے کی ہے، اس دور میں مولانا کے علمی کارناموں میں امام ابن شاہین بغدادیؒ متوفی ۳۸۵ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الثقات کی تحقیق وتعلیق بھی ہے، اس کتاب کا نادر مخطوطہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں تھا، مولانا کے حکم سے میں نے پوری کتاب نقل کی اور میں نے اور مولانا محمد عثمان صاحب نے مل کر اس کا مقابلہ کیا، اسی زمانہ میں مولانا نے اس کی تحقیق مکمل کر لی تھی، جب شیخ عبد الفتاح ابوغدہ مولانا کے پاس مؤتشر نف

لائے تو میں نے اس کا تذکرہ کیا اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اصرار کیا کہ میں اس کو ساتھ لے جا رہا ہوں، تا کہ جلد شائع ہو جائے مگر مولانا نے کہا کہ کچھ کام باقی ہے، میں بعد میں بھیج دوں گا، افسوس کہ یہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوسکی، مولانا کی ابتدائی دور کی تصانیف میں ''الحاوي لرجال الطحاوی ''بہت مشہور کتاب ہے،جس کے بارے میں ہم لوگ زمانۂ طالب علمی میں سنا کرتے تھے،مگر افسوس کہ یہ کتاب بھی اب تک طبع نہیں ہوسکی ہے، حالاں کہ اس کے مواقع فراہم تھے۔

اگر احادیث کی مذکورہ نادر و نایاب اور عظیم کتابوں کا تعارف اور ان کی اشاعت میں حضرت مولانا کی خدمات کا تذکرہ تفصیل سے کیا جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا اس لیے نہایت اختصار سے ان کا ذکر کیا گیا ہے، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان نادر و نایاب اور قدیم و عظیم ذخیروں کی اشاعت کے بعد ان میں سے کئی ایک فوٹو کے ذریعہ بیروت میں شائع ہوئے اور پورے عالمِ عرب اور عالمِ اسلام کے اہلِ علم کو ان سے استفادہ کا موقع ملا اور وہ حضرات مولانا کی علم حدیث میں عبقریت سے واقف ہوئے، جس کی وجہ سے مولانا کی شخصیت علم حدیث میں مرجع بن گئی، اور ہندوستان و پاکستان کے اہل علم سے زیادہ ان حضرات نے ان کتابوں اور مولانا کی ذات سے علمی و دینی فائدہ اٹھایا، ہم نے متعدد بار یہ منظر دیکھا کہ مولانا ایام حج میں حرم شریف کے سامنے مدرسہ فخریہ کے چھوٹے سے دفتر میں تشریف رکھتے تھے اور مصر و شام، حجاز، اور افریقہ وغیرہ کے اہلِ علم مولانا کی خدمت میں نیازمندانہ انداز میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے اور قدماء کے طریقہ پر ان سے حدیث کی روایت کی سند لیتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ہندوستان میں علمِ حدیث کے آخری سالار قافلہ تھے۔

(ترجمان الاسلام بنارس خصوصی اشاعت مولانا اعظمی نمبر از جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲ء)

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ

وطن کی آزادی کے لیے صف علماء سے جو حضرات اگلی صف میں آئے ان میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی مرحوم ومغفور بھی تھے، افسوس کہ یہ مجاہد بھی ۲؍ستمبر کو اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا، اور دہلی میں سپرد خاک ہو گیا۔

مولانا مرحوم نے ساری زندگی ملکی مفاد اور آزادی کے سلسلے میں پاپڑ بیلے، اور کانگریس سے وابستگی کے باوجود کئی طریقۂ عمل سے دوچار ہوئے، تقسیم کے بعد آپ اپنے خاندان سمیت دہلی چلے آئے اور وہیں رہے، تا آنکہ آپ کی وفات واقع ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور انکی روح کو شاد رکھے، آپ کی تجہیز وتکفین دہلی میں بڑے اہتمام سے ہوئی، مسلمان اور ہندوؤں نے آپ کے جنازہ کے ساتھ احترام کا بڑا مظاہرہ کیا، اور جو کچھ آج کل سیاسی اور سرکاری لوگوں کی تکفین وتدفین کی تقریب میں ہوتا ہے وہ ہوا، چنانچہ دہلی کے ایک ذمہ دار مسلم معزز معاصر نے خبر دی ہے کہ:

"کانگریس کے جنرل سکریٹری مسٹر خزیمن نرائن نے قبر پر پھول مالا چڑھائی، ایک پھول مالا وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو کی طرف سے بھی ان کے ملٹری سکریٹری مسٹر یونس لے کر پہونچے تھے، دہلی صوبہ کانگریس کمیٹی کی طرف سے بھی قبر پر پھول ڈالے گئے"۔

معلوم نہیں کہ مولانا مرحوم کی قبر پر پھول مالا چڑھانے کی جلی سرخی دینے اور اس کی ہر خبر کو خاص طور سے چھاپنے سے کیا مقصد ہے اگر اس سے مولانا کا اعزاز مقصود ہے تو اب ان کو ایسی خبروں کے ذریعہ اعزاز کی ضرورت بالکل نہیں رہی، جو اسلام کی تعلیمات کے نہ صرف خلاف ہیں بلکہ اس کے لیے سخت مضر ہیں، مولانا جس مکتب تحریک واصلاح سے وابستہ تھے اس میں اس کی مطلق گنجائش نہیں ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ ہم اسے نظر انداز کر کے یہ ثابت کریں کہ اسلام میں قبروں پر پھول مالا کی کوئی حیثیت نہیں ہے، جو لوگ اسے اظہار، اعزاز واحترام کے لیے یہ کام کر رہے ہیں، یہ ان ہی کی چیز ہے جس کے لیے وہ آزاد ہیں۔

(انقلاب ممبئی)

ڈاکٹر ذاکر حسین
صدر جمہوریہ ہند

۳؍مئی ۱۹۶۹ء

افسوس کہ ۳؍مئی ۱۹۶۹ء کو جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جمہوریہ ہند اچانک انتقال کر گئے، مرحوم کی عمر اس وقت ۷۲ سال کی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار قریب رحمت میں جگہ دے۔ وہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بہت زیادہ محترم تھے، سادگی، شرافت، عزت نفس، دینداری، وضعداری اور اخلاق میں بہت بلند تھے، انتقال کے وقت ان کی دو حیثیات تھیں ایک کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے علمی و تعلیمی ذہن کے معماروں میں تھے، اور جب حکیم اجمل، مولانا محمود حسن اور مولانا محمد علی وغیرہ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے الگ ہوکر ایک ایسے مسلم تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی، جو برطانوی حکومت اور مغربی ذہنیت سے آزاد اور صاف ہو تو ڈاکٹر ذاکر حسین نے جرمنی سے آکر اس کی نظامت قبول کرلی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اولین معماروں میں شامل ہو گئے، اسی زمانے میں انہوں نے اپنی بے پناہ مخلصانہ جدو جہد سے جامعہ ملیہ کو آگے بڑھایا اور تقسیم سے پہلے تک اسی سے متعلق رہے۔ تقسیم کے بعد وہ مسلم یونیورٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے اور اپنی دور اندیشی سے اسے حکومت کے اثراتِ بد سے بچانے کی کوشش کی، اس کے بعد بہار کے گورنر بنے پھر نائب صدر اور صدر جمہوریہ ہوئے، یہ دوسری حیثیت تھی، وہ اپنی زندگی کی دونوں حیثیات میں شریف انسان رہے اور اپنی وضعداری پر قائم رہ کر ذمہ داری پوری کی، پھر بھی وہ نہ جنید و شبلی تھے اور نہ جنید و شبلی کے دور کے تھے، دوسروں کی طرح ان میں بھی خامیاں تھیں، خاص طور سے صدارت کے بعد تو لوگوں کو کئی شکایتیں پیدا ہوگئی تھیں، یہ معاملہ ان کی زندگی تک تھا اور ختم ہو گیا، اس لیے اب ان کے حق میں مغفرت کی دعا کرنی چاہیے۔

(البلاغ جون ۱۹۶۹ء)

رام بابو سکسینہ

۱۹۵۷ء

افسوس کہ اردو زبان کے ایک اور بہت بڑے محسن اور پُرانے خادم مسٹر رام بابو سکسینہ بھی ہم سے جدا ہوگئے اور اس دور میں جب کہ اردو کے لیے ان جیسے بہت سے مخلصوں اور خادموں کی ضرورت تھی ہم سے چھن گئے، آں جہانی نے اردو زبان کی خدمت کے سلسلے میں جو سب سے اہم کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان میں اب سے بہت پہلے اردو زبان کی مکمل تاریخ لکھی، جس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ نیز آپ نے ''یورپین اردو شعراء'' کے نام سے ان انگریز شاعروں کے حالات لکھے جنھوں نے اردو زبان میں شاعری کی۔ نیز آپ نے ایک کتاب ''مرقعِ شعراء'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کے علاوہ آپ زندگی بھر اردو کے ایک خادم کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اردو ادب اپنے اس محسن کو کبھی نہیں بھول سکتا اور اس کی یاد اردو زبان میں آتی رہے گی۔

دیکھنا ہے کہ متعصب لوگوں کی بے راہ روی اور حکومت کی مصلحت بینی کی وجہ سے کیسے کیسے لوگ اپنی حسرت لیے دنیا سے چلے جاتے ہیں اور اپنی اردو زبان کی کس مپرسی کا یہ الم ناک نظارہ کرتے ہوئے انتقال کرتے ہیں؟۔

(انقلاب ممبئی)

روش صدیقی جوالاپوری

فروری ۱۹۷۱ء

افسوس کہ فروری ۱۹۷۱ء کے آخر میں مشہور شاعر روش صدیقی جوالاپوری نے انتقال کیا، وہ شاہ جہان پور کے ایک مشاعرہ میں گئے اور وہیں دل کا دورہ پڑا، جس سے جاں بر نہ ہو سکے، مرحوم ہندوستان کے مشہور شاعر ہی نہیں تھے بلکہ سچے مسلمان بھی تھے، روزہ نماز کے علاوہ اوراذ کار ووظائف کے بھی عادی تھے، مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے، اوراخلاق وکردار سے بہت اونچے انسان تھے، ان کی شاعری غزل اورنظم دونوں میدان میں یکساں رنگینی ودلکشی رکھتی تھی۔ اس میں ابتذال وتسفل کا نام تک نہ تھا اوران کی ذات کی طرح ان کی شاعری بھی بڑی پُرشکوہ، باروقاراورسنجیدہ تھی، ان کے اٹھ جانے سے روایتی شاعری کا جدید رنگ پھیکا پڑ گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جوارِرحمت میں جگہ دے آمین۔ (البلاغ مارچ ۱۹۷۱ء)

پروفیسر رشید احمد صدیقی جونپوری

۱۵؍جنوری ۱۹۷۷ء

۱۵؍جنوری ۱۹۷۷ء کو پروفیسر احمد صدیقی نے علی گڑھ میں بیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا، ان کا وطن جونپور تھا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو کے پروفیسر ہوئے اورعلیٰحدگی کے بعد یہیں رہ گئے وہ اردوزبان کے صاحب طرز انشاء پرداز تھے، طنز ومزاح ان کا خاص موضوع تھا اور اس میں وہ منفرد تھے، ان کی وفات اردوادب کے لیے سانحہ ہے، ان کی متعدد کتابیں اردوادب میں شہ پارے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔

(البلاغ فروری ۱۹۷۷ء)

رابعہ خاتون مبارکپوری

۱۸۵۷ء میں بنارس، مبارکپور اور اعظم گڈھ سے جو خاندان بمبئی اور اس کے اطراف میں آئے اور یہیں رہ بس گئے ان میں مدنپورہ بمبئی میں اطلس والا خاندان بھی ہے، جس نے کئی دور دیکھے اور اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھی، اسی خاندان کی ایک بزرگ خاتون رابعہ کا نوے سال کی عمر میں ۲ ؍فروری کو انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ مرحومہ اپنے خاندان میں سب سے معمر اور بزرگ تھیں، وہ اپنی ذات سے ایک دور کی تاریخ تھیں، مبارک پور، بنارس، بمبئی مالیگاؤں میں جہاں جہاں ان کے خاندان تھے سب کے احوال وانساب بیان کرتی تھیں، اسلامی اور مشرقی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر تھیں۔ عزم و حوصلہ، دوراندیشی، معاملہ فہمی اور اصابت رائے میں اپنی آپ مثال تھیں، اللہ تعالیٰ نے دنیاوی جاہ و جلال سے بھی خوب خوب نوازا تھا، وہ اپنے خاندان کی عظمت رفتہ تھیں، ان کے صاحبزادگان الحاج محمد، الحاج عبدالغنی اور الحاج عبدالشکور اور دیگر اہل خانہ کی زندگیاں مرحومہ کے حسن تعلیم وتربیت کا بہترین نمونہ ہیں۔ بیشک والدین کی دعاؤں اور تعلیم وتربیت کا ثمرہ اولاد کو ملتا ہے۔ اور اس حقیقت سے بھی کون انکار کرسکتا ہے کہ انسان کی پہلی درس گاہ ماں کی آغوش ہے، ماں کے اندر جس قدر خدا پرستی، نفس کی پاکیزگی اور شریعت اسلامیہ کی خو اور بو ہوگی، اسی کے بچوں پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔ راقم الحروف تقریباً بیس سال پہلے بمبئی آیا تھا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، بڑی محبت وشفقت سے پیش آتی تھیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کا ٹھکانا جنت الفردوس بنائے۔ (آمین)

(انقلاب ممبئی)

شاہ سعودؒ بن عبدالعزیز آل سعود

۲۳؍فروری ۱۹۶۹ء

دیارِ حبیب ﷺ کا معمار، حرمین شریفین کا خادم، دیارِ غیر میں، پاک وطن سے دور عالم غربت میں سفر آخرت پر روانہ ہوگیا، آپ ایک عرصے سے آنتوں کے سرطان میں مبتلا تھے، متعدد ممالک میں علاج کے سلسلے میں گئے، قدرے افاقہ رہا، لیکن مرض جوں کا توں موجود رہا، اسی اثناء میں عارضۂ قلب بھی لاحق ہوا اور بالآخر ۶؍ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ (۲۳؍فروری ۱۹۶۹ء) یونان کے دارالحکومت ایتھنز میں انتقال فرماگئے انا للّٰه وانا الیه راجعون. اللّٰهم اغفرله مغفرة تامة من عندك وارحمه انك انت الغفور الرَّحيم۔

شاہ سعود اس عہد کی عظیم شخصیت تھے، عالم اسلام میں وہ ایک ممتاز حکمراں تھے، ایک ایسی مملکت کا فرماں روا جو مغربی جمہوریت کے بہ جائے شاہی نظام کے تحت بادشاہ ہوا ہو، اس کے ملک میں کوئی تحریک نہ چلی ہو اور وہ از خود مجلسِ وزراء کا نظام نافذ کرے، وزراء حکومت کو سیاسی، اقتصادی، مالی اور دفتری پالیسیوں کو ترتیب دینے کی مکمل آزادی دی۔

وہ مجلس شوریٰ کی تاسیس کریں، جس کے اختیارات اس پارلیمانی نظام سے بھی زیادہ ہوں، جو مغربی سیاست کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ ارکان مجلس شوریٰ کے ذمہ یہ واجب کیا گیا ہے کہ وہ حکومت کی پالیسیوں کو وضع کریں، وزراء کے اعمال وافعال پر جرح وتنقید کریں اور شاہ جس کو ناپسند خیال کریں، اسے بحث وترمیم کے لیے ایجنڈے پر لائیں۔

یہی نہیں، شاہ سعود ایک ایسے بادشاہ تھے، جنہیں مملکت کا ہر فرد جب چاہے ایک تار دے، شاہ اس کا جواب لامحالہ ۲۴ گھنٹوں کے اندر دیں، اور یہ بے دریغ اپنے ہر معاملہ پر شاہ سے گفتگو کر سکے۔

ہم نے ۱۹۶۸ء میں بعض ایسے تاجروں سے ملاقات کی، جن کا کیس صرف یہ تھا کہ

کسٹم والے ان پر زیادتی کررہے تھے، انہوں نے شاہ سعود علیہ الرحمہ کو تار دیا، ملاقات کا وقت مقرر ہوا اور وہ ایوان شاہی سے بامراد واپس لوٹ آئے۔

شاہ سعود کا یہ معمول رہا کہ وہ مملکت کے جس علاقے میں جاتے، قصر شاہی میں ایک عظیم دعوت دیتے، علاقے کے روسا، قبائلی سرداروں اور دوسرے ممتاز افراد کو، اپنی پالیسیوں سے مطلع کرتے، ان کی شکایات سنتے اور پھر ان سب کے ساتھ کھانے کی دعوت میں شریک ہوتے۔

شاہ سعود کے عہدِ حکومت میں مکہ مکرمہ کے چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) کو ہم نے دیکھا کہ ایک مسند پر تشریف فرما ہیں، ہر ملاقاتی اور زائر بھی اسی مسند پر بیٹھتا ہے، وہ ہر موضوع پر بے تکلف گفتگو کرتے ہیں اور جب ہم نے ان سے دریافت کیا کہ:

سوال: آپ کے فیصلوں کی اساس کیا ہوتی ہے؟

جواب: ہمارے تمام فیصلے کتاب وسنت پر مبنی ہوتے ہیں۔

سوال: اگر کسی مسئلے پر علماء اور آپ کے قاضی ایک دوسرے سے مختلف آراء رکھتے ہوں تو آپ اسے کس طرح حل کرتے ہیں؟

جواب: علماء کا اختلاف کسی ایسے مسئلے میں نہیں ہوسکتا، جس کے لیے کوئی نص موجود نہ ہو، ایسی حالت میں ہم اس قول کو ترجیح دیتے ہیں، جس کی دلیل قوی اور اقرب الی الحق ہو۔

شاہ سعودؒ نہ صرف یہ کہ صوم وصلوٰۃ اور دینی شعائر کے پابند تھے بلکہ وہ ایک عالم دین بھی تھے، اگرچہ وہ اپنے جلیل القدر باپ سلطان عبدالعزیز بن سعود علیہ الرحمہ کی طرح ہر روز درس قرآن مجید تو نہ دیا کرتے لیکن علم بھی تھا اور ذوق بھی، دین اور علماء سے ان کا تعلق انتہائی قریبی تھا اور اپنے شاہی خطابات، مراسلات اور سرکاری احکام میں قرآن مجید کی آیات اور احادیثِ نبویہؐ کے حوالے دینا، ان کا معمول تھا اور وہ اپنے عہد میں بتکرار واعادہ فرمایا کرتے تھے کہ:

''آج دنیا جس سر پھٹول، باہمی جدال وقتال میں مبتلا اور آگ کے دریا میں غوطہ زن ہے، اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہم اسے دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس دین مبین کی

جانب رجوع کرے، جو قرآن وحدیث میں موجود ہے، اور جس کا ایک عملی نمونہ ہم نے سعودی مملکت کے آئین وضوابط کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔''

آپ نے عالمِ اسلام سے بارہا فرمایا:

''عالمِ اسلام کی عظمت وسربلندی اور عزت وکامرانی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق اپنے اپنے ملک کا نظام مرتب کریں اور چلائیں اور پھر دیکھیں کہ زمینی برکات اور آسمانی رحمتیں ان پر کس انداز سے نازل ہوتی ہیں۔''

اسلامیانِ عالم کوانہوں نے ایھا الاخوۃ ،ایھاالاحبۃ، یا معشر الاسلام یا جنود الاسلام کہہ کر پکارا اور وہ اپنے اقتدار کے آخری ایام تک پوری دنیا کے مسلمانوں کو اسلامی اخوت، باہمی محبت ومودت اور جہاد کی تیاری کا درس دیتے رہے۔

شاہ سعود نے اپنے عہد میں دینی، تعلیمی، سماجی بہبود اور سرزمین نجد وحجاز میں بعض صنعتوں کے قیام، مزید برآں زراعت کے توسیع اور حکومت سعودی عرب کے مالی شعبے کی تنظیمِ نو کے سلسلے میں متعدد اہم اقدامات کئے، ان کے عظیم کارناموں میں ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہر سعودی بستی میں ایک مسجد اور ایک مدرسہ اپنی جیب خاص سے بنوایا، آج ہزاروں مسجدیں اور مدارس ان کا صدقہ جاریہ ہیں اور ملک میں جو تعلیمی ترقی کا دور دورہ ہے، یہ انہیں کی باقیات صالحات میں سے ہے۔

طبی خدمات بھی عظیم وجلیل ہیں، عظیم تر شفاخانے اور ان میں مریضوں کے لیے ہر قسم کی سہولت اور ادویات کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ انتہائی بیش قیمت دوائیں ہر وقت میسر وموجود ہو اور غریب وامیر کے امتیاز کے بغیر سبھی کو مفت مہیا کی جائیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سعودی عرب میں تیل کی دریافت اور ملکی معیشت میں اضافے کی وجہ سے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ ملک کی بندرگاہوں کو بہتر اور وسیع بنایا جائے، شاہ سعود نے اس سلسلے میں قدم اٹھایا، اس وقت تک سعودی عرب کی کوئی بندرگاہ اس قابل نہیں تھی کہ بڑے بڑے جہاز آسکیں، شاہ سعود نے خلیج مندمان اور بحیرۂ احمر میں حدہ کی بندرگاہ کو

وسعت دی، اس طرح ان دونوں بندرگاہوں کو گہرا کر کے بڑا کر دیا گیا تاکہ ایشیا اور مغربی ممالک کے ساتھ نقل و حمل میں آسانی ہو، جدہ کے ہوائی اڈہ کو وسیع کیا گیا۔ اس طرح عرب اور دیگر بیرونی ممالک کے درمیان باقاعدہ ہوائی سروس قائم ہوگئی۔ ساتھ ہی ساتھ سعودی عرب کے اندر بڑے بڑے شہروں طائف، ریاض، بریدہ، دہران، ظہران اور جدہ وغیرہ کے درمیان بھی ہوائی سروس جاری کی۔ شاہ سعود عرب کے پہلے فرماں روا تھے، جنہوں نے عرب ممالک کے درمیان لاسلکی ٹیلی فون کا ۱۹۵۵ء میں افتتاح کیا، جس کے ذریعہ مصر اور شام کے ساتھ رابطہ قائم ہوا۔

شاہ سعود نے اپنے گیارہ سالہ عہد میں ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بجلی اور آب رسانی کے انتظامات کئے۔ سعودی عرب میں چھوٹے زیر زمین آبی کنوؤں کی ایک بڑی تعداد ملک بھر میں پھیلی ہے، جنوبی عسیر، احصاء اور ریاض میں ایک نہر کی تعمیر اور پائپوں کے ذریعہ آبپاشی کا انتظام، اور ھفوف، کاتف، طائف اور وادیٔ فاطمہ میں بھی انہوں نے اس قسم کے آزمائشی اسٹیشنوں کی تعمیر کے احکام صادر فرمائے، جو پایۂ تکمیل کو پہونچے۔

شاہ سعود نے ایک مضبوط اور قوتوں کے لحاظ سے ایک دولت مند ملک ورثہ میں پایا۔ انہوں نے شام اور متحدہ عرب، جمہوریہ اور دیگر عرب ممالک میں تعاون پیدا کیا، شاہ سعود ایک مخیّر انسان تھے، انہوں نے اپنے ہندو پاکستان کے دورے کے موقع پر مظلوم مہاجروں کی مدد کے لیے ایک خطیر رقم پیش کی، جس سے ایک کالونی بسائی گئی، جو آج ''سعود آباد'' کے نام سے موسوم ہے۔

حجاج کی سہولت کے لیے ۵۶ء میں جدہ میں ایک قرنطینہ بنایا گیا، جس میں اسپتال کلینک اور دواسازی کے محکمے ہیں۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ تمام حجاج جو ہر سال حجاز آتے ہیں، ان کی ضرورت کے لیے کافی ہے، اس طرح حاجیوں کی حفاظت، ترقی یافتہ حمل و نقل اور پانی کی سہولتیں حاصل ہوگئیں اور ان کے لیے حج محصول بھی معاف کر دیا گیا۔

شاہ سعود نے مسجد نبویؐ کی توسیع کے ضمن میں عملی قدم اٹھایا اور ایسا ہی کام حرم کے

چاروں طرف مقدس علاقہ میں ہوا، ان کے عہد میں شہر ریاض کو دارالحکومت کے مختلف محکموں اور غیر ملکی سفارت خانوں کو جدہ سے ریاض منتقلی کا کام ہوا، تعلیمی وطبی خدمات میں ترقی وتوسیع ہوئی، ۱۹۵۵ء میں ریاض میں فوجی کالج قائم کیا گیا اور اس کا نام سلطان عبدالعزیز کے نام پر رکھا گیا، نیز ان کے عہد میں جدہ میں ایک صنعتی مدرسہ قائم ہوا، جس میں تکنیکی اور پیشوں کی تعلیم کا آغاز ہوا۔

اپنی تخت نشینی کے چند ماہ بعد ۱۱؍جون ۱۹۵۴ء میں مصر اور سعودی عرب میں مشترکہ دفاع کا سمجھوتہ ہوا اور دونوں ممالک کی افواج ایک کمان میں دیئے جانے کا اعلان کیا گیا۔ ۲۶؍دسمبر ۱۹۵۵ء کو مصر، سعودی عرب اور شام نے اپنی فوجیں ایک کمان کی تحویل میں دے دیں اور مصری وزیر جنگ کو سالار اعلیٰ بنادیا گیا۔ ۱۰؍اپریل ۱۹۵۶ء کو شاہ سعود اور امام یمن کے مابین معاہدہ ہوا، جس نے ۱۹۳۴ء میں ہونے والے معاہدہ طائف (جو آپ کے جلیل القدر والد اور امام یمن مرحوم کے مابین ہوا تھا) کی یاد تازہ کردی۔

۲۰؍اپریل ۱۹۵۶ء کو شاہ سعود نے ریاض میں مصر کے صدر جمال عبدالناصر اور امام یمن سے مذاکرات کئے اور ۵ سال کے لیے متحدہ فوجی کمان رکھنے کے لیے سمجھوتہ پر دستخط ہوئے۔ شاہ سعود کے اپنے عرب بھائیوں کے ساتھ خیر سگالی جذبہ کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ جب برطانیہ اور فرانس نے مصر کی رقمیں روک لیں تو انہوں نے ۲۸؍اگست ۱۹۵۶ء کو دس کروڑ ڈالر کی رقم مصر کو بطور قرض پیش کی اور ۷؍نومبر ۱۹۵۶ء کو معرکہ سویز کے موقع پر سعودی عرب نے شام اور عراق کی دیکھا دیکھی تیل کی پائپ لائن توڑ دی۔ اس سے سعودی عرب کو وہ مشہور مالی بحران پیش آیا، جسے یہودی، امریکی اور برطانوی خبر رساں ایجنسیوں نے شاہ سعود کی مالی بے احتیاطیوں کا نتیجہ قرار دیا، درآں حالیکہ یہ سب مصر پر اینگلو امریکی حملے کے دفاع کے لیے تھا۔

جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ سے چند روز قبل متحدہ عرب جمہور کے صدر جمال عبدالناصر نے اعلان کیا تھا کہ اسرائیل کے جہازوں کو خلیج سے نہیں گزرنے دیا جائے گا، لیکن،

حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ سے دس سال قبل شاہ سعود نے ۱۱؍اپریل ۱۹۵۷ء کو اعلان کیا تھا کہ:

''اسرائیلی جہازوں کو خلیج عقبہ میں سے گزرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔''

۲۱؍اپریل ۱۹۵۸ء کو شاہ سعود مرحوم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ عرب ممالک اپنے خرچ سے ایک پائپ لائن تیار کریں، جس کے ذریعے سے دولت سعودیہ، کویت اور عراق کا تیل شام اور لبنان کی بندرگاہوں میں پہونچتا رہے، جو بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہیں اور اگر پائپ لائن نہ بنائی گئی تو تیل کی بڑی مقدار بڑے بڑے ٹینکروں کے ذریعے بحری راستہ سے باہر بھیجنی لازمی ہو جائے گی اور وہ ٹینکر اس میداں کا چکر لگاتے ہوئے جاسکیں گے اور اس طرح خرچ بہت بڑھ جائے گا۔

۱۹۶۱ء میں شاہ سعود بغرضِ علاج امریکہ گئے، جہاں امریکی اخبارات نے انہیں بدنام کرنے کے لیے روایتی انداز اختیار کیا اور ان کی بیویوں اور حرم کے ان گنت فحش جملوں سے اپنے صفحات سیاہ کیے درآں حالیکہ یہ سب خوب جانتے تھے کہ شاہ کی سرکاری مجالس تک میں یہ ضابطہ عائد رہا کہ ملاقاتیوں میں عورتیں شامل نہیں ہوں گی۔

شاہ سعود اپنی قوم اور اپنے ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے، ۲؍نومبر ۱۹۶۴ء کو سعودی عرب کی مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی امیر فیصل کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جائیں، علماء نے اپنے اس اجتماع کے ذریعہ شاہ عبدالعزیز کی وصیت کے تحت موجود شاہ فیصل کو اس عہدے سے بری کر دیا تھا کہ وہ شاہ سعود کی زندگی میں تخت کا دعویٰ نہیں کریں گے۔

شاہ سعود نے شوریٰ کے اس فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے تخت سے دست برداری کا اعلان کیا، بیسویں صدی میں سلطان عبدالحمید خاں ثانی (۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء) کے بعد مسلم فرماں رواؤں میں تخت کی دست برداری کی یہ دوسری مثال ہے، جو شاہ سعودؒ نے پیش کی۔

۱۹۶۴ء کے اواخر میں علماء و شیوخ نجد و حجاز کے ایک اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ

شاہ سعود اپنے چھوٹے بھائی امیر فیصل کے حق میں دست بردار ہوجائیں، یہ فیصلہ درست تھا یا نہیں، البتہ یہ بات اس کے بعد عام ہوئی کہ بعض علماء اس فیصلے پر نادم ہوئے، شاہ سعود اگر چاہتے تو اس فیصلہ کے خلاف اقدام کر سکتے تھے، کامیابی اور ناکامی کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا، البتہ یہ بات یقینی تھی کہ اگر شاہ سعود اس فیصلے کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تو متعدد طبقات کی حمایت انہیں حاصل ہوتی مگر انہوں نے اسے سعودی خاندان، سعودی حکومت کے حق میں مفید خیال نہ کیا اور حرمین شریفین کے خادم ہونے کی حیثیت کے شایان شان نہ سمجھا کہ وہ خود اختلاف وانشقاق کی وجہ بنیں، وہ چپکے سے دست بردار ہوئے اور بغرض علاج یورپ تشریف لے گئے۔

جب ان کی صحت قدرے ابتر ہوئی تو ان کی تمنا تھی کہ وہ حجاز واپس تشریف لے آئیں اور بعض ذرائع کے مطابق انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ وہ مکہ مکرمہ میں رہائش رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ بقیہ ایام بیت اللہ کے جوار میں گزاریں مگر جیسا کہ دنیا بھر کا رواج ہے کہ سیاسی متوقع خطرات کو دوسرے جذبات پر ترجیح دی گئی اور شاہ مرحوم کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

ادھر سے مایوس ہوکر شاہ نے دوسرے عرب ممالک کی جانب توجہ مبذول فرمائی، آخر کار مصر تشریف لے گئے، صدر ناصر سے شاہ کے تعلقات تو عرصہ ہوا بحال ہو چکے تھے اور دونوں کے مزاج میں عظیم تفاوت موجود تھا، بایں ہمہ شاہ نے اپنے زمانہ قیام مصر میں اپنے فطری جذبہ جود وسخا کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے جلاوطنی کے باوجود خطیر رقم صدر ناصر کے حوالہ کردی۔

(بشکریہ المنبر لائل پور) (البلاغ مئی ۱۹۶۹ء)

مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری

۲؍جون ۱۹۷۷ء

۲؍جون ۱۹۷۷ء کو مولانا سراج الحق مچھلی شہری نے تقریباً ستر سال کی عمر میں انتقال کیا، اس وقت مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد میں مدرس تھے، علمی استعداد نہایت ٹھوس تھی، عربی شعر و ادب سے حصہ وافر رکھتے تھے، عربی اشعار بھی کہتے تھے، کئی کتابوں کے مصنف تھے، علم دین کے ساتھ روحانیت و مشیخت سے حصہ وافر رکھتے تھے، آخری ایام میں مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ سے متعلق ہو گئے تھے، نہایت مستعد پھرتیلے اور بے تکلف بزرگ تھے، علم و تحقیق سے شغف تھا، خاص طور سے اہل بیت اور مشاجرات صحابہؓ پر تحقیقی نظر رکھتے تھے، اور اس موضوع پر ان کی بعض تصانیف ہیں، جس زمانہ میں مولانا شاہ وصی اللہ صاحب بمبئی میں قیام فرماتے، مولانا سراج الحق صاحب اکثر ان کی خدمت میں رہا کرتے تھے، ان ہی ایام میں راقم کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور بڑی محبت سے پیش آتے تھے، مولانا مرحوم اس اعتبار سے بہت خوش قسمت تھے کہ ان کی اولاد میں کئی علماء و فضلاء ہیں جو خالص دینی و روحانی اور علمی زندگی بسر کرتے ہیں، اس دور میں علماء کی اولاد میں یہ خوش قسمتی معدوم ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

(البلاغ ۷۷ء)

سجاد حسین صدیقیؒ

۳؍جنوری ۱۹۸۶ء

۱۹۵۰ء میں بمبئی آنے کے تھوڑے دنوں بعد جن چند مخلصوں سے تعارف ہوا اور آخر تک تعلقات قائم رہے ان میں ہمارے مخلص دوست جناب سجاد حسین صدیقی مرحوم تھے جن کا انتقال ۲۱؍ربیع الثانی مطابق ۳؍جنوری ۱۹۸۶ء کو بمبئی میں ہوا۔ مرحوم کا وطن گونڈہ تھا۔ بسلسلہ تجارت بمبئی میں رہتے تھے۔ ادھر سالوں سے کرلا میں مستقل رہائش اختیار کرلی تھی۔

مرحوم صدیقی صاحب، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید بلکہ عاشق تھے، گویا حضرت کے خاندان کے ایک فرد تھے۔ بڑے دیندار، متواضع، بے تکلف اور خلیق آدمی تھے۔ دینی اور سیاسی امور میں عملی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے خلوص ومحبت اور وضع داری کی وجہ سے میں ان سے ملنے کے لیے کرلا جایا کرتا تھا۔ اور وہ گویا فرش بن جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ ہم لوگ اپنے مخلص قدر دانوں کو دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کے علاوہ کیا تحفہ دے سکتے ہیں؟

(انقلاب ممبئی ۱۵؍مارچ ۱۹۸۶ء)

ڈاکٹر سیف الدین کچلو

افسوس کہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے ۷۵؍سال کی عمر میں دہلی کے ایک ہسپتال میں ۹؍اکتوبر کو وفات پائی، ادھر پچھلے چند سالوں سے وہ اس قدر گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ان کی موت کی خبر سے بہت لوگوں کو معلوم ہوا کہ ابھی تک وہ زندہ تھے، کیا دنیا ہے اور دنیا کی شہرت ہے، وہ ہندوستان کی امن کونسل کے صدر تھے، اور عالمی امن نوبل پرائز پاکر اس سلسلہ میں خدمات انجام دینے کا تمغہ پاچکے تھے، بالفاظ دیگر امن وخاموشی کی دنیا میں گم ہوکر گوشہ گمنامی کی صدارت کررہے تھے، ورنہ ایک زمانہ تھا کہ ڈاکٹر سیف الدین ہندوستان کی سیاست میں صف اول کے لیڈروں میں مانے جاتے تھے، اور یہاں کا بچہ بچہ ان کے نام وکام سے واقف تھا، انہوں نے بڑی آن بان سے پنجاب کانگریس کی مدتوں صدارت کی اور پنجاب کے عوام وخواص کے محبوب لیڈر رہ کر ہندوستان گیر سطح پر کام کیا۔ (انقلاب بمبئی)

مولانا سراج منیرؒ غازی پوری

علمی حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مولانا عبدالمتین غازیپوری کے صاحبزادے مولانا سراج منیر ڈائرکٹر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور انتقال کر گئے۔ رحمہ اللہ علیہ وغفرلہ

مولانا سراج منیر مرحوم کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی، وہ قدیم وجدید کے جامع عالم ومحقق اور نہایت ذی استعداد اور ذہین تھے۔ سعودی عرب میں کسی اہم علمی عہدہ پر تھے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے لیے جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے ان کو بلایا تو اس شرط پر سعودی عرب سے آئے کہ ان کے علمی معاملات میں دخل نہیں دیا جائے گا۔ اور وہ اپنے ذوق وشوق اور مرضی کے مطابق اس علمی وتحقیقی ادارہ کو چلائیں گے۔

تنظیم فکر ونظر سندھ نے میری پانچ کتابوں کی اشاعت اور ان کی تعارفی تقریب کے سلسلہ میں ۱۰/اگست ۱۹۸۶ء کو تاج محل ہوٹل کراچی میں زیر صدارت جناب سید غوث علی شاہ وزیر اعلیٰ سندھ ایک شاندار جلسہ کیا۔ جس میں پاکستان کے بڑے بڑے علماء ومحققین کو کتابوں پر اظہار خیال کے لیے دعوت دی، ان ہی میں مرحوم جناب سراج منیر صاحب بھی تھے۔ نہایت سادہ طبیعت، علم دوست آدمی تھے۔ بے تکلف وسادگی میں دیار یورپ کے علماء کا نمونہ تھے۔ میری کتابوں پر اتنی مرصع، جامع پر مغز اور فصیح وبلیغ تقریر کی کہ حاضرین ششدر رہ گئے۔ اس تقریب کی مناسبت سے ان سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے والد میرے رشتہ کے ماموں مولانا محمد شعیب صاحب مرحوم مدرس ومفتی مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور کے غالباً شاگرد تھے، جس کی نسبت سے ہم دونوں میں بڑی انسیت رہی، یہی ان سے میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور جوار رحمت میں جگہ دے۔

وزیراعلیٰ سندھ نے اپنی تقریر میں ان کی تقریر سے متاثر ہوکر کہا کہ صاحبو! پہلے ایک واقعہ سن لو: میں لندن میں ایک انگریز دوست سے ملا، اوراس سے انگریزی میں بات شروع کی تو اس نے اردو میں جواب دیا اس پر مجھے غیرت معلوم ہوئی کہ اپنی زبان نہیں بول رہا ہوں، اور یہ انگریز میری زبان بول رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے اردو میں گفتگو شروع کی تو اس انگریز نے کہا کہ آپ سندھی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی اردو میں سندھی لب ولہجہ ہے۔ تو صاحبو! جناب سراج منیر کی شاندار اردو میں تقریر کے بعد میری تقریر سندھی اردو میں ہوگی۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا سیف اللہ مرزا صاحب

بہت دنوں سے صاحب فراش رہ کر مولانا سیف مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے رب سے جا ملے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

۱۹۵۰ء میں راقم بمبئی آیا اس وقت جمعیۃ علماء مہاراشٹر میں اس کے فدائیوں کا ایک گروہ تھا، جس میں مولانا حکیم اعظمی، مولانا عبدالعزیز بہاری، مولانا سیف اللہ صاحب مرزا، طاہر انصاری، محمد بیگ چغتائی، مولانا دوست محمد نمایاں تھے، اور سب کے سب اللہ کو پیارے ہو گئے، اس قافلہ کے آخری رہرو مولانا سیف اللہ مرزا تھے، وہ بھی چلے گئے، یہ سب جمعیۃ علماء کے فدائی وشیدائی تھے، مولانا سیف اللہ صاحب اپنی خوش خلقی، وضع داری، اور سادگی، میں سب سے نرالے تھے، قناعت کے ساتھ سخاوت ان کے خمیر وضمیر میں تھی، ادھر چند سالوں سے زندگی کے آخری دن گذار رہے تھے، رمضان میں راقم حاضر ہوا تو ملاقات کو جی چاہا، مگر معلوم ہوا کہ ان کے ہوش وحواس اب بجا نہیں رہتے ہیں، اور پہچاننا بھی مشکل ہو گیا، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ (انقلاب بمبئی)

سلیم پونوی چشتی

۱۹۵۲ء

افسوس کہ مہاراشٹر کے مشہور شاعر حضرت سلیم چشتی پونوی اپنے وطن پونہ میں باون برس کی عمر میں انتقال کر گئے، مرحوم کی ذات سے مہاراشٹر کا تاریخی مقام پونہ شعروادب کا مرکز بن گیا تھا، اور ان کی وجہ سے پونہ اور اطراف میں اچھے اچھے شاعر پیدا ہو گئے تھے، مرحوم کا ایک دیوان بھی ہے، جو اب سے کئی سال پہلے شائع ہو چکا ہے، سلیم پونوی کا آبائی وطن مشرقی یوپی کا مردم خیز مقام اعظم گڈھ تھا، ان کے آباء واجداد صدیوں پہلے ترک وطن کر کے پونہ میں آباد ہو گئے تھے، دعا ہے کہ ان کو جوار رحمت میں جگہ دے، اور سجی سجائی محفل شعروادب برپا رہے۔

(انقلاب بمبئی ۳۰ جولائی ۱۹۵۲ء)

فخر مشرق حضرت شفیق جونپوریؒ

۶/مارچ ۱۹۶۳ء

افسوس کہ شوال المکرّم کے پہلے عشرہ میں ۶/مارچ ۱۹۶۳ء کی شام کو شیرازِ ہند پورب کا چراغ شعروادب گل ہوگیا یعنی فخر مشرق حضرت شفیق جونپوریؒ نے انتقال فرمایا، اللهم اغفرله وارحمه۔

حضرت شفیق جونپوریؒ ہماری علمی وادبی بزم اخلاق وانسانیت کے چراغ سحری تھے، ان کی ذات سے محفل دوشیں کی یاد باقی تھی مگر افسوس کہ ان کی آنکھ بند ہونے سے وہ بھی ختم ہوگئی۔ مرحوم بلند پایہ شاعر اور بلند کردار انسان تھے، ان کے شعروادب کے ہر صنف کا محور اخلاق وانسانیت اور دین وایمان تھا۔ ان کو پہلی مرتبہ سننے اور دیکھنے کا اتفاق اعظم گڑھ کے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں ہوا۔ اسی میں حضرت احسان دانش کو دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ کچھ ایسا مبارک موقع تھا کہ بعد میں دونوں حضرات سے انتہائی مخلصانہ تعلق قائم ہوگیا۔ دوسری بار یوسف پور محمد آباد کالج غازیپور کے ایک نعتیہ مشاعرہ میں شرکت کے موقع پر کئی دنوں تک ان سے ملاقات رہی، تیسری بار بہت قریب سے دیکھنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس سہارنپور میں ۱۹۴۶ء میں ہوا، جب کہ راقم لاہور سے اخبار زمزم کے ایڈیٹر اور نمائندہ کی حیثیت سے آیا تھا۔ ان میں سے ہر ملاقات تعلقات کو حسین سے حسین تر بناتی رہی تھی، حتیٰ کہ حضرت شفیق مرحوم پہلی مرتبہ حج کو جاتے ہوئے ہفتوں بمبئی میں مقیم رہے اور مجھے ان کی تیمارداری کا موقع ملا، مرحوم نے اپنے سفرنامہ حجاز میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس کے بعد ملاقاتیں تو کم رہیں مگر خط وکتابت اور دوسرے کو پڑھنے اور سمجھنے کے مواقع بہت زیادہ ملتے رہے۔ حتیٰ کہ انتقال سے دو تین ماہ

پیشتر مرحوم نے بستر مرگ سے مجھے لکھا ہے کہ بمبئی سے مبارکپور جاتے ہوئے آپ ہمیشہ جونپور سے گزرتے ہیں مگر کبھی مجھ مریض ناتواں سے ملاقات نہیں کرتے۔ یہ جفا ہے میری زندگی کے دن بہت تھوڑی رہ گئے ہے، ایک مرتبہ مل لیجئے بمبئی والوں سے اچھا کھلاؤں گا اوران سے زیادہ خلوص سے میزبانی کروں گا۔ افسوس کہ راقم کئی بار جاتے جاتے رہ گیا، حتیٰ کہ حضرت شفیق دنیا ہی سے تشریف لے گئے۔

شفیق جونپوری کا نام ولی الدین تھا مولانا یعقوب صاحب انیق کے صاحبزادے تھے، جو خود بھی بہت بلند پایہ شاعراور بزرگ تھے، ان کے نانا حافظ محمد صدیق مرحوم اپنے وقت کے اکابرین میں سے تھے اور مشائخ جون پور میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شفیق جون پوری صرف ایک بلند پایہ خوش گو شاعر ہی نہیں تھے بلکہ باعمل عالم دین، عربی کے فاضل اور حافظ قرآن بھی تھے۔ ان کی شاعری اسلامی شاعری تھی، ان کے دم سے اسلام کی عظمت زندہ وتابندہ تھی اوران کا خاص وصف اورامتیاز دردوسوز تھا، جوان کی ہر صنف شاعری کے حرف حرف میں نمایاں تھا، پڑھنے کا انداز بھی بڑادلگیر اور پُر دردتھا، جب وہ مشاعرہ میں اپنے پُرسوز انداز میں پڑھتے اور خود وجد وکیف میں آکر ایک ایک شعر کو بار بار پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے دل کی گہرائی مجمع کو اپنے اندر سمیٹ رہی ہے اور زاہد ان خشک سے لے کر رندان بلانوش تک تڑپ جاتے تھے، شفیق کی خودداری کے ساتھ ساتھ غربت اور سب سے بڑھ کر صاحب زادے صلاح الدین کی جوان موت نے ان کو مجسم صبر وشکر بنادیا تھا اور وہ دردوکرب کی جلتی پھرتی تصویر بن گے تھے، اس کے باوجود انہوں نے اپنی شاعری کو بستر مرگ پر بھی اپنے پہلو میں رکھا اوراس سے جدا نہیں ہوئے۔ زمانہ کی بے اعتنائی اور معاصرت کی ناگواری نے بھی شفیق کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا مگر وہ اپنی سخت جان شاعری سے وابستہ رہے۔

حضرت شفیق قنوطی شاعر نہیں تھے بلکہ دردوسوز کی تصویر تھے اوران کے شعر ونغمہ دونوں کے لیے یہی چیز باعث فخر وامتیاز تھی۔

آخر میں حکومت یوپی نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ماہانہ وظیفہ جاری کردیا تھا، شفیق جون پوری کے کئی دیوان ہیں، غیر مطبوعہ اشعار بھی ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے

تلامذہ اور قدرداں ان کو اچھے انداز میں ملک کے سامنے پیش کریں، حضرت شفیق نے اپنے بارے میں اپنی زندگی ہی میں لکھ دیا تھا:

اکیلا ہوں مگر آباد کر دیتا ہوں ویرانہ
بہت روئے گی میرے بعد مجھ کو شام تنہائی

(انقلاب ممبئی ۱۴؍مارچ ۱۹۶۳ء)

مولانا شبلی متکلم بھوری

۳۰ دسمبر ۱۹۷۳ء

۵؍ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ مطابق ۳۰؍دسمبر ۱۹۷۳ء اسی دوران ہمارے ضلع بلکہ وطن کے عالم مولانا شبلی متکلم نے انتقال کیا ان کی عمر اسی سال کے لگ بھگ رہی ہوگی، وہ علامہ شبلی نعمانی کے خاص شاگردوں میں سے تھے ان کا وطن مبارک پور سے متصل تھا،[۱] زندگی کا زیادہ حصہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر کی مدرسی میں گزار کر وہ حجۃ اللہ البالغہ جیسی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے اور اپنے حلقے میں متکلم کے لقب سے مشہور تھے، اخلاق میں سادگی اور بے تکلفی تھی، علم دوست تھے، اللہ تعالیٰ مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین۔

(البلاغ فروری ۱۹۷۴)

آپ کے گاؤں کا نام بھور ہے جو مبارکپور سے جانب مغرب تین کلومیٹر دوری پر واقع ہے اور صاحب (تدبر قرآن) مولانا امین احسن اصلاحی بھی اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ مرتب

شکر القواتلی صدر جمہوریہ عربیہ سوریہ

۱۶؍جولائی ۱۹۶۷ء

جون کی آخری تاریخوں میں شام کے سابق صدر شکر القواتلی انتقال کر گئے۔ یہ وہی شام کے مرد آہن تھے جنھوں نے شام کی آزادی میں برطانوی استبداد کا بے پناہ مقابلہ کیا تھا۔ اور اس کی آزادی کے بعد اس کے پہلے صدر بنائے گئے تھے انھوں نے عرب ممالک میں اتحاد و اتفاق کے لیے شام کا الحاق مصر کے ساتھ کر کے جمہوریہ عربیہ متحدہ مصر و شام بنائی تھی۔ اور اپنی تمام شان و شوکت ختم کر کے شام کی قسمت کو مصر سے وابستہ کر دیا تھا۔ مگر یہ اتحاد قائم نہ رہ سکا۔ اور دونوں میں علیٰحدگی ہو گئی۔ شکر القواتلی اس زمانہ میں ہندوستان بھی تشریف لائے تھے۔ بمبئی میں ان کے استقبال میں ایک جلسہ کیسر باغ میں بھی ہوا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد جلد ہی مصر و شام کا الحاق ہوا، اور شکر القواتلی یوں کنارہ کش ہو گئے یا کر دیے گئے کہ اس کے بعد سے کہیں نام تک نہیں آتا تھا یہاں تک اب ان کے انتقال کرنے کی خبر آئی اور معلوم ہوا کہ وہ گمنامی کے عالم میں اس راہ سے گذر گئے۔ جس سے بڑے بڑے نامور گذر کر گم نام و بے نشان ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(انقلاب (وفات ۱۶؍جولائی ۱۹۶۷ء)

حافظ شمس الحق صاحبؒ

جناب حافظ شمس الحق صاحب اعظمی کے شاگردوں اور دوستوں کو یہ جان کر سخت صدمہ ہوگا کہ موصوف آخری جہاز سے حج کے لیے تشریف لے گئے تھے مگر جہاز ہی پر بیمار پڑے، اور جدہ کے اسپتال میں ۶؍ذوالحجہ کو انتقال کر گئے۔ اللھم اغفر له وارحمه.

مرحوم ندوہ سرائے اعظم گڈھ کے رہنے والے اور مرحوم حکیم اعظمی صاحب کے نسبتی بھائی تھے۔ ایک زمانہ سے بمبئی میں رہ کر تدریسی اور دینی خدمات انجام دیتے تھے، متشرع خلیق، بے نفس اور بے تکلف آدمی تھے، خودداری اور بلند کردار کا نمونہ تھے۔ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ سے روحانی نسبت رکھتے تھے، اور اپنے مرشد ہی کی طرح حج کو جاتے ہوئے انتقال کیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین (انقلاب) ممبئی)

مولانا شریف الحسن صاحب

شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند
۵/جون ۱۹۷۷ء

پچھلے ماہ ہندوستان کے کئی اربابِ علم وفضل کے وصال سے ہمیں دوچار ہونا پڑا جن کا وجود بہرحال بساغنیمت تھا، اور جن کے فیض سے مسلمان مستفیض ہورہے تھے۔

۵/جون ۱۹۷۷ء کو مولانا شریف الحسن صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے تقریباً ستر سال کی عمر میں انتقال کیا یوں تو مرحوم جملہ متداول علوم وفنون میں پختہ استعداد رکھتے تھے، اورسب ہی کو بلاتکان پڑھاتے تھے، مگر علم حدیث سے ان کو خاص شغف وتعلق تھا۔ اسی لئے جب حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحبؒ کے وصال کے بعد دارالعلوم دیوبند میں بخاری شریف پڑھانے کا مرحلہ پیش آیا۔ یہ خدمت مولانا شریف الحسن صاحب کے حصہ میں آئی اور انہوں نے پورے حقوق کے ساتھ اسے پڑھایا نہایت چاق و چوبند اور مستعد آدمی تھے۔ تقویٰ وطہارت میں اکابر کا نمونہ تھے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے زمانہ قیام میں ان سے ملاقات رہا کرتی تھی۔ اور بڑے اخلاق ومحبت سے پیش آتے تھے، اس کے بعد اگرچہ ملاقات اور خط وکتابت کا موقع نہیں ملا، مگر جب بھی کوئی موقع آیا خاص خیال رکھا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت ومغفرت سے نوازے۔ اوراعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین۔

(البلاغ جولائی ۱۹۷۷ء)

مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاریؒ

۲۲ر دسمبر ۱۹۸۵ء

بہار کی سرزمین سے آخری دور میں چند نامور علماء پیدا ہوئے ان میں جناب مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی علم وفضل، تقویٰ طہارت، دینی وعلمی خدمت، نیک نفسی، تدریس وتعلیم، تصنیف وتالیف، ارشاد وتبلیغ اور دیگر دینی وعلمی کارناموں کی وجہ سے خاص مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ افسوس کہ علم وعمل کا یہ چراغ دوشنبہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو کلکتہ کی سرزمین میں چھپ گیا۔ رحمہ اللہ وغفر لہ۔ نماز جنازہ جناب مولانا حکیم محمد زماں صاحب حسینی نے پڑھائی۔ عام اندازہ کے مطابق جنازہ میں تیس چالیس ہزار مسلمان شریک تھے۔ جو مولانا مرحوم کی عند اللہ وعند الناس مقبولیت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

مولانا مرحوم نے نام ونمود سے نفور اور شہرت وناموری سے دور رہ کر پوری زندگی دینی و علمی خدمات میں بسر کی۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا خاکہ ناظرین کے سامنے آجائے، آپ ۱۹۱۲ء میں بہار شریف میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا حکیم امیر حسن صاحبؒ سے حاصل کی، اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے خسر مولانا اصغر حسن صاحبؒ پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد مدرسہ قومیہ میں داخل ہو کر سند حاصل کی، پھر مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں داخلہ لیا، ان دنوں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم بھی اسی مدرسہ میں زیر تعلیم تھے۔ دونوں حضرات کی دوستی یہیں سے شروع ہوئی، اور آخری وقت تک قائم رہی، آخر میں دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے، یہاں ایک سال رہ کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت (گجرات) چلے گئے، اور وہیں سے سند فراغت پائی، آپ کے اساتذہ میں مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مشہور ادیب مولانا ابو عبد اللہ بن یوسف سورتی ہیں، مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانیؒ سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔

فراغت کے بعد وطن آ کر مدرسہ قومیہ میں تعلیم و تدریس میں لگ گئے، اسی کے ساتھ سیاسی اور ملی وقومی تحریکات میں حصہ لیتے رہے، سیاست میں کانگریس کمیٹی میں رہ کر کام کیا، مگر ۱۹۴۷ء کے بعد عملاً اس سے علیحدہ ہو گئے۔

۱۹۴۸ء میں امام بیہقیؒ کی مشہور و معروف کتاب معرفۃ السنن والآثار کا پہلا حصہ تعلیق و تصحیح کے بعد شائع کیا، ۱۹۴۹ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں حدیث و تفسیر کے استاذ مقرر ہوئے اور اس عہدہ کو نہایت ذمہ داری اور قابلیت کے ساتھ پورا کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہوئے، اس کے بعد ادارۂ ترجمہ و تالیف کی بنیاد رکھی اور اس ادارہ سے امام ابن قتیبہؒ کی کتاب المعارف سے سیرۃ الرسول کا اردو ترجمہ مفید حواشی کے ساتھ شائع کیا اور دیگر کتابیں بھی اس ادارہ سے شائع کیں، ۱۹۵۰ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مضامین کا مجموعہ سید صاحب کے دیباچہ کے ساتھ شائع کیا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۵ء تک خلافت کمیٹی کلکتہ کے زیر اہتمام عیدین کی امامت فرمائی، وعظ وخطابت میں خاص ملکہ رکھتے تھے، ان کی تقریر عالمانہ اور پر مغز ہونے کے ساتھ بڑی دلچسپ ہوتی تھی اس لئے عوام وخواص دونوں طبقے ان کی تقریر کے شیدائی تھے، زورِ بیان اور طرز خطابت میں امتیاز حاصل تھا، بڑے بڑے دینی جلسوں میں ان کی شرکت ہوتی تھی، اسی کے ساتھ کلکتہ کی مختلف مسجدوں میں درس قرآن دیا کرتے تھے، ان میں ٹیپو سلطان کی شاہی مسجد، شاہی مسجد، چترنجن ایونیو کی مسجد، راجہ بازار کی مسجد اور سبزی منڈی کی مسجد میں درس قرآن کی بڑی اہمیت و افادیت تھی۔ حال کی بات ہے کہ جب کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن مجید کے خلاف ایک اسلام دشمن نے مقدمہ دائر کیا تو مولانا کی تحریک پر عالموں، دانشوروں اور مسلم وکیلوں نے دفاع قرآن کمیٹی قائم کی، جس نے بروقت مسلمانوں کی رہنمائی کی، مولانا مرحوم نے دفاع قرآن کمیٹی کو بیس ہزار روپیہ کی کتابیں عنایت فرمائیں۔ جن کو فروخت کرنے کے بعد بیس ہزار کی رقم دفاع قرآن کمیٹی میں جمع ہوگئی، مولانا قرآن کے نام پر عام چندہ کرنے کو سخت ناپسند کرتے تھے

ادارۂ ترجمہ و تالیف کو بغیر کسی سے چندہ کیے نہایت کامیابی کے ساتھ چلایا اور کئی اہم اور مفید کتابیں شائع کیں، اس ادارہ سے مسلمانوں کی اصلاح اور شرک و بدعت کے سلسلہ میں

کئی پوسٹر شائع کیے۔

مولانا تقریر کی طرح تحریر میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، ان کو تصنیف و تالیف کا نہایت ستھرا ذوق تھا، ان کی تصنیفات میں (۱) یکساں سول کوڈ اور اس کا اسلامی احکام پر اثر (۲) ختم رسالت اور قادیانی فتنہ (۳) اکبر کا دین الٰہی (۴) حجۃ الوداع (۵) تعلیمات قرآن، وغیرہ قابل ذکر کتابیں ہیں عیدین کے خطبے بھی شائع کرتے تھے، پیغام عمل کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالتے تھے۔

یوں تو مولانا مرحوم جملہ اسلامی علوم وفنون کے عالم تھے اور مروجہ علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مگر ان کو علم حدیث سے عشق کی حد تک تعلق تھا، اس میں خاص استناد کا درجہ رکھتے تھے اور ان کے علمی و تصنیفی کارناموں میں علمِ حدیث کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

حضرت امام بیہقی کی نادر و نایاب اور نہایت اہم کتاب معرفۃ السنن والآثار کو اپنی تصحیح و تعلیق سے شائع کرنا چاہتے تھے، اور اس کا پہلا حصہ خود چھاپ کر شائع بھی کیا، مولانا نے اس کے چند نسخے میرے پاس بمبئی میں بھیجے تھے، میں نے اس کا ایک نسخہ مولانا ابوالوفا افغانیؒ رئیسِ لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد کو بھیجا تو مولانا نے حدیث کے اس نادر و نایاب تحفہ پر بڑے والہانہ انداز میں شکریہ ادا فرمایا تھا، امام حزم ظاہر متوفی ۴۵۶ھ کی کتاب اسماء الصحابۃ الرواۃ و مالکل واحد من العدد بھی اپنے اہتمام سے شائع کی۔ رسالہ بُرہان ۱۹۵۰ء میں امام دارقطنی پر تین چار قسطوں میں مضمون شائع کیا ''ہندوستان میں علم ''حدیث کی تالیفات'' کے نام سے ۱۹۵۳ء میں رسالہ بُرہان میں پانچ قسطوں میں مقالہ شائع کیا۔ ۱۹۶۶ء کے رسالہ بُرہان میں مسند امام احمد پر ایک طویل مقالہ سپرد قلم فرمایا اور ۱۹۷۴ء کے بُرہان میں امام شافعی کی ''کتاب الاُم'' پر محققانہ مضمون لکھا۔ اس طرح مولانا نے بہت سے خالص و تحقیقی مقالات تحریر کیے جن میں علم حدیث سے متعلق اہم معلومات ہیں۔

۱۹۶۶ء میں مولانا حج و زیارت کو تشریف لے گئے، راقم بھی اسی سال حاضریٔ حرمین شریفین سے مشرف ہوا تھا۔ اس مبارک سفر میں مولانا مرحوم سے پہلی ملاقات ہوئی جو نہایت مخلصانہ اور دیر پا رہی۔ اس سفر میں ان کی شفقت و محبت، ان کا خلوص و ایثار ان کی سادگی و نںک

نفسی، اوران کا علمی شغف بہت قریب سے دیکھنے میں آیا اور مولانا کی شخصیت نے اپنا گرویدہ بنالیا۔ ہم دونوں حرمین شریفین کے کتب خانوں میں ایک ساتھ جاتے۔ مولانا علم حدیث سے متعلق مخطوطات ونوادرات سے اخذ واقتباس فرماتے اور راقم اپنے موضوعات سے متعلق معلومات جمع کرتا تھا۔ اس وقت تک مکہ مکرمہ کے مشہور عالم سید علوی مالکیؒ حیات تھے، ہم لوگ ان کی خدمت میں بھی حاضرب ہوتے تھے، ان کے صاحبزادے ڈاکٹر محمد حسن علوی مالکیؒ نے مولانا مرحوم سے حدیث کی سند بھی لی تھی، مدینہ منورہ میں شیخ الاسلام کتب خانہ عارف حکمت میں ہم دونوں صبح سویرے ہی پہنچ جاتے اور ظہر کی نماز کے وقت وہاں سے نکلتے تھے۔ واپسی کے بعد مولانا نے ادارۂ ترجمہ وتالیف قائم کیا تو راقم کو بھی اس کا رکن بنایا تھا۔

اس کے بعد پھر ایک بار بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی اور وہی خلوص ومحبت، وہی یگانگت اور وہی عالمانہ انداز تھا، مگر یہ ملاقات بہت مختصر رہی، ادھر بہت دنوں سے کلکتہ جانے اور مولانا مرحوم اوران کے بعض دوسرے احباب سے ملاقات کرنے کا ارادہ ہورہا تھا کہ اچانک ایک دن اخبار میں مولانا کے وصالِ پُرملال کی خبر پڑھی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اوران کے درجات بلند کرے، اوران کے صاحبزادے مولوی ابوطلحہ صاحب ندوی کوان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اوروہ اپنے والد مرحوم کی طرح دینی وعلمی زندگی کے وارث ہوں۔ آمین

(ماہنامہ برہان دہلی)

شعیب قریشی اور حمید نظامی

گذشتہ دنوں پاکستان کی چند ایسی شخصیتوں کا انتقال ہوا، جو ہندو پاکستان کی مشترکہ دولت کی حیثیت رکھتی تھیں، اور تقسیم سے پہلے ان کی حیثیت ہر جگہ مسلم تھی، جن میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث و مفسر کی ذات گرامی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بہت ہی اہم تھی، مرنے والوں میں دوسری شخصیت مرحوم شعیب قریشی کی تھی، جو پاکستان کے بنیادی ستون کی حیثیت رکھتے تھے، اور قیام پاکستان کے بعد انھوں نے نہایت ذمہ داری اور اخلاص سے اپنے ملک کی خدمت میں حصہ لیا، مرحوم ہندوستان کے مشہو صحافی اور اخبار نویس بھی تھے، اور اس اعتبار سے ان کے بعد صحافت میں بھی خلا پیدا ہو گیا ہے۔

ان ہی ایام میں مشہور اخبار نوائے وقت لاہور کے ایڈیٹر جناب (حمید نظامی) کا بھی انتقال ہوا نظامی مرحوم اردو صحافت میں اپنی بے باکی اور نڈری میں بہت مشہور تھے، مارشل لا کی حکومت کے دور میں بھی انھوں نے بے باکی اور حق گوئی سے پوری جرأت کے ساتھ کام لیا، اور صحافت کی ذمہ داری کو دیانت داری سے نباہا، ان کے یہاں بے جا چاپلوسی اور بیکار مصلحت کام نہیں کرتی تھی، بلکہ ان کا قلم حقیقت رقم تھا، اور انھوں نے اخبار نویسی کے فن پر حرف نہیں آنے دیا، اللہ تعالیٰ تمام مرحومین پر اپنا رحم فرمائے۔ (انقلاب ۱۳؍ مارچ بمبئی)

مولانا شاہ عزالدین مجیبی پھلواروی

مئی میں مولانا شاہ عزالدین مجیبی پھلواری نے انتقال کیا جو بہار کے مشہور علماء اور روحانی خانوادۂ مجیبی کے سلسلہ کے بزرگ تھے۔ وہ روحانیت و مشیخت کے ساتھ علم و تحقیق سے وافر حصہ رکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، عربی دانی پر حکومت ہند سے ان کو وظیفہ ملتا تھا۔ ان کے واعظ میں بڑی دلکشی اور تاثیر تھی۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

علمی حلقوں میں یہ خبر نہایت غم واندوہ کے ساتھ سنی گئی کہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کے ناظم مجلّہ ''معارف'' کے مدیر اور بہت سی ادبی، تاریخی اور علمی کتابوں کے عالمی شہرت یافتہ عالم و محقق اور مورخ و ناقد سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ۱۸/نومبر کو لکھنؤ میں ایک حادثہ میں انتقال کر گئے، اور ان کو دارالمصنفین میں علامہ شبلیؒ کے پہلو میں دفن کیا گیا، رحمہ اللہ وغفرلہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن تقریباً ۵۳/سال تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے، مولانا شاہ معین الدین ندوی کے انتقال کے بعد ناظم ہوئے، ان کے دور نظامت میں دارالمصنفین میں دو عالمی سیمینار اور اجلاس ہوئے، مرحوم ہندوستان کی تاریخ خاص طور سے مغل دور کے عظیم مورخ تھے، اور انھوں نے اس موضوع پر بہت سی محققانہ کتابیں تصنیف کیں ان کی آخری کتاب بابری مسجد کی تاریخ ہے، جو اپنے موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے، تاریخ وتنقید ان کا خاص موضوع تھا، جس پر انھوں نے خوب خوب قلم کی جولانی دکھائی، اور تحقیقات کا انبار لگایا، تقریباً ۷۷/سال کی عمر پائی، اس عمر میں علمی و تصنیفی اشغال کا یہ حال تھا کہ معارف کے شذرات، کتابوں کی تلخیص، مستقل تصنیف کے علاوہ علمی و تحقیقی سیمیناروں میں شرکت اور دوسرے علمی کاموں میں ہمہ وقت مصروف رہا کرتے تھے، سید صاحب مرحوم سے راقم کے علمی تعلقات بڑے خوش گوار اور استوار تھے،

دو بار ان کی معیت میں علمی سفر ہوا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، اور جنت الفردوس میں ان کو جگہ دے۔ (انقلاب بمبئی)

حضرت قاری ضیاء الدینؒ

تمام عالم اسلام کے لیے یہ خبر نہایت حزن و ملال کا باعث ہے کہ سرزمین ہند میں فن قرأت و تجوید کے مسلم امام حضرت قاری ضیاء الدین صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں مختصر علالت کے بعد وصال فرما گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون

قرآن حکیم کی تجوید قرأت میں حضرت مرحوم ہندو پاکستان کے حلقوں میں آفتاب کی طرح روشن تھے، موصوف استاذ القراء والحفاظ حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب مکی نوراللہ مرقدہ کے تلمیذ خاص اور جانشین تھے، قاری ضیاء الدین صاحب سے ہزاروں حافظوں اور قاریوں نے فن تجوید کو حاصل کیا، آپ ہندوستان میں اس فن شریف کی آخری سند تھے، آپ کے شاگرد اور جانشیں ہندستان و پاکستان اور دنیا کے دوسرے ممالک میں پھیلے ہوئے فن کی خدمت کر رہے ہیں، اس ماہر فن کی رحلت کے بعد دس کروڑ اسلامیوں میں اس فن میں کوئی دوسرا قاری ان کے ہم پلہ نظر نہیں آتا، افسوس کہ اس متبرک فن سے ہماری دن بدن نابلدی کے عالم میں ہم سے اس کی آخری سند بھی چھن لی گئی، مرحوم کا وصال ایک عظیم الشان ملکی حادثہ ہے، جسے دس کروڑ مسلمانوں کی محرومی بڑی کراہ کے ساتھ برداشت کرر رہی ہے۔

(انقلاب ۲۳ / جنوری بمبئی)

حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء

حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، علم وفضل، ارشاد وتبلیغ، اخلاق وعادات، درس وتدریس، حلم وصبر، نظم وضبط، تصنیف وتالیف، حکمت وموعظت، تقویٰ وطہارت اور دیگر علمی و دینی وذاتی اوصاف وکمالات میں اپنے دور کے فرد واحد تھے، عوام وخواص میں مقبولیت و محبوبیت اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے جو مستحقین ہی کو ملتا ہے۔ حضرت قاری صاحب اپنے اوصاف جمیلہ کی وجہ سے فضل خداوندی کے بہترین مستحق تھے، پورے عالم اسلام میں ان کو جو مقبولیت ومحبوبیت حاصل تھی، اس میں ان کے معاصرین میں کوئی شریک وسہیم نہیں ہے، حد یہ ہے کہ ان کے مخالفین بھی ان کے ادب واحترام میں بخل نہیں کرتے تھے۔

وہ علمائے دیوبند کے اصلاحی وعلمی ودینی تحریک کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے، بلکہ اس حلقہ کے آخری ترجمان تھے ان پر اس جماعت کا ایک دور ختم ہو گیا اور اس کی جملہ خصوصیات اب کسی ایک ذات میں باقی نہیں رہیں۔

حضرت قاری صاحب کی عام خدمات اور ان کے ثمرات سے صرف نظر کر کے اگر صرف دارالعلوم دیوبند کی کم وبیش ۵۰ر سالہ خدمات ہی سامنے رکھی جائیں تو دینی وعلمی خدمت کا ایک طویل سلسلہ نظر آئے گا جس کے نتیجہ میں داراالعوم دیوبند واقعی از ہر ہند بن گیا اور مسلمانانِ عالم کی قدیم ومشہور درسگاہوں جامع زیتون، جامع قروین، جامعہ از ہر وغیرہ میں اس کا شمار ہونے لگا۔ انہوں نے ''مدرسہ عربیہ دیوبند'' کو زندگی کا مقصد قرار دے کر دارالعلوم واقعی معنی میں بنایا، ان کا یہ کارنامہ علمی دنیا میں عظیم کارنامہ ہے، جو اُن کی عظمت کے لئے کافی ہے۔

حضرت قاری صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھنا باقی ہے، مجھے اس وقت ایک واقعہ ایک بیان کرنا ہے۔ میری ان کی آخری ملاقات فتنہ کے عین شباب میں بمبئی میں حضرت قاری صاحب کے خادم خاص ماسٹر چودھری عزیز الحق صاحب آسامی کے مکان پر ہوئی اس زمانہ میں حضرت قاری صاحب افکار و صدمات کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ نقاہت و ناتوانی کے ساتھ شدت کا بخار تھا۔ اس وقت ان سے ملنا جلنا، ایسے بھی مناسب نہیں تھا۔ پھر اس دورِ ابتلا و فتن میں ان سے ملنا اپنے کو مشتبہ کرنا تھا۔ میرے دل و دماغ پر عزیز قاضی حیات النبی متوفی جمعہ ۲۰ صفر ۱۴۰۲ھ رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا بے حد اثر تھا اور میں نیم دیوانگی کے عالم میں اپنے ہی بزرگ سے مل کر مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کی درخواست کر کے تسلی کے کلمات سننا چاہتا تھا، جس سے میرا غم ہلکا ہوتا چنانچہ اسی لئے میں حضرت قاری صاحب کی خدمت میں بھی پہونچا اور اپنی بات کہہ کر دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ حضرت قاری صاحب اپنی قدیم وضع کے مطابق نہایت خلوص سے ملے، اٹھ کر بیٹھے اور دیر تک دعا کرنے کے بعد تسلی دیتے رہے، قرآن و حدیث اور بزرگوں کے واقعات بیان کرتے رہے، میں ان کا حال زار دیکھ کر بار بار اٹھنا چاہتا تھا مگر وہ ہر بار مجھے بٹھاتے تھے، آخر کار مجھے ان کی محبت اور اپنی عقیدت دونوں پر جبر کرنا پڑا۔

کہا جاتا ہے کہ آدمی کا اصل روپ سفر میں کھلتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے حضرت قاری صاحب کی معیت و صحبت دو دنوں تک پونہ کے سفر میں حاصل رہی، ان کے حلقۂ ارادت سے میرا بھی دینی و علمی تعلق تھا، میرے دوست اور قاری صاحب کے بے تکلف خادم جناب سجاد حسین صدیقی نے میری کتاب ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' حضرت قاری صاحب کو سفر میں وقت گزاری کے لیے دیدی تھی۔

ہمارے کئی بزرگ اپنے حلقۂ ارادت و مشیخت میں دوسروں کی پذیرائی اور موجودگی کو اپنے حق میں مضر سمجھتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کہیں ہمارے حلقہ میں دراڑ نہ پڑ جائے اس لیے ہر وقت اسی فکر میں رہ کر اپنے خوردوں سے ایک گونہ بے اعتنائی برتتے ہیں اور

کوئی ایسی بات نہیں کرتے، جس سے خوردنوازی ظاہر ہومگر حضرت قاری صاحب اپنے ذہن و مزاج اور اخلاق کے اعتبار سے اتنا بلند تھے کہ خوردانوازی کو اپنے لیے مضر نہیں سمجھتے تھے اوران کے ساتھ بڑے انبساط وانشراح سے پیش آتے تھے، حتیٰ کہ بعض اوقات ان کے اخلاق کریمانہ سے شرم محسوس ہونے لگتی، کھانے اور ناشتے کے وقت اپنے پاس بٹھاتے تھے، سامنے کے خاص خاص کھانے میری طرف بڑھاتے تھے اور اصرار کر کے کھلاتے تھے، خود تو عمر کے تقاضے اور مرض سے پرہیز کی وجہ سے کم خوری پر مجبور تھے اور مجھ کو بسیار خوری پر مجبور کرتے، پچاسوں مریدوں اور معتقدوں سے بھرے دسترخوان پر اس قسم کا مظاہرہ خوردنوازی کے ساتھ وسعت ظرفی، اخلاقی برتری اور حوصلہ مندی کی بات ہے۔

ان دونوں واقعات میں مقابلے کے نتیجہ میں میرے نزدیک حضرت قاری صاحب کی عظمت بڑھ جاتی ہے، اسی سفر میں حضرت قاری صاحب کا وعظ ہوا، ظاہر ہے کہ ان کے نام پر کتنا زبردست مجمع ہوا ہوگا، آپ نے مجھے پہلے تقریر کا حکم دیا۔ عام طور سے مصنف وصحافی تقریر و خطابت میں یوں ہی سے ہوتے ہیں، جس طرح مقرر وخطیب کے لیے چند سطریں سلیقے سے لکھنا ''کارے دارد'' ہوتا ہے، ویسے بھی میں تقریر کے میدان سے دور رہتا ہوں، مگر حضرت قاری صاحب کی ان الفاظ میں گزارش پر انکار نہ کرسکا اور تھوڑی دیر کچھ بیان کیا، اس کے بعد آپ نے خطبہ مسنونہ پڑھ کر اپنے وعظ کی ابتدا میرے بیان کی تعریف وتوصیف سے فرمائی اور کہا کہ اس جامع تقریر کے بعد مزید کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے اسی متن کی تشریح کروں گا چنانچہ شروع سے آخر تک اسی کا حوالہ دیتے رہے اور پورے وعظ کا موضوع یا متن اسی کو قرار دیا۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے؟

پھر بات پر بات آگئی۔ ایک جلسہ میں کئی علماء ومقررین مدعو تھے، جن میں میں بھی شامل تھا، میں نے ایک خاص موضوع پر اپنی تقریر میں زور دیا، میرے بعد ایک بزرگ نے تقریر فرمائی، جس کی ابتدا میری تقریر کی مخالفت سے تھی اور وہ کہتے رہے کہ آج مسلمانوں کو اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس بات کی ضرورت ہے اور میں سوچتا رہا کہ حضرت اپنی بڑائی کا مظاہرہ

اس انداز میں نہ فرماتے تو ان کے حق میں اچھا ہی رہتا۔

اسی پونہ کے سفر میں دو دن تک حضرت قاری صاحب کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، جس میں میں نے ان کی خلوت وجلوت کے معمولات اور عادات واطوار قریب سے دیکھئے، ان کی شخصیت قریب سے بڑی پُرکشش معلوم ہوئی، جیسے دور سے بڑی پُرکشش معلوم ہوتی تھی، اگر شخصیت کے دیکھنے اور پرکھنے میں دور ونزدیک کی مسافت حائل نہ ہوتو اس کے اصلی خدوخال نظر آتے ہیں۔

(تذکرہ طیب)

مولانا ظفر علی خان

افسوس کے نومبر کے آخر میں پرانے ہندوستان کے مشہور مسلم نڈر لیڈر، بے باک صحافی، بے نظیر ادیب وشاعر اور سرگرم ملی کارکن مولانا ظفر علی خاں صاحب ۸۴/سال کی عمر میں اپنے وطن کرم آباد ضلع لاہور میں انتقال فرما گئے انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ظفر علی خان صاحب ایک زمانہ میں علی برادران کی صف میں شمار کیے جاتے تھے اوران کی ذات ہندوستان کی سیاست میں ایک اہم مقام کی مالک تھی، ان کے اخبار ''زمین دار'' نے ایک زمانے میں مولانا آزاد کے الہلال والبلاغ کے پہلو بہ پہلو رہ کر کام کیا ہے اور حریت وآزادی کے حصول اور اسلام کی طرف سے دفاع میں بے پناہ خدمات انجام دی ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں صاحب ان لوگوں میں سے تھے، جو سیاست، صحافت خطابت اور شاعری میں اس طرح کامل ومکمل تھے کہ ان میں سے کسی ایک بات کے کمال کا فیصلہ کرنا مشکل تھا، ایک زمانہ میں ان کے اشعار ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ہوا کرتے تھے اور ہر مجلس میں ان سے چٹخارہ لیا جاتا تھا، مولانا کے اشعار کا ایک مجموعہ ''بہارستان'' کے نام سے مدت ہوئی، شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی علمی قابلیت کی سب سے اہم دلیل، امریکی مصنف ڈریپر کی کتاب کا ترجمہ ''معرکہ مذہب وسائنس'' ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کے علاوہ اُردو زبان میں آج تک کوئی ایسا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا ہے جو اصل کتاب کے زورِ بیان، استعارات وتشبیہات اور زیر وبم کو بعینہ ظاہر کرتا ہے، مولانا نے اس کتاب کے لئے ہزاروں جدید اصطلاحات وضع کی تھیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح کو کروٹ کروٹ جنت میں جگہ دے اور مسلم قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

(البلاغ دسمبر ۱۹۵۶ء)

خان بہادر ظفر حسین خاںؒ

اردو کے ممتاز مصنف، ماہر تعلیم اور فلسفی خان بہادر ظفر حسین خاں صاحب نے طویل علالت کے بعد وسط جولائی میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مرحوم ظفر حسین خاں مولانا آزاد اور سید سلیمان ندوی سے قریبی رابطہ رکھتے تھے اور علامہ شبلی نعمانی سے بھی اپنے زمانۂ طالب علمی میں تعلق رکھتے تھے۔ اودھ شاہی کے ملک الشعراء ذکی مرادآبادی کی نسل سے تھے۔ مدتوں محکمۂ تعلیمات حکومت یوپی میں انسپکٹر آف اسکول کے عہدے پر ممتاز رہے۔ آخری دور میں شیعہ کالج کے پرنسپل تھے ظفر حسین خاں کی کتاب ''مآل ومشیت'' پر مرکزی حکومت کی طرف سے پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ اس کتاب کو دارالمصنفین اعظم گڈھ نے شائع کیا تھا۔ ظفر حسین خاں صاحب مولانا آزاد کے اخبار الہلال کے مضمون نگار بھی تھے آخری وقت تک لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مصروف رہے ان کی آخری کتاب جو مکمل نہ ہوسکی ''جمالیات'' کے موضوع پر ہماری تہذیب وتمدن کی یہ یادگار رہے یہ ہمارے لیے بہت بڑی آزمائش اور ابتلاء ہے۔ ضرورت ہے کہ نئی نسل میں پرانی قدریں ابھریں ورنہ چند دنوں میں ہمارا ملک ہمارے معیاری لوگوں کے لیے ترس جائے گا۔

(انقلاب ممبئی)

مولوی عبدالرشید اثریؒ

اس موقع پر مرحوم دوست مولوی ابوالطیب عبدالرشید صاحب اثریؒ جو گزشتہ رمضان میں لاہور میں انتقال فرماگئے یاد آرہے ہیں، مرحوم صالح نوجوان اور صاحب علم و تحقیق تھے، نوجوانوں میں ایسے علمی اور دینی لوگ کم ملیں گے، عربی ادب سے فطری تعلق تھا، جس نے دارالعلوم دیوبند چھڑا کر مولانا ابوعبداللہ السورتی تک پہنچایا اور جو بالآخران کی دامادی پر ختم ہوا، اوران کی حنفیت کو اثریت کا رنگ دے دیا، مرحوم ''الادب العربی فی الھند'' کے نام سے ایک نادر کتاب جمع کررہے تھے، جس کے لیے انہوں نے کئی علمی سفر کیےاور بڑی نادر و نایاب چیزوں کا معتد بہ حصہ بھی جمع کرلیا تھا، ان کے علمی مضامین ''معارف'' اور ''برہان'' وغیرہ میں اکثر شائع ہوا کرتے تھے۔

میری ان کی پہلی ملاقات مرادآباد میں ہوئی، جب کہ وہ دیوبند سے لکھنؤ جاتے ہوئے ایک رات میرے یہاں مقیم ہوئے تھے، یہ زمانہ دونوں کی طالب علمی کا تھا، مرحوم رسالہ قائد مرادآباد کے توسط سے احقر سے غائبانہ محبت رکھتے تھے، ملاقات کے بعد اس میں اور مضبوطی پیدا ہوگئی۔ دوسری ملاقات خود مبارکپور میں ہوئی جب کہ وہ کئی دن تک ہمارے ساتھ رہے اور میرے ذاتی کتب خانہ سے دلچسپی لیتے رہے۔ پھر تیسری ملاقات اور آخری ملاقات لاہور میں مارچ ۱۹۴۷ء سے اپریل تک علمی مذاکروں اور مجلسوں کی شکل میں رہی، ایک جمعہ کو نماز کے بعد وہ ہم لوگوں کے یہاں آتے اور دوسرے جمعہ کو ہم لوگ ان کے پاس جاتے اور مغرب تک یہ سلسلہ ملاقات رہتا۔ ان مجلسوں میں ادبی، علمی، تاریخی اور مذہبی گفتگو کا سلسلہ رہتا، اکثر نادر و نایاب اور قلمی کتابوں کے متعلق معلومات فراہم ہوتی تھیں۔

ع ''خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں''

(ہفتہ وار انصار بہار ایچ یکم اپریل ۱۹۴۸ء)

مولانا عبدالرؤف صاحب داناپوریؒ

۱۹؍فروری ۱۹۴۸ء

۱۹؍فروری ۱۹۴۸ء کو عالم و محقق مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب داناپوری مصنف ''اصح السیر'' نے کلکتہ میں انتقال فرمایا، مولانا مرحوم پیشۂ طبابت کے باوجود جس پایہ کے محقق اور علم دوست تھے، وہ اصح السیر اور ان کی دوسری تصانیف سے بخوبی واضح ہوتا ہے، سیرت النبی علامہ شبلی اور رحمۃ للعالمین قاضی سلیمان کے بعد اردو زبان میں مرحوم کی ''اصح السیر'' تیسری کتاب ہے، مولانا مرحوم مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے شاگردوں میں سے تھے، دینی درد نے مولانا کو ہمیشہ بے چین رکھا، سکون کے لیے انھوں نے کلکتہ مسلم لیگ کی صدق دل سے صدارت فرمائی تھی۔

غالباً ۱۹۴۴ء میں مرحوم ایک جلسہ کے سلسلہ میں مبارک پور تشریف لائے تھے، اور وہیں ان سے پہلا اور آخری نیاز حاصل ہوا تھا، ایک مجلس بھی نصیب ہوئی تھی، جس میں وہ سر نیچا کیے ہوئے روتے ہوئے نہایت دردآمیز لہجے میں صحابہ کی زندگی کے ابتلاء و مصیبت کے افسانے سنا رہے تھے اور موجودہ مسلمانوں کی حالت کا ان سے موازنہ فرما رہے تھے، اونچا سنتے تھے، اس لیے آلہ مکبر الصوت کے ذریعہ گفتگو فرما رہے تھے، احقر نے ذمیوں پر مہر کیے جانے پر اپنا شبہ پیش کیا اور مولانا نے تسلی بخش جواب دیا۔

معلوم ہوا کہ ''اصح السیر'' کی دوسری جلد بھی تیار فرما چکے تھے، اگر اس کے چھپنے کا انتظام ہو جائے تو یہی چیز ان کی علمی یادگار کے لیے کافی ہوگی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مولانا عبدالرزاق صاحب کان پوریؒ

اتفاق دیکھیے کہ اسی تاریخ (۱۹؍فروری ۱۹۴۸ھ) کو مولانا عبدالرزاق صاحب مصنف ''البرامکہ'' نے بھی انتقال فرمایا۔

مرحوم بھی علم و تحقیق کے اکھاڑے کے پرانے کھلاڑی تھے، ان کی ''البرامکہ'' نے ملک سے کافی خراج تحسین حاصل کیا ہے، علامہ شبلی مرحوم کے رفقاء میں سے تھے، آخری زمانہ میں بھوپال میں مستقل قیام تھا، اور وہیں علمی زندگی گزار رہے تھے، ابھی چند سال ہوئے، ''یادایام'' کے نام سے انھوں نے ملک کے سامنے اپنا آخری تحفہ پیش کیا تھا، اور نہ معلوم کیا کیا پیش فرماتے۔ (ہفتہ وار انصار بہرائچ ۲۰؍جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ مطابق یکم اپریل ۱۹۴۸ء)

مولانا عبدالماجد دہلویؒ

۱۹۵۱ء

آدمی بلبلا ہے پانی کا، حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اچھے خاصے سفر سے آئے، ہنستے بولتے، نہ کوئی بیماری ہے، یا نہ کوئی کسی قسم کی فکر ہے، کہ یکایک گرمی محسوس ہوئی، اور منٹوں میں قلب کی حرکت بند ہوگئی، ڈاکٹر آئے، دیکھا، انجکشن دیا، مگر کچھ کام نہ چلا۔

مولانا مرحوم دلی کے بزرگوں میں نہایت باوضع، خلیق، ملنسار اور قابل قدر ہستی تھے۔ علمی و تبلیغی کاموں کے ساتھ جمیعۃ العلماء کی سرگرمیوں میں برابر شریک رہتے تھے، تا وفات دہلی کی جمیعۃ کے ناظم تھے، یہ خدمت بیس پچیس سال سے انجام دے رہے تھے، آزادی وطن کے سلسلے میں اسیر فرنگ بھی ہوئے تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں اپنے رحمت کے سایہ میں ہنستا بولتا رکھے۔ (انقلاب ۴؍اکتوبر ۱۹۵۱)

مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی

اپریل کے ابتدائی ہفتہ میں مولانا عبدالقدیر صاحب مرحوم نے وصال فرمایا، مرحوم ''علمائے بدایوں'' میں کہنا چاہئے کہ آخری یادگار ہستی کے مالک تھے، ان کی جیسی وضع داری اور مرنجان مرنج طبیعت شاید اب تک دیکھنے میں نہ آئے۔ مرحوم نے حیدرآباد میں مفتی اعظم کے عہدہ پر رہ کر گراں قدر دینی وملی خدمات انجام دیں، اور پوری زندگی دینی علوم وفنون کے پڑھنے اور پڑھانے میں بسر کی، آخری دور میں اپنے وطن بدایوں میں مقیم ہوگئے تھے، شریعت وطریقت دونوں سے ان کی رسم وراہ یکساں تھی، شہرت ونا موری دور رہے، اور نہایت خاموش زندگی بسر کی، اب ایسے وضع دار صلح شعار اور مرنجا مرنج علماء نہیں ملیں گے، اللہ تعالیٰ مولانا مفتی عبدالقدیر صاحب بدایوں کی ان خدمات جلیلہ کا زیادہ سے زیادہ اجر دے، اور ان کو جنت الفردوس میں داخل کرے۔ (۱۳؍اپریل انقلاب بمبئی)

سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰنؒ آل سعود

۹/نومبر ۱۹۵۳ء

دوشنبہ ۹/نومبر ۱۹۵۳ء کی صبح کو والی نجد وحجاز سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود نے اپنے دارالسلطنت ریاض میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر وہی راہ اختیار کی جس پر دارا و سکندر اور خاقان وفریدوں سے لے کر دنیا کے چھوٹے چھوٹے سے انسان گئے ہیں، سلطان عبدالعزیز ادھر سالوں سے موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اپنی زندگی کے طبعی دن پورے کر چکے تھے، عمر کا ۷۳واں مرحلہ تھا، زندگی کا کارواں تھک کر بیٹھ گیا تھا، امراض نے دھاوا بولا، دنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور طبیبوں نے کوششیں کیں کہ موت کی گھڑی ٹل جائے مگر اسے نہ ٹلنا تھا، اور نہ ٹلی۔

سلطان ابن سعود اس دور کے تنہا وخوش نصیب بادشاہ تھے، جو اپنا حریف نہیں رکھتے، انھوں نے امارت وسلطنت کو جس خوبصورتی سے چلایا اس کی کامیابی کے لیے ان کی زندگی بہت بڑی شہادت ہے، مشرق وسطیٰ کے مطلق العنان شہنشاہوں میں سلطان ابن سعود تنہا سلطان تھے، جنھوں نے اپنی دوراندیشی کے بل بوتے پر سب سے الگ راہ اختیار کی، نجد کی وادی سے نکل کر جب صحرائے حجاز میں فاتحانہ داخل ہوئے تو ان کی قسمت نے بھی اپنا دروازہ کھولا، دولت کے منہ کھل گئے، سونے چاندی کے دریا بہنے لگے، غیر ملکی اقتدار نے ہاتھ بڑھایا، اور حالات کی ناہمواری کے باعث سلطان ابن سعود کو امریکہ و برطانیہ کو بڑی حد تک اپنے ملک میں خوش آمدید کہنا پڑا، مگر سلطانے دوراندیشی اور ہوشمندی سے خارجی طاقتوں کو اپنے ملکی اور اندرونی معاملات سے دور رکھا اور حکومت کے انتظامی معاملات میں ان کی ہوا تک نہ لگنے دی بلکہ تیل کے چشموں اور سونے چاندی کے ذخیروں کی حدود میں غیر ملکی اثر واقتدار کو بند کر کے رکھا، یہی وہ خصوصیت ہے جس نے ابن سعود کو اس دور کا بہترین مطلق العنان سلطان بنایا، اور اپنے قدیم خیالات وتصورات کے علی الرغم جدید خیالات وحالات سے دوچار نہیں ہوتے، اور انھوں نے دوسرے سلاطین وامراء کی

طرح اپنے کو یورپ کے حوالہ کر کے نااہل و نامراد نہیں بنایا، بلکہ اپنی قدیم خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے غیروں کو اپنے ملک کے نظام سے دور دور رکھا۔

سلطان عبدالعزیز مرحوم ۱۸۸۰ء میں اپنے آبائی وطن ریاض میں پیدا ہوئے اس وقت ان کا خاندان اپنے حریف آل رشید کے ہاتھوں تباہ و برباد تھا، اور افلاس میں مبتلا تھا، سلطان مرحوم نے ۱۹۰۱ء میں اپنے آبائی حریف سے مقابلہ کیا اور ابن رشید کو شکست دے کر اپنے والد کی حکومت بحال کی، پہلی جنگ عظیم میں حجاز سے ترکوں کے سقوط اور شریف حسین کی چال نے سلطان کے لیے موقع فراہم کیا کہ وہ نجد سے اٹھ کر حجاز پر قابض ہو جائیں، چنانچہ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے نجد کے ساتھ حجاز کو اپنے زیر نگیں کیا، اس طرح پچیس سال سے زائد تک ان کو حرمین شریفین کی تولیت کا فخر حاصل ہوا۔

سلطان مرحوم نے یوں تو ساری زندگی دینداری میں گذاری اور شریعت پر سختی سے کاربند رہے، آخر میں غیر ملکی اثر ونفوذ کے خلاف مؤثر اقدام کیا۔ اور امریکی اور برطانوی کمپنیوں کو محدود حلقوں میں زیادہ سے زیادہ گھرے رہنے کی صورت پیدا کی، سلطان خود نہایت ہی خلیق باوضع اور متبع دین مرد تھے۔ اور اسی محتاط زندگی نے ان کو ان تمام بے احتیاطیوں سے محفوظ رکھا، جن کا ارتکاب آج تمام امراء وسلاطین کر رہے ہیں، اور اس کی سزا میں ذلت ورسوائی کا انعام پا رہے ہیں۔

سلطان ابن سعود نے غربت وافلاس کے بوریئے پر آنکھ کھولی، شہنشاہیت کی قالین پر آنکھ بند کی، اور کامیاب زندگی گذار کر کامیاب موت پائی، ان کے بعد حالات کا کیا رخ ہوگا؟ غیر ملکی اقتدار واثر کے سامنے عزیمت وحکمت عملی کی دیوار حائل رہے گی، یا سلطان مرحوم کی موت کے ساتھ اس کا انہدام ہوگا؟، ان باتوں کے لئے مستقبل کا انتظار کرنا چاہیئے۔ نیا خون، نئے جذبات و خیالات کے ساتھ کیا رنگ لائے گا، اسے آئندہ کے حالات بتائیں گے، خدا کرے کہ اس سلسلہ میں جو خدشات پیدا ہو رہے ہیں وہ غلط ثابت ہوں، اور مملکت سعودیہ عربیہ زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد ہو۔

(انقلاب ممبئی)

حافظ عبداللطیف صاحب

۲ر اگست ۱۹۵۴ء

ادھر چند سالوں سے ہندوستان کے مسلمان پے درپے علمی اور دینی حادثوں کا درد سہہ رہے ہیں اور یہاں کی وہ ہستیاں جن پر یہاں کے اربابِ علم وفضل اور دین نواز حلقہ کو ناز تھا ایک ایک کر کے رخصت ہوتی جارہی ہیں۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی اعظم علامہ کفایت اللہ، مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی رحمہم اللہ اور اسی طرح کئی اہل علم ہم سے رخصت ہوگئے، اسی صف کے ایک اور بزرگ حضرت مولانا الحاج حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مظاہر علوم سہارنپور رحمۃ اللہ علیہ بھی ۲ر اگست ۱۹۵۴ء کو دنیا سے تشریف لے گئے، مولانا عبداللطیف اگرچہ عوام میں اس شہرت کو نہ پہونچے تھے جو ان کی شان کے مطابق تھی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اہل علم میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری صاحب بذل المجہو دشرح ابوداؤد جو کہ مدینہ منورہ میں مدفون ہیں حافظ عبداللطیف صاحب ان کے خاص شاگردوں میں سے تھے، اور زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان کی مشہور درسگاہ مظاہر علوم سہارنپور کے لیے وقف کر دیا تھا۔ نظامت بھی کرتے تھے اور حدیث تفسیر کا درس بھی دیتے تھے، انتظامی معاملات میں ان کو بڑا دخل تھا انھیں کو معلوم تھا کہ مظاہر علوم کے لیے کہاں کہاں سے کیا انتظامات ہوتے تھے۔ اور وہ اپنا مالی معیار کیسے برقرار رکھتا تھا۔

آپ کی ذاتی قابلیت نے مظاہر علوم کو ہندوستان کی نہیں بلکہ عالم اسلام کی ایک مشہور اور کامیاب درسگاہ بنادیا تھا، اور ہند اور بیرون ہند کے طلباء یہاں علم دین میں کامل ومکمل ہوکر نکلتے تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں جگہ دے اور ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی وفات سے جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی فرمائے۔ آمین۔ متوسلین اور معتقدین مدرسہ مظاہر علوم کا فرض ہے کہ وہ حضرت حافظ صاحب کے وصال کے بعد مدرسہ کا بہت خیال رکھیں۔ اور اس معیار کو برقرار رکھ کر حافظ صاحب کی روح کو قرار کا موقع دیں۔ (انقلاب ممبئی)

مولانا عبدالسلام ندویؒ

۴؍اکتوبر ۱۹۵۶ء

افسوس کہ ''بزم شبلی'' کی آخری شمع جمعرات ۴؍اکتوبر ۱۹۵۶ء کو بجھ گئی یعنی مولانا عبدالسلام ندوی بھی ۷۴؍سال کی عمر میں قلب کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ ویسے تو مولانا نے ادھر گئی سالوں سے جیتے جی گویا مرحوم و مغفور ہو کر تصنیف و تالیف کا کام بند کر دیا تھا۔ مگر اس حال میں بھی، وہ کچھ نہ کچھ لکھا پڑھا کرتے تھے۔

مولانا عبدالسلام ندوی علامہ شبلی کے گاؤں بندول کے قریب ہی ایک گاؤں مسلم پٹی کے رہنے والے تھے اور علامہ شبلی کے خاص الخاص شاگردوں میں تھے، کہنا چاہیے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بعد مولانا عبدالسلام ان کے سچے پرتو تھے، علمی، ادبی، تحقیقی اور تصنیفی ذوق میں بالکل شبلی کے متبع تھے، ندوہ سے نکلنے کے بعد کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ الہلال میں مدتوں اپنے علم وقلم کی جولانی دکھاتے رہے۔ پھر جب علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کیا تو کلکتہ سے یہاں آکر اس طرح رہ گئے کہ مرکر بھی اس سے جدا نہ ہوئے اور اپنے استاذ کے پہلو میں جگہ پائی۔

مرحوم کی تصنیفی یادگاروں میں اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات، تاریخ فقہ اسلامی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، شعرالہند، حکمائے اسلام، اور اقبال کامل وغیرہ بہترین شاہکار ہیں جو اردو میں علمی، ادبی اور تحقیقی اعتبار سے بے بہا خزانہ ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ علامہ مناظر احسن گیلانی، کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی کی موت ہندوستان کی علمی وادبی برداری کے لیے اپنی نوعیت کا اہم ترین حادثہ ہے اور اب دارالمصنفین اعظم گڑھ شبلی اسکول کے براہ راست تربیت یافتہ شخصیتوں سے خالی ہو گیا، مولانا مرحوم اپنی وضعداری، سادگی اور بے تکلفی میں اپنی نظیر آپ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ہمیں ان کا نعم البدل دے آمین۔ (البلاغ نومبر ۱۹۵۶)

حضرت مولانا الحاج عبدالرحیم لکھنویؒ

۲۵/دسمبر ۱۹۵۶ء

افسوس کہ ۲۵/دسمبر ۱۹۵۶ء کو حضرت مولانا الحاج عبدالرحیم صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ انتقال فرما گئے، حضرت مرحوم پر دو ماہ قبل ۲۶/اکتوبر کو جب کہ انہیں آخری مرتبہ حج وزیارت سے واپس ہوئے چند ہی ایام گزرے تھے، یک بارگی فالج کا حملہ ہو گیا، آپ اس دو ماہ کی مدت میں شاید ہی چار پانچ مرتبہ ہوش میں آئے ہوں گے۔

مولانا مرحوم حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے، زبردست عالم اور بیدار مغز ماہر علوم وفنون تھے، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے فارغ تھے، حضرت مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص ہونے کا فخر حاصل تھا۔ مدتوں سے تعلیم وتعلم سے الگ ہو چکے تھے۔ مگر علم وذہن کی تازگی اور یادداشت کا عالم یہ تھا کہ ہر قسم کے علمی مسائل خصوصاً منطق، فلسفہ، علم کلام، اور نحو وصرف پر بے دھڑک ماہرانہ گفتگو فرماتے تھے، اور کتابوں کی عبارتیں زبانی پڑھتے جاتے تھے۔ شعر گو تو شاید بہت ہی کم تھے، مگر شعر فہمی اور شعر پسندی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، بلا مبالغہ اردو فارسی کے اساتذہ کے لاکھوں اشعار زبانی یاد تھے۔ جنہیں مرحوم تقریباً ہر محفل میں برجستہ سنایا کرتے تھے، شاید ہی ان کی کوئی مجلس شعر وشاعری سے خالی گئی ہو۔

مولانا مرحوم میں حد درجہ کی انکساری، بے نفیسی، فروتنی، اور خاکساری تھی، بڑے ہی وضعدار اور رسم وراہ کے پابند بزرگ تھے۔ نرم دلی، رقت قلبی، ان کا خاص وصف تھا، ان کی نرم دلی اور شفقت سے بہت لوگوں نے فائدہ اُٹھایا، مگر خود ہمیشہ بچتے رہے، مولانا مرحوم کی ایک ایک بات یاد آتی ہے، تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ اب ایسے مشفق خدا ترس بوڑھے علماء کہاں ملیں گے، جو اپنے چھوٹوں کی گستاخی پر شفقت کریں گے۔

مولانا مرحوم اخلاق وروحانیت کی اکثر باریک باتیں بیان فرماتے اور اہلِ دل کے اشعار و واقعات سے خوب نوازتے تھے، ایک زمانہ میں ہندوستان کے ہر دینی جلسہ میں ان سے رونق ہوتی تھی، مگر ادھر پچھلے پندرہ بیس سالوں سے مولانا اس سے بھی کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ان کے وعظ اب سے چار پانچ سال پہلے بمبئی میں ہوا کرتے تھے، وعظ میں بڑی سادگی، اور بڑی جاذبیت ہوا کرتی تھی، مولانا بڑوں میں بڑے اور چھوٹوں میں چھوٹے تھے، ایسے بڑے کہ بڑے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ اور ایسے چھوٹے کہ ہم جیسے چھوٹے چھوٹے لوگ ان کو چھیڑا کرتے تھے۔

محترم الحاج احمد غریب صاحب و اخوانہ سے مولانا مرحوم کے ذاتی تعلقات دوسرے اربابِ علم و فضل کی طرح دیرینہ اور گہرے تھے، انجمن خادم النبی اور البلاغ سے ان کو بڑی محبت تھی، اللہ تعالیٰ نے متعدد بار حج و زیارت کی دولت سے نوازا، اب کے حج کو تشریف لے گئے تھے، اسی آرزو کے ساتھ کہ جنت البقیع میں ایک گز زمین مل جائے، اللہ تعالیٰ یہیں پر ان کے مرقد کو جنت البقیع کا ٹکڑا بنا دے تو یہ اس کی رحمت سے کیا بعید ہے، فالج کے دور میں جب کبھی بولتے تو مدینہ منورہ، جنت البقیع کے مبارک الفاظ کے ساتھ احمد بھائی، حافظ محمد صدیق، اور عبدالکریم، اور یوسف بھائی وغیرہ کو یاد فرمایا کرتے تھے۔ اس سے تعلقات کی نوعیت اور نزاکت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم اپنے اوصاف و کمالات میں بے نظیر تھے، ان کو کہاں تک یاد کیا جائے۔ ان کے متعلقین کی طرح انجمن خدام النبی بمبئی، و رسالہ البلاغ کے اراکین بھی ان کے فراق میں غمگین ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے، اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور ہمیں صبر جمیل اور نعم البدل دے آمین۔

(البلاغ جنوری ۱۹۵۷)

حضرت مولانا الشیخ عبداللہ زمزمیؒ

۱۰ر شوال ۱۳۷۶ھ

افسوس کہ مکہ مکرمہ کے مشہور بزرگ اور عالم حضرت مولانا الشیخ عبداللہ الزمزمی نے ۱۰ر شوال ۱۳۷۶ء بروز جمعہ انتقال فرمایا رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبداللہ الزمزمی ان مجاورین حرم میں سے تھے جن کے تذکرے تاریخوں میں ملتے ہیں اور جن کی زندگی وقف حرم تھی، مولانا دنیا میں تنہا جئے ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ البتہ ہندو پاک اور دوسرے ممالک کے ہزاروں لاکھوں حجاج اور خود اہلِ حرمین شریفین ان کے تھے، صبر وقناعت اور توکل کی چلتی پھرتی تصویر تھے، صاحبِ کشف وکرامت، بے نفسی اور بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ خود اپنے بارے میں خیال بھی نہیں پیدا ہوا کہ وہ بھی کچھ ہیں، بڑے بڑے علماء فضلاء سے لے کر عام حجاج تک ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، زندگی درویشانہ تھی، جو کچھ حجاج نذرونذرانہ پیش کرتے، فوراً دوسرے حاجتمندوں مندوں پر خرچ کر دیتے تھے، جو شخص ان سے ایک مرتبہ ملتا، زندگی بھر اسے یاد رکھتے اور سلام و پیام کا سلسلہ جاری رکھتے جب کہ ہر سال ہزاروں حجاج ان سے ملتے تھے اور ہر ملنے والا یہی محسوس کرتا تھا کہ مولانا مجھ سے بہت زیادہ محبت فرماتے ہیں۔ راقم پہلی بار جب ۱۳۷۴ھ میں حاضر ہوا تھا تو اکثر و بیشتر ان کی خدمت میں جاتا تھا، بڑی شگفتگی سے پیش آتے تھے، چلتے وقت چند کتابیں بطور ہدیہ پیش فرمائیں اور اپنے قلم سے بڑے لمبے چوڑے آداب و القاب میں ان پر تمہیدی عبارت لکھی، جو راقم کے کتب خانہ کی زینت ہیں، وحی الصحر اء، اور مختصر تحفہ اثنا عشریہ (عربی) کے علاوہ کتابیں ہیں، اب کی بار بھی ان سے نیاز حاصل ہوا تھا، کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، عزیزم خالد کمال متعلم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بھی بڑی محبت و شفقت فرماتے تھے اور باپ بیٹے کے حق میں دعائیں فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے درجات اعلیٰ علیین میں بلند فرمائے اور ہمیں ان جیسے بزرگوں کے فیوض و برکات سے محروم نہ فرمائے آمین۔ (البلاغ ۱۳۷۶ء)

ڈاکٹر مولانا عبدالحق مدراسیؒ

۱۵/ مارچ ۱۹۵۸ء

ابھی مولانا آزاد کے غم میں آنکھ تر ہی تھی کہ ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب مدراسی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر ملال کی خبر آ گئی مرحوم ڈاکٹر صاحب نے اچانک ۱۴/ مارچ گزرنے کے بعد رات کے بارہ بج کر چند منٹ پر جان آفریں کو جان سپرد کی۔

پہلے سے مرحوم کسی قسم کی بیماری میں مبتلا نہ تھے بلکہ اچھے خاصے تھے اور کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ آپ اس طرح آناً فاناً انتقال فرما جائیں گے۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کے علم وفکر اور دین وثقافت کو ایک بڑا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا۔

افضل العلماء خان بہادر ڈاکٹر الحاج مولانا عبدالحق صاحب مدراسیؒ ہندوستان کی ان چند مایہ ناز ہستیوں میں سے تھے، جن پر ہندی مسلمان اور خود ہندوستان برسوں آنسو بہائے گا۔

آپ شمس العلماء الحاج مولانا محمد عمر صاحب بانی اسلامیہ عربیہ کالج کرنول کے فرزند تھے، اپنے والد سے اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی ۱۹۲۲ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا، اور ۱۹۲۳ء میں افضل العلماء ہوئے اور ۲۴ء میں ایم،اے کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۳۶ء میں لندن سے اور ۱۹۳۸ء میں آکسفورڈ سے ڈی، فل کی ڈگریاں حاصل کیں۔

آپ نے انگلستان، اسپین، جرمنی، ترکی، مصر وغیرہ کی سیاحت فرمائی اور متعدد بار حج وزیارت کی دولت سے سرفراز ہوئے، آخری حج میں راقم الحروف سے جہاز سے حجاز تک علمی اور دینی تعلق رہا۔

ڈاکٹر صاحب کی ذات گرامی مشرقی اور مغربی، علوم ''مجمع البحرین'' تھی، آپ نے کئی ایک محققانہ کتابیں لکھی ہیں، عوام اور حکومت دونوں میں آپ یکساں مقبول تھے، جنوبی ہند کے مسلمانوں میں اسلامی اور دینی علوم کے رائج کرنے میں ڈاکٹر صاحب کی ذات بڑی کارگر ثابت ہوئی۔

مرحوم راقم الحروف سے بے حد محبت فرماتے تھے، جب بھی بمبئی تشریف لاتے تو خصوصیت سے یاد فرماتے، کئی بار فرمایا، مدراس آؤ اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرو، آخری بار جب بمبئی تشریف لائے تو پھر یہی فرمایا، حتیٰ کہ ابھی چند ماہ ہوئے برادر محترم الحاج محی الدین منیری صاحب کرنول گئے اور ڈاکٹر صاحب سے ملے تو دورانِ گفتگو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے پھر فرمایا کہ اس سے کہہ دو کہ کچھ دنوں کے لیے جنوبی ہند کے علمی اور تحقیقی سفر پر آئے، قیام وطعام وسفرخرچ کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔

افسوس کہ ایسے مخلص بزرگ اور محقق عالم ایسے وقت دنیا سے تشریف لے گئے، جب ہم ان کے سخت محتاج ہیں۔

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے دست راست محترم مولانا الحاج پروفیسر عبدالوہاب صاحب بخاری کو سلامت رکھے کہ اب موصوف کا دم غنیمت ہے اور ان پر اب جنوبی ہند میں علمی اور دینی کام کی ذمہ داری زیادہ آگئی ہے۔

ہم غمزدہ متوسلین مرحوم ڈاکٹر صاحب کے صاحب زادوں اور دوسرے متعلقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی روح کو کروٹ کروٹ اپنی رحمت سے نوازے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

(البلاغ اپریل ۱۹۵۸ء)

استاد القراء

حضرت مولانا قاری عبدالملک صاحب

۲۸/دسمبر ۱۹۵۹ء

ہندوستان و پاکستان کے اسلامی اور علمی حلقوں میں یہ خبر نہایت رنج وافسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۲۸/دسمبر ۱۹۵۹ء کو استاذ القراء والمجودین حضرت مولانا قاری عبدالملک صاحب لاہور میں انتقال فرما گئے رحمہ اللہ علیہ

قاری صاحب مرحوم فن تجوید وقرأت کے مسلم اساتذہ میں تھے، اور قرآن حکیم کی اس خدمت میں ان کی ذات پیش پیش تھی۔

انہوں نے ہندوپاکستان میں بہت سے قراء و مجودین پیدا کیے، جن کے الہامی نغموں سے ہندوپاکستان کی فضا معمور رہا کرتی ہے، اور جن کے فیض سے درس گاہوں سے صبح وشام قرآن حکیم کی صدائیں نہایت دلکش انداز میں بلند ہوتی ہیں، دوسرے علوم وفنون کی طرح فن تجوید وقرأت میں بھی ہندوستان کے مسلمان عالم اسلام کے مسلمانوں سے کسی طرح کم نہیں تھے، ان میں بھی ایسے ایسے قراء و مجودین گذرے ہیں، جو اپنے فن میں شیخ العرب والعجم رہ چکے ہیں، ابھی ماضی قریب میں فن قرات کے نامی گرامی اساتذہ اس ملک میں موجود تھے۔ جن کے تلامذہ ملک کے کونے کونے میں پائے جاتے تھے۔

اللہ تعالی قاری عبدالملک صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ دے، اور ان کے فن کو اس ملک میں قائم ودائم رکھے۔ (انقلاب بمبئی ۱۲/جنوری ۱۹۶۰ء)

امام اہل سنت

حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمہ اللہ لکھنوی

۱۶/ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ

امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں وہ یقین ثابت ہو گیا، جس کا خطرہ ہفتوں سے ہر آن رہا کرتا تھا، اور ۱۶/ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ دوشنبہ مطابق ۲۳/اپریل کو شام کے چھ بج کر بیس منٹ پر رحلت فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون موت کو قرآن حکیم نے یقینی بنا دیا ہے، اس سے کسی ذی روح کو مفر نہیں ہے۔

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب بزم دوشیں کے آخری گو ہر شب چراغ تھے، اور اب اس محفل کی ایک شمع بھی باقی نہیں رہی، مولانا مرحوم نصف صدی سے زائد سے اہل سنت والجماعت کے بلاشبہ اپنے کارناموں کی وجہ سے امام تھے۔

حضرت امام ابن تیمیہ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی، حضرت مولانا حیدر علی فیض آبادی کے بعد حضرت مولانا عبدالشکور کا مقام و مرتبہ تھا، مولانا کی مناظرانہ زندگی خوب خوب نمایاں ہوئی، اس کے علاوہ بھی مولانا نے اردو زبان میں بیش بہا کتابیں لکھیں، ''ترجمہ تاریخ اسد الغابہ'' ترجمہ تاریخ طبری، ''ترجمہ ازالۃ الخفاء''، ''علم الفقہ''، خلفائے راشدین'' وغیرہ کتابیں ہیں، جو علم اور دین کی دنیا میں خاص مقام رکھتی ہیں، بمبئی کی اصلاح میں حضرت مولانا نے جو ابتدائی کوششیں فرمائیں، اور جن جن خطرناک حالات کا مقابلہ کیا، وہ ان کی تاریخ اصلاح کے بہترین ابواب ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا بجا طور پر ''مصلحِ بمبئی'' کہے جانے کے مستحق ہیں اور اس اعتبار سے اہل بمبئی پر ان کا حق ہے کہ وہ آپ کے درجات عالیہ کی بلندی اور رحمت و مغفرت کی دعا زیادہ سے زیادہ کریں، اور ایصال ثواب کر کے مولانا کی روح پر فتوح کو خوش کریں، اللہ تعالیٰ مولانا کو جنت الفردوس میں جگہ دے، اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ (انقلاب بمبئی)

مولانا عبدالمومن فاروقیؒ

۲۹ر رمضان ۱۳۸۶ھ

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی کے صاحبزادے مولانا عبدالمومن صاحب فاروقی نے لکھنؤ میں انتقال کیا اور اسی روز شام کو چک منڈی کے قبرستان جہاں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب اوران کے بھائی حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب دفن ہیں یہ بھی دفن کئے گئے۔ مرحوم کئی مہینہ سے علیل تھے ابتدامیں سمجھا گیا کہ فالج کے مرض میں کچھ اضافہ ہوگیا ہے۔ ادھر کچھ روز قبل ان کو میڈیکل لکھنؤ میں داخل کردیا گیا تھا، وہاں ایکسرے سے معلوم ہوا کہ پھیپھڑے میں کینسر کی ابتدا ہوچکی ہے ۲۸ر رمضان کو ان کی طبیعت زیادہ بگڑی اور ۲۹ر کی صبح ۷ر بجے انتقال کر گئے۔

مرحوم النجم، آفتاب اور حرم اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اور مولانا عبدالشکور صاحب کی علمی و دینی زندگی کی راہ پر چل کر اسی سلسلہ میں لگے رہتے تھے، اخبار نویسی اور صحافت میں اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے۔ اور اسی ادھیڑ بن میں رہا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

اب اس خاندان میں مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی اور مولانا عبدالحکیم صاحب فاروقی رہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے علم اور دین کی خدمت لے اور خاندانی علم و فضل کا سلسلہ ان سے جاری رہے۔ آمین

(انقلاب بمبئی)

عبدالکریم بھائیؒ میمنی

۲۶/جون ۱۹۶۳ء

موت کو قرآن حکیم نے ایک مقام پر یقین سے اور دوسرے مقام پر مصیبت سے بھی تعبیر کیا ہے۔ موت ہی ایک ایسی حقیقت ہے جس پر سب کا اتفاق ہے۔ اور کسی کو اس پر اختلاف نہیں ہے۔ مگر بعض اموات اپنے خاص حالات کی بنا پر زندوں کے لیے بہت دیر تک شک کا درجہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ ۲۶/جون (۱۹۶۳ء) کی رات میں ہم نے اسی قسم کی موت کی خبر سنی، میت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، جنازہ کو کاندھا دیا اور اس پر مٹی ڈالی۔ مگر اب تک اس یقین میں شک ہی سا ہوتا ہے۔ یہ انسانی غفلت کا انتہائی درجہ ہے کہ فریب زندگی اب تک ہمارے دل و دماغ کو اس حقیقت اور یقین کے بارے میں مطمئن نہیں کر سکا ہے، مگر حق حق ہے، ہمارے محترم الحاج احمد غریب صاحب کے برادر خورد اور ہم سب کے کھلونے جوان صالح الحاج عبدالکریم میمنی آناً فاناً ہنستے ہنساتے، کھیلتے کھلاتے دنیا سے یوں چلے گئے کہ جیسے وہ ہمارے اندر موجود ہیں۔ وہ جسم و جسمانیت کے لحاظ سے نہایت تندرست و توانا تھے، ایسے کہ اچھے اچھے صحت مندان پر رشک کریں۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ ان کو بخار بھی آیا ہو، اخلاق و انسانیت کے اعتبار سے اتنے اچھے کہ بچے، بوڑھے، جوان، امیر، غریب سب ہی ان کے لیے کھلونے اور وہ سب کے لیے کھلونے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زندگی نشاط ہی نشاط ہے۔ اس میں اداسی کا نام تک نہیں ہے۔ دین و دیانت کے معاملے میں ایسے کہ اس زندہ دل مرد پر زاہدان خشک بھی رشک کریں۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے بھائیوں کی طرح ان کے لیے

بھی مکہ اور بمبئی کو یکساں وطن بنایا تھا۔ ۱۹۳۵ء سے شاید ہی کسی سال حج و زیارت نہ کیا ہو، ابھی بارہ دن ہوئے تھے کہ حجاز مقدس سے واپس آئے تھے۔ ان کے برادر کلاں مرحوم الحاج محمد بھائی صاحب تیسرے سال مکہ مکرمہ میں وصال فرمایا، تو تقریباً تمام اہل خانہ بمبئی میں تھے، اور جب خود انھوں نے انتقال کیا تو تقریباً ان کے گھر کے سب ہی افراد مکہ مکرمہ میں ہیں، حتیٰ کہ والدہ محترمہ بھی وہیں ہیں۔ اس ضعیف ناتواں کے دل پر کیا گذرتی ہوگی، جس نے پہلے اپنی سب سے بڑی اولاد کا غم اس کی میت سے دور رہ کر سہا اور اپنی سب سے چھوٹی اولاد کا غم اس کی میت سے دور مکہ مکرمہ میں رہ کر سہا، اگر الحاج محمد بھائی صاحب مرحوم کے انتقال سے محترم احمد بھائی صاحب اور حافظ محمد صدیق صاحب کا دماغ چھن گیا تھا تو اب ان کے چھوٹے بھائی کے مرنے سے ان کے بازو شل ہوگئے۔ مرحوم کے لڑکوں، بچوں، ان کی ماں کے لیے یہ بڑا صبر آزما وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو ان کے نیک اعمال واوصاف کی چند در چند جزادے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اللہ اکبر کیا زندگی ہے اور اس کا کیا ٹھکانا ہے، ابھی ہے اور ابھی نہیں ہے، اس ہے، نہیں میں کتنی دیر ہی لگتی ہے، موت کتنی قریب ہے؟ مگر ہم غافل اپنے کو اس سے کتنا دور سمجھتے ہیں؟

فاعتبروا یا اولی الابصار

(انقلاب ۲۸/جون ۱۹۶۳ء)

نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ

۲۵؍فروری ۱۹۶۷ء

مرگ وزیست کی کئی دنوں کی کشمکش کے بعد نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ سابق والی ریاست حیدر آباد ۲۵؍فروری ۱۹۶۷ء کو انتقال کر گئے اور سلطنت آصفیہ کا آخری چراغ گل ہو گیا، حیدر آباد ہندوستان میں سب سے بڑی مسلم ریاست تھی، جو اپنے رقبہ، آمدنی اور حسن انتظام میں کئی ملکوں سے آگے تھی، مرحوم نواب صاحب اس سلطنت کے ساتویں اور آخری حکمراں تھے، اس ریاست نے اپنے زمانہ قیام سے لے کر آخری دور تک بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ دینی اور علمی وفنی رجال وافراد کی خدمت کی اور رفاہِ عام کے بہت سے پائدار کام کئے۔ خود نواب صاحب نے اپنے دور میں اس طرح کے بہت سے علمی وفنی اور رفاہی کارنامے انجام دیے جو مدتوں فائدہ پہونچاتے رہیں گے۔ وہ اپنی مجبوری کے عالم میں بھی چار سو سے زائد انسانوں کی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے تھے ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ سلطان العلوم آصف جاہ اعلی حضرت اور نواب سے بڑھ کر شاہ وشہنشاہ کہے اور سمجھے جاتے تھے۔ مگر سقوطِ حیدر آباد کے بعد خیر سے ان کا وہ حشر نہیں ہوا۔ جو عراق کے ہاشمی سلطان اور ان کے خاندان اور پھر قاسم کریم کا ہوا، بلکہ وہ زندہ رہ کر طبعی موت مرے، اس دور میں ایک طبقہ کے نزدیک وہ سب سے بڑے غدار، خائن سرمایہ دار اور دشمن ملک وقوم بن گئے تھے، لیکن وہ اپنی ریاست پر قابض ودخیل رہتے تو وہی شاہ وشہنشاہ اور اعلیٰ حضرت بنے رہتے، یہ تو زمانہ کی ریت ہے، دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے، یقین جانو! آج دنیا نے جس بے اعتنائی اور بے رخی سے میر عثمان علی خاں کو دیکھا ہے، کل اس سے کہیں زیادہ عقیدت سے ان کو یاد کرے گی اور ان کے دور کو یاد کر کے ان کو خراجِ تحسین پیش کرے گی۔ آخری بہادر شاہ ظفر کو بھی تو اسی طرح مجرم،

خائن غدار اور نااہل بنا کر رنگون میں مارا گیا تھا، مگر سو سال بیتتے بیتتے ہندوستانیوں نے ان کو اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کیا، اور اپنا ہیرو مان لیا۔ آج کانگریس برسر اقتدار ہے اسی کے دور میں میر عثمان علی خاں معزول ہوئے لیکن کیا تعجب ہے کہ کل کانگریس کی حکومت پر قبضہ کر کے اس کے کارناموں کی سیاہ فہرست شائع کریں، جس میں میر عثمان علی خاں کو سراہا جائے اور کانگریس کو بُرا بھلا کہا جائے، دنیا میں ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے، اور آئندہ بھی ہوگا، میر عثمان علی خاں کی شاہانہ داد و دہش سے ہندوستان کے بہت سے ادارے اور افراد پھلے پُھولے اور ان کے دور میں عوام اور علوم و فنون کے لیے تاریخی کارنامے انجام کو پہونچے۔ ان کے پوتے معظم خاں ان کے جانشین ہوئے ہیں، دیکھنا ہے کہ انقلابِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس خاندان کو کیسے کیسے دن دیکھنے پڑتے ہیں۔

(البلاغ مارچ ۱۹۶۷ء)

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادیؒ

۲۴/ مارچ ۱۹۵۹ء

افسوس کہ ۲۴/ مارچ ۱۹۵۹ء کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے بمبئی کے ٹاٹا میموریل اسپتال میں کینسر کے موذی مرض میں انتقال کیا اور ان کو ملیح آباد میں سپرد خاک کر دیا گیا، ملیح آبادیؒ عربی و اردو کے عالم اور انشاء پرداز تھے، کئی عربی کتابوں کے ترجمے کئے، کئی اخبارات نکالے، قومی اور ملکی تحریک میں کھل کر مولانا ابوالکلام آزاد کے فکر و نظر کی سطح پر کام کرتے رہے، مولانا آزاد مرحوم کے رفیق تھے، ان کے ساتھ الہلال و البلاغ میں کام کیا تھا اور آخر میں مولانا کی دعوت پر دہلی آئے اور حکومت کا عربی رسالہ "ثقافۃ الہند" کے مدیر اور آل انڈیا ریڈیو میں عربی کے انچارج کی حیثیت سے کام کرتے رہے، موصوف نے کئی تصنیفات چھوڑیں ہیں جن میں "العلم والعلماء" اور "مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" آخری تصنیف ہیں اخلاق اور ملنساری اور وضعداری میں مشہور تھے۔

(البلاغ اگست ۱۹۵۹ء)

جمال عبدالناصر

صدرِ جمہوریہ مصر

۲۷؍ستمبر ۱۹۷۰ء

۲۷؍ستمبر ۱۹۷۰ء کو جمہوریہ عربیہ متحدہ مصر کے جمال عبدالناصر کی موت نے ساری دنیا میں تہلکہ مچادیا اور موافق، مخالف سب ہی ان کی عظمت وضرورت کے قائل ہوگئے ان کے مرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے مقبول ترین انسان تھے، ان کے مخالف ذرائع خبر نے بھی بتایا کہ جس قدر انسان مرحوم جمال عبدالناصر کے جنازہ میں شریک ہوئے تھے، موجودہ دنیا کے کسی حکمراں یا کسی دوسرے انسان کے جنازہ میں اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔ ۷۰؍ممالک کے نمائندوں کی اس میں شرکت بھی امتیازی بات ہے، عربوں نے خاص طور سے مصریوں نے اپنے صدر کا جس انداز میں ماتم کیا اور اپنے تاثرات کا جس طور پر مظاہرہ کیا، اس نے بھی ثابت کردیا کہ ناصر اپنے دور کے سب سے مقبول انسان تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ جمال عبدالناصر نے اپنے فولادی عزم وارادہ سے عربوں کو نئی توانائی دی تھی اور سیکڑوں سال کے سامراجی پھندے سے نکال کر ان کو ایک نیا میدان دیا تھا۔ وہ تقریباً اٹھارہ سال تک متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر رہے، بعض نازک مرحلے آئے، مگر قوم نے ان کو اپنا معتمد وپیشوا مانا اور وہ اول سے آخر تک ایک انداز میں اپنی قوم اور عربوں کے مقبول رہنما رہے۔ کسی انسان کی قابلیت وصلاحیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد لوگ اس کے لیے بیتاب ہوں اور اس کے بغیر اپنے کو بے سہارا سمجھیں۔ جمال عبدالناصر کے بارے میں مصریوں کا یہی تاثر ہے، ہم آپ کسی قوم کے بڑے کو بڑا تسلیم کریں یا نہ کریں دیکھنا چاہیے کہ خود اس کی قوم اسے کیا سمجھتی ہے؟ پھر جیسا

سمجھتی ہے وہ ویسا ہی ہے، یقیناً اس اصول پر جمال عبدالناصر بہت بڑے آدمی تھے، انہوں نے عرب ممالک کی سیاست میں جو انقلاب برپا کر کے عربوں میں عزم وارادہ اور حوصلہ مندی پیدا کی ہے۔ وہ ان کا اہم ترین انقلابی کارنامہ ہے، جو عربوں کی سیاسی تاریخ میں سنگ میل ہے۔ جمال عبدالناصر نے عربیت اور قومیت کے نام پر عربوں کو ایک محاذ پر لانے کی کوشش کی مگر مذہب سے ان کا تعلق ہمیشہ رہا۔ ان کے دور میں بعض حیثیات سے اسلامیات کی خدمت جس قدر مصر میں ہوئی، اس میں کوئی مسلم ملک شریک نہیں ہے۔ اور پوری دنیا کے مسلم اور غیر ممالک ان اسلامی خدمات سے فیض یاب ہوئے ہیں، حتیٰ کہ دیہات دیہات اس کے اثرات گئے ہیں۔ باقی رہا جمال عبدالناصر کی حکومت اور ان کے حریفوں کا معاملہ تو حکومت وسلطنت میں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ ہمشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، پوری عرب دنیا جمال عبدالناصر کے غم میں سوگوار ہے، ہم ان کے ساتھ غم خواری وہمدردی کا جذبہ پیش کرتے ہیں اور ان کے لیے نعم البدل کی دعا کرتے ہیں۔

(البلاغ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

علامہ سید علوی مالکیؒ

۵؍صفر ۱۳۹۱ھ

حضرت الشیخ مولانا سید علوی مالکیؒ موجودہ دور میں مکہ مکرمہ کے جید اور مستند علماء میں سے تھے، افسوس کہ ۵؍صفر ۱۳۹۱ھ کو ان کا وصال ہو گیا، سید علوی مالکی کی علمی و دینی مجلس سلف صالحین کا نمونہ تھی، عربی اخلاق و ذوق سے معمور رہتی تھی، موسمِ حج میں ان کا کاشانہ ہندوستان، پاکستان، ایران، عراق، شام اور افریقہ کے علماء وفضلاء سے معمور رہتا تھا، علم و معلومات کے سمندر تھے نہایت فصیح و بلیغ عربی بولتے تھے، ہندوستان کے علماء کے بارے میں خاص طور سے معلومات رکھتے تھے، ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے اور ان کے علمی کمالات کے معترف تھے، میں نے ان کے ایک عربی مضمون کا اردو ترجمہ چھاپا تھا، جب پہلی بار حج و زیارت کے لیے حاضری ہوئی تو وہ پرچہ ساتھ لیتا گیا تھا دیکھ کر بہت خوش ہوئے، دعائیں دیتے رہے، اس کے بعد متعدد بار ان کی خدمت میں حاضری ہوئی اور ہر بار ایسے اخلاق سے پیش آتے تھے کہ گویا کوئی بڑا عالم آ گیا ہو، پھر مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ میں ملاقات ہوئی تو بڑے تپاک سے ملے اور رخصت کرتے ہوئے دعا دی کہ آج ہم جس طرح ریاض جنت میں یکجا ہیں، کل اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں یکجا کر دے، اس کے بعد خط و کتابت کبھی کبھی ہوتی رہی اور تعارف و تعلق کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے اپنی عربی کی تصنیف ان کی خدمت میں روانہ کیں اور انہوں نے اپنی تصانیف مجھے پیش فرمائیں، پھر دوسری بار حاضری ہوئی تو اسی اخلاق و محبت سے ملے۔

(البلاغ ممبئی)

حضرت مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاویؒ

۲۶/جولائی ۱۹۷۱ء

افسوس کہ حضرت مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی نے دوشنبہ ۲۶/جولائی ۱۹۷۱ء کو اپنے وطن رسڑا ضلع بلیا میں انتقال فرمایا رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

انتقال کے وقت مولانا مرحوم کی عمر ستر سال تھی، وہ اس دور میں عربی لغت وادب کے مشہور عالم تھے، اس سلسلے میں ان کا زندہ وجاوید کارنامہ اردو زبان میں عربی زبان کی مشہور لغت ''مصباح اللغات'' ہے، جو بیس سال سے زائد سے ہندوستان کے علماء وطلبہ میں مقبول ومتداول ہے۔ اور ندوۃ المصنّفین دہلی سے اس کے سولہ سترہ ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو عربی ڈکشنری اور دوسری کتابیں مطبوعہ وغیر مطبوعہ ان کی تصنیفات میں سے ہیں، ان کو ان گراں قدر تصنیفات پر حکومتِ ہند اور صوبائی حکومت سے انعامات بھی ملے تھے، دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں سے تھے، مدرسہ مصباح العلوم بریلی، مدرسہ نور العلوم، بہرائچ، دارالعلوم دیوبند اور آخر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی ادب ولغت کے معلم ومدرس تھے، تین چار سال پہلے حج وزیارت کی نعمت سے بہرہ یاب ہو چکے تھے، سادگی، نیکی نفسی، وضعداری اور بے تکلفی میں اسلاف کا نمونہ تھے، ان کو دیکھ کر ان کے علم وفضل کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا، پوری زندگی طالب علمانہ انداز میں بسر کی اور درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور تحقیق وتلاش میں آخر وقت تک منہمک رہے، آخر میں حدیث کی مشہور لغت مجمع بحار الانوار کی تعلیق وتصحیح فرمائی اور اس کے لئے علمی اسفار کیے، راقم سے مولانا مرحوم کے تعلقات اس وقت ہوئے جب کہ وہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے بعد مدرسہ نور العلوم بہرائچ میں نئے مدرس ہو کر تشریف

لائے تھے۔ اور مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی مرحوم نے جو اس وقت حکومت یوپی کے پارلیمنٹری سکریٹری تھے، اپنی نگرانی میں بہرائچ سے ایک ہفتہ وار اخبار ''انصار'' جاری کیا، راقم اس کا مدیر تھا اور مولانا عبدالحفیظ صاحب معاون مدیر تھے۔ تقریباً چھ ماہ تک ہم دونوں ایک جگہ بلکہ ایک ہی ساتھ رہتے تھے، اس مدت میں اکثر و بیشتر ساتھ ہی لکھنؤ آنا جانا ہوتا تھا، اس کے بعد راقم بمبئی اور مولانا لکھنؤ چلے گئے، مولانا مرحوم نے اپنی کتاب مصباح اللغات کے ذریعہ ہندوستان میں عربی علوم کی جو خدمت کی ہے، اس کی افادیت وعمومیت وہی ہے، جو علامہ مجدالدین محمد بن یعقوب فیرزآبادی متوفی ۸۱۶ھ کی قاموس کی ہے اور وہ اپنے دوسرے تدریسی و تصنیفی کارناموں کے مقابلہ میں صرف اسی ایک کتاب کی وجہ سے علمی دنیا میں نیک نامی اور شہرت دوام کے مالک رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے اور اہلِ علم کو ان کا نعم البدل دے آمین۔

(البلاغ اگست ۱۹۷۱ء)

حضرت مولانا عبدالباری حاوی مدراسیؒ

۱۴ار جنوری ۱۹۷۲ء

حضرت مولانا عبدالباری صاحب حاوی مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے سفر حج کے دوران انتقال فرمایا، ۱۴ار جنوری ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں ملاقات ہوئی، اچھے خاصے تھے، پرانی ملاقاتوں کی طرح یہ آخری ملاقات بھی علمی رہی، فرمایا کہ دہلی سے آیا ہوں، کچھ مشکلات ہیں، ان کے حل ہونے پر کل کے ہوائی جہاز سے حجاز مقدس کو انشاء اللہ روانگی ہوگی، چناں چہ پروگرام کے مطابق سفیر حج پر روانہ ہوئے اور ظہران پہونچ کر اچانک انتقال فرماگئے۔

مرحوم مدراس کے اجلۂ علماء میں سے تھے، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم اور مولانا سید عبدالوہاب بخاری صاحب کے قریب ترین رفقاء میں سے تھے، مدرسہ جمالیہ مدراس میں تعلیم دیتے تھے۔ عربی ادب سے خصوصی تعلق تھا، اردو کے اچھے خاصے شاعر تھے، روحانیت میں حضرت مولانا سید احمد مدنیؒ سے نسبت وارادت رکھتے تھے، راقم سے قدیم دینی وعلمی تعلق تھا۔ متعدد بار حج وزیارت کی سعادت پائی تھی، حرمین شریفین سے والہانہ تعلق تھا، دو بار حجاز مقدس میں راقم اور مولانا مرحوم یکجا رہے۔ ان کی ہر مجلس شروع سے آخر تک علمی اور دینی ہوا کرتی تھی، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق سے نوازے۔

(البلاغ مارچ ۱۹۷۲ء)

مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی

۱۹۷۲ء

مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی مئو(اعظم گڑھ) یکم ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ ۱۹۷۲ء کو ان کا وصال علمی و دینی حادثہ ہی نہیں، بلکہ سیاسی حادثہ بھی ہے، مولانا مرحوم زبردست عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ بے باک اور نڈر لیڈر بھی تھے، جامعہ مفتاح العلوم کی نظامت وصدر مدرسی کے ساتھ ساتھ ملکی اور سیاسی معاملات میں پورا دخل رکھتے تھے، ان کی اصابت رائے، بلند ہمت، پاکیزہ کردار اور صاف گوئی کے سب ہی قائل تھے، مصلحت ان کے یہاں کوئی چیز نہیں تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ بے پناہ مقبولیت کے مالک تھے اور موافق ومخالف سے ہی ان کا احترام کرتے تھے، ان کے جنازہ میں بلا مبالغہ تیس ہزار کے لگ بھگ لوگ شریک ہوئے۔ یہ ان کی مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔

(البلاغ محرم ۱۳۹۳ھ)

مولانا عبدالصمد رحمانیؒ

مئی ۱۹۷۳ء

حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی نے گزشتہ ماہ انتقال فرمایا رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ہماری پرانی بزم کے معزز ترین رکن تھے، صوبہ بہار کے نائب امیر شریعت تھے، تقویٰ، طہارت، سادگی اور وضعداری میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، کئی چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف تھے، مسئلہ قضاء وغیرہ پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، آل انڈیا تعلیمی کنونشن کے موقع پر مولانا مرحوم سے نیاز حاصل ہوا تھا، اس وقت عمر کافی تھی، آخری وقت تک درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہے اور ضعف وناتوانی کے باوجود عزم وحوصلہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

تدبرِ قرآن اور تفقہِ دین میں خاص نظر کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کا نعم البدل دے۔ (البلاغ جون ۱۹۷۳ء)

مولانا عبدالمجید حریری بنارسی

دسمبر ۱۹۷۲ء

پچھلے دنوں ہندوستان میں کئی اہم اموات ہوئیں جو اپنے اپنے حلقہ میں خلاء کا باعث ثابت ہوئیں، دسمبر ۱۹۷۲ء میں مولانا عبدالمجید حریری بنارسی نے انتقال کیا، وہ عربی، انگریزی، فارسی، ترکی اور دیگر زبانوں کے صرف عالم ہی نہیں تھے بلکہ ماہر تھے، اور علمی قابلیت کی وجہ سے ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی شہرت کے مالک تھے۔ جب ترکی سے خالدہ خانم ہندوستان آئی تھیں اور وہ مختلف مقامات میں ترکی زبان مین تقریر کرتی تھیں تو مولانا عبدالمجید حریری برجستہ ان کا ترجمہ کیا کرتے تھے، ان کے تعلقات دنیا کے بڑے بڑے لوگوں سے بھی تھے، مولانا موسیٰ جاراللہ روسی سے انھوں نے ترکی زبان حاصل کی تھی ،اوران کے جاپان جانے اور ہندوستان واپس آنے کے سلسلہ میں مولانا حریری کا بڑا ہاتھ تھا ،مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے خصوصی تعلقات تھے، وہ سعودی عرب کے سفیر بھی تھے، اور سفارت کے بعد بہت دنوں تک سعودی عرب میں مقیم رہے، بنارس کے ایک خوش حال خاندان سے تھے، افسوس کہ سیاسی جھمیلوں اور دوسری مصروفیتوں نے ان کے علمی کارناموں کو اجاگر ہونے نہیں ہونے دیا، اور وہ اس میدان میں پورے طور سے نہیں آسکے۔ رحمۃ اللہ علیہ

(روزنامہ انقلاب ممبئی ۲؍جنوری ۱۹۷۳ء)

مولانا عثمان صاحب فارقلیط

۱۲/ جون ۱۹۷۶ء

۱۳/ جمادی الثانیہ ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۲/ جون ۱۹۷۶ء کو مولانا عثمان صاحب فارقلیط نے دہلی میں ۶۷/ سال کی عمر میں انتقال کیا، غفر اللہ لہ ورحمہ۔

مولانا فارقلیط اردو صحافت کے قدیم بزرگوں میں سے تھے، ان کا وطن پلکھوہ ضلع میرٹھ تھا ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے تھے، قدیم درسگاہ کے فارغ تھے، ساتھ ہی انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ ہندی، سنسکرت بھی جانتے تھے، ان کی علمی ودینی زندگی کا آغاز آریوں اور عیسائیوں کے مناظرہ سے ہوا، اس کے بعد صحافت کے میدان میں آئے تو پوری زندگی اسی میں گزاردی، نہایت جری اور نڈر صحافی تھے، ان کے قلم میں بلا کا زور تھا، مسلمانوں کو ان کی صحافت سے بہت فیض پہنچا، قدیم دور کے اخبار ''الجمعیۃ'' سے صحافت شروع کی، اس کے بعد اخبار ''مدینہ'' بجنور میں رہے، پھر اخبار ''زمزم'' لاہور کے ایڈیٹر ہوئے۔ جنوری ۱۹۴۵ء سے ابتدائے اگست ۱۹۴۷ء تک راقم ان کے ساتھ اخبار ''زمزم'' لاہور میں رہا اور ان کی نگرانی میں اردو زبان میں ''منتخب التفاسیر'' ساڑھے نو سو سے زائد صفحات میں لکھی، وہ میرے صحافت کے استاد ہیں، اور میں نے ان سے اردو صحافت سیکھی ہے۔ نہایت سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے، کم آمیز تھے، اپنے کام سے کام رکھتے تھے، ان کو دیکھ کر ان کے عظیم صحافی ہونے کا یقین نہیں ہوتا تھا، تقسیم ہند سے کچھ پہلے راقم اپنے وطن چلا آیا، اس کے بعد مولانا فارقلیط بھی آگئے، اور روزنامہ ''الجمعیۃ'' کی ادارت سنبھالی، اس دور میں ان کے قلم نے ملت اسلامیہ کی خدمت میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ ان کا ہے حق ہے، اس سلسلہ میں قید وبند سے بھی دوچار ہوئے، مگر اس بوڑھے کی صحافت پر شباب ہی چھایا رہا، علم النفس سے خاص لگاؤ تھا، جس کی جھلک ان کی صحافت میں نمایاں تھی، اس موضوع پر ان کی اردو میں دو کتابیں بھی ہیں غالباً ان کا نام ''کلید خود شناسی'' اور رہنمائے عقل'' ہے، اللہ تعالیٰ ان کو امت مسلمہ ہندیہ کی طرف سے بہترین جزادے اور ان کے ساتھ مغفرت ورحمت کا معاملہ کرے۔ (البلاغ جولائی ۱۹۷۶ء)

مولانا عبدالباطن صاحب جونپوری

۱۹۷۴ء

شعبان میں مولانا حافظ عبدالباطن صاحب جونپوری نے بنگلہ دیش میں انتقال فرمایا، ان کی عمر نوے کے لگ بھگ رہی ہوگی، وہ جون پور کے مشہور علمی ودینی خاندان کے چشم و چراغ تھے، مصلح بنگال حضرت مولانا کرامت علی جون پوری کے پوتے اور مولانا عبدالاول جون پوری کے صاحب زادے تھے، راقم سے بے انتہا محبت کرتے تھے، انہوں نے میرے نانا مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری مرحوم سے ڈھاکہ میں شرحِ وقایہ، شرحِ تہذیب وغیرہ پڑھی تھی اوراس استادی کی نسبت کے احترام میں راقم کے ساتھ بڑی شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے، جب جون پور حاضری ہوتی توان کی خدمت میں جانا ضروری ہوتا تھا، لطف لے لے کر اپنے استاد یعنی نانا مرحوم کے واقعات سناتے تھے، بنگلہ دیش میں ان کے ہزاروں مریدین ہیں، جن میں اونچے اونچے سرکاری ارکان بھی شامل ہیں، ان ہی کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے تھے، کئی کتابوں کے مصنف تھے، اللہ تعالیٰ اپنے جوارِ رحمت میں ان کو جگہ دے آمین۔

(البلاغ فروری ۱۹۷۴ء)

مولانا عبدالباقی رسول پوری مبارکپوری

۳۱؍اگست ۱۹۷۶ء

مولانا عبدالباقی صاحب رسول پوری ایڈوکیٹ اعظم گڑھ نے سہ شنبہ ۴؍رمضان ۱۳۹۶ھ (۳۱؍اگست ۱۹۷۶ء) کو انتقال کیا۔ رحمہ اللہ وغفرلہ۔

اس وقت ان کی عمر نوے کے قریب رہی ہوگی۔ وہ ہمارے ضلع کے مشہور وکیل وعالم تھے، علمائے رسول پور کی آخری یادگار تھے، عربی کی تعلیم اپنے والد مولانا عبدالعلیم صاحب اور مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی وغیرہ سے مدرسہ چشمہ رحمت غازی پوری میں حاصل کی، اس کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی.اے.ایم.اے.، ایل.ایل. بی.کی ڈگری حاصل کرکے وکالت کا پیشہ اختیار کیا تو زندگی بھر اسی سے متعلق رہے، مگر مولویت وکالت پر غالب رہی وضع قطع لباس ہیئت ٹھیٹ مولویانہ رہی، احادیث وتفاسیر کا مطالعہ ہمیشہ جاری رہتا تھا، فتویٰ نویسی بھی کرتے تھے، اور ہدایہ وغیرہ کا درس بھی دیا کرتے تھے، رشتہ میں راقم کے ماموں ہوتے تھے، ادھر، پچھلے چند سالوں سے ان سے بہت زیادہ تعلق ہوگیا تھا، ان کی مجلس خالص علمی ودینی تھی، بڑے قانع وصابر تھے جو کچھ کمایا، خاندان والوں کی تعلیم وپرورش پر خرچ کیا، سادہ کھانا کھایا، سادہ پہنا اور سیدھی سادی زندگی بسر کی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

(البلاغ ستمبر ۱۹۷۶ء)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

۶؍جنوری ۱۹۷۷ء

افسوس کہ پچھلے کئی ماہ سے جس حادثہ کا کھٹکا لگا رہتا، اس کا ظہور ہوگیا یعنی پنجشنبہ ۱۵؍محرم ۱۳۹۷ھ مطابق ۶؍جنوری ۱۹۷۷ء کو حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ نے ۸۵؍سال کی عمر میں انتقال کیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ غفر اللہ لہ ورحمہ، اور ان کے ساتھ علم وفن تحقیق، فلسفہ، تنقید، ادب، انشاء کے علاوہ قرآنی رموز اور روحانی اسرار کا خزانہ ''دفینہ'' بن گیا۔ مولانا دریابادیؒ اپنی مختلف الحیثیات شخصیت کی وجہ سے انجمن تھے، جو اجڑ گئی، ایک قوم تھی جو مٹ گئی، ایک چمن تھے جو نہ رہا۔

ان کی زندگی کی ابتداء جدید تعلیم کے الحادی میدان سے شروع ہوئی، اور اس کا خاتمہ خالص دینی وروحانی گوشۂ عافیت میں ہوا، وہ صحیح معنوں میں قدیم وجدید کے جامع تھے، ابتدا میں فلسفہ ونفسیات کے عالم تھے، آخر میں قرآن وتصوف کے شارح بنے، انگریزی کے زبردست ادیب، عربی فارسی کے عالم، اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز، نقاد اور طرز نگار تھے، یوں تو مولانا کی ہمہ گیر شخصیت کے علمی دینی کارنامے بہت ہیں مگر اردو اور انگریزی میں ان کی تفسیر ماجدی موجودہ عالم اسلام کے لیے ہندی مسلمانوں کی طرف سے خاص دین ہے، جو قدیم وجدید طبقوں کے لیے یکساں مفید اور ضروری ہے اور اس کی افادیت وضرورت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

مولانا نے تاریخ وتذکرہ، شعر وادب، فلسفہ شخصیات اور طنز وتنقید پر بہت کچھ لکھا ہے اور اپنے اخبار ''سچ'' اور ''صدق'' کے ذریعہ اردو ادب کو نیا اسلوب دیا ہے، خاص طور سے ''سچی باتیں'' کا جواب نہیں ہے۔

مولانا کی وفات علمی اور دینی حادثہ ہے، جس سے ہندو پاک خصوصاً اور عالم اسلام

عموماً متاثر ہے، ان میں بہت سے لوگ بھی ہیں، جوان کی غم وفات کو ذاتی غم سمجھتے ہیں، ان ہے میں یہ راقم بھی ہے۔

مولانا مرحوم اپنے اس خادم پر خصوصی شفقت فرماتے تھے اور اس کے تصنیفی کاموں کے بڑے قدرداں اور مداح تھے، اس سلسلہ میں ان کے متعدد خطوط میرے پاس ہیں اور صدق میں بھی بہت کچھ ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو ان کے علمی ودینی خدمات کو بہترین جزادے، ان کو اپنی جوارِ رحمت میں رکھے اور ہم غم نصیبوں کو ان کا نعم البدعطا فرمائے آمین۔

(البلاغ فروری ۱۹۷۷ء)

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام اور ان کے ہفتہ وار اخبار ''سچ'' لکھنؤ سے میری پہلی واقفیت ۱۹۳۱ء (۱۳۵۰ھ) کے بعد یوں ہوئی کہ میں نے مدرسہ احیاء العلوم میں اسی سال عربی شروع کی تھی، اور جمعیۃ الطلبہ کا نیا نیا قیام ہوا تھا، جس کی طرف سے دینی اور ادبی مجلّات ورسائل آتے تھے اور ہم لوگ نہایت ذوق وشوق سے ان کا مطالعہ کرتے تھے، ان میں ہفتہ وار ''سچ'' اس قدر مقبول تھا کہ ہر طالب علم اس کو دیکھنے میں سبقت کرتا تھا، اس وقت میری عمر تقریباً پندرہ سال کی تھی، اس کی سچی باتیں ہمارے لیے بہت ہی دلچسپ ہوا کرتی تھیں، جب عمر اور بڑھی اور معلومات میں اضافہ ہوا تو پتہ چلا کہ مولانا دریابادیؒ خیالات وافکار کی مختلف وادیوں میں بھٹکتے ہوئے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے در پر پہنچے اور وہاں سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خانقاہ میں پہونچائے گئے اور سیاسی وملکی تحریکات میں وہ کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے مخالف اور مسلم لیگ کے حمایتی ہیں، یہ دور ملک کی سیاست میں بڑا بحرانی تھا، مسلم لیگ اور کانگریس کے نام پر پورے ملک میں اختلافات تھے اور ہم طلبہ احیاء العلوم اپنے استاد مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری کی زیر تربیت جمعیۃ علماء اور کانگریس کے خادم تھے اس لیے مولانا عبدالماجد صاحب کی تحریروں کو تنقیدی نقطہ نظر سے پڑھنے کے عادی ہوگئے، اسی حال میں میرا طالب علمی کا دور ختم ہوا اور ۱۹۴۰ء (۱۳۵۹ھ) میں فراغت کے بعد سے ۱۹۴۴ء (۱۳۶۲ھ) تک مدرسہ احیاء العلوم میں مدرسی

کا دور گزرا، اس میں بھی مولانا دریابادی سے کوئی انس وتعلق پیدا نہ ہوسکا، اس کے بعد میں جنوری ۱۹۴۵ء میں اخبار سہ روزہ ''زمزم'' لاہور سے متعلق ہوا جو مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط کی ادارت میں نکل رہا تھا اور نیشنلسٹ مسلمانوں کا مقبول اخبار تھا، اسی زمانہ میں مولانا فارقلیط صاحب کے اشارے میں میں نے ''زمزم'' میں ایک مضمون ''مولانا عبدالماجد دریابادی کا نیا فلسفہ خیر وشر'' کے عنوان سے لکھا، اس زمانہ میں جمعیت علماء اور نیشلسٹ مسلمانوں کے خلاف مسلم لیگ کی طرف سے ہر جگہ شدید اقدامات ہوتے تھے اور ان کی تذلیل وتحقیر کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھا جاتا تھا۔ اسی سلسلہ میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی شان میں مختلف مقامات پر گستاخیاں اور بدتمیزیاں کی گئیں، جن کے جواز کے لئے مولانا دریابادی نے اپنے اخبار ''صدق جدید'' میں لکھا کہ یہ سب کچھ اس مولانا حسین صاحب مدنی کے ساتھ نہیں کیا جارہا ہے، جو دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، عابد وزاہد ہیں، متقی پرہیز گار ہیں اور ایسے ایسے ہیں بلکہ یہ سب کچھ اس مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ کیا جارہا ہے جو کانگریس کے ساتھ ہیں، مسلمانوں کی رائے عامہ کے خلاف ہیں اور ایسے ایسے ہیں، اسی کا جواب میں نے زمزم میں فارقلیط صاحب کے مشورہ سے دیا تھا، اس وقت میری عمر ۲۸ یا ۲۹ سال کی تھی، اپنی طاقت بھر خوب کافی وشافی جواب دیا تھا، غالب گمان ہے اسی مضمون کے بعد سے مولانا کو راقم کا نام معلوم ہوا ہوگا، زمزم اور صدق میں باہمی تبادلہ تھا، مولانا نے وہ مضمون ضرور پڑھا ہوگا، ویسے میں طالب علم کے زمانہ ہی سے شاعری اور مضمون نگاری کرتا تھا اور اخبارات ورسائل میں میرے اشعار اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ میرے ان واسطوں سے۔ مولانا کو میرے بارے میں کچھ واقفیت رہی ہو میں اسی زمانہ میں ''زمزم کمپنی لمٹیڈ لاہور'' کے زیر اہتمام مولانا فارقلیط صاحب کی نگرانی میں منتخب التفاسیر'' کے نام سے قرآن کریم کی ایک تفسیر جمع کررہا تھا، جو ہندوستان میں لکھی گئی تمام تفسیروں کا خلاصہ تھا، یہ کام میں نے تقریباً دو سال میں ساڑھے نو سو صفحات سے زائد میں مکمل کیا تھا اور تیرہ پاروں کی کتابت بھی ہوچکی تھی، مگر تقسیم ملک کے بعد اس کا کیا حشر ہوا معلوم نہیں،

نہ مولانا فارقلیط لاہور جاسکے نہ میں جاسکا، معلوم نہیں، اصل مسودہ بھی لاہور میں موجود ہے یا نہیں؟ اس تفسیر کے سلسلے میں سچ اور صدق کے تقریباً تمام وہ پرچے میرے سامنے تھے، جن میں مولانا دریابادی کی تفسیر شائع ہوتی تھی، اس وقت تک غالباً سات پارے تک کی تفسیر صدق میں آچکی تھی، میں اسی سے مولانا دریابادی کی تفسیر نقل کرتا تھا، اب ان کے بارے میں خیالات میں صحت مند تبدیلی آچکی تھی، اس زمانہ میں مولانا فارقلیط کے نام مولانا دریابادی کے خطوط آیا کرتے تھے، جن میں تفسیری خدمت پر خوشی کا اظہار اور کچھ مفید مشورے ہوا کرتے تھے، مولانا فارقلیط صاحب اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے خط وکتابت سے گھبراتے تھے اور مولانا دریابادی کے جوابات دینے میں اور بھی کوتاہی کرتے تھے، مجھ سے فرماتے تھے کہ مولانا دریابادی کسی موقع سے میرے خطوط چھاپ سکتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ان کی اشاعت میرے نقطہ نظر سے صحیح نہ ہو، اس لیے میں جواب دینے میں احتیاط کرتا ہوں۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ملکی تقسیم سے کچھ پہلے میں اور مولانا فارقلیط اپنے اپنے وطن چلے آئے، مولانا نے مجھ سے کہا کہ پہلے آپ جائیں، بعد میں میں بھی آرہا ہوں، لاہور اور امرتسر میں کش مکش ہوگی، کچھ دن گزرنے کے بعد میں لاہو آؤں گا اور آپ کو لکھوں گا تو آپ بھی آجایئے گا۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں ہم لوگوں کی موجودگی میں لاہور میں سخت فساد ہوا تھا، اسی کے پیش نظر مولانا نے یہ ارادہ کیا تھا، مگر تقسیم کے بعد نہ وہ جاسکے اور نہ میں ہی پہونچ سکا، کچھ دنوں کے بعد وہ الجمعیۃ کے ایڈیٹر ہوگئے اور میں نے بہرائچ سے مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی پارلیمنٹری سکریٹری حکومت یوپی کے زیرِ نگرانی ہفتہ وار ''انصار'' نکالنا شروع کیا، اس زمانہ میں عبدالرازق ملیح آبادی اپنے اخبار میں مولانا دریابادی کے سخت خلاف لکھتے تھے، اسی سلسلے میں ایک مرتبہ انھوں نے مولانا دریابادی کو نہایت ناگوار اور پھکڑانہ انداز میں یاد کیا، اور میں نے ''انصار'' میں ملیح آبادی صاحب کے خلاف لکھ کر مولانا دریابادی کی حمایت کی، گویا ''زمزم'' لاہور کی گستاخی کا کفارہ انصار بہرائچ میں ادا کیا۔ اس واقعہ کے بعد سے مولانا دریابادیؒ نے مجھ پر خصوصی توجہ فرمانی شروع کردی، اور اکثر وبیشتر میرے نوٹ انصار

سے صدق میں نقل کرنے لگے اور دو ایک سطر میں ان کی اہمیت بھی ظاہر کر دیا کرتے تھے، میں ''انصار'' میں فسادات وغیرہ کے بارے ۔ یں نہایت کھل کر لکھتا تھا، اس زمانہ میں بہرائچ کے ٹھاکر حکم سنگھ یوپی کے ویز یر مالیات تھے، وہ وزیر اعلیٰ مسٹر ولبھ پنتھ کے پاس اکثر انصار کے پرچے لے کر پہونچ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ایک سرکاری آدمی کی نگرانی میں نکلنے والے اخبار میں اس قسم کی باتی ہوتی ہیں اور مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی مجھ کو فہمائش کر دیا کرتے تھے، بعض اوقات حکومت یوپی کی طرف سے میرے نام تنبیہ بھی آیا کرتی تھی، آخر آٹھ نو ماہ کے بعد انصار کو بند کرنا پڑا، اس کے بعد میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) چلا آیا، پھر ایک سال کے بعد بمبئ آ کر پہلے روز نامہ ''جمہوریت'' پھر روز نامہ ''انقلاب'' سے متعلق ہو گیا، اسی دوران میرا انجمن خدام النبی صابو صدیق مسافر خانہ بمبئ سے تعلق پیدا ہوا اور وہاں سے رسالہ ''البلاغ'' کا اجرا ہوا تو میں بھی اس کی ادارت میں شامل ہو گیا، انجمن خدام النبی کے روح رواں بمبئ کے مشہور میمن تاجر محمد احمد برادرس تھے، خاص طور سے مرحوم احمد غریب صاحب گویا انجمن کے سب کچھ تھے، وہ بمبئ اور ہندوستان میں اپنی خدمات کی وجہ سے نیک نام تھے، اور مولانا دریابادیؒ کے انتہائی معتقد تھے، بچپن سے صدق پڑھتے تھے اور اس کے مضامین کا ترجمہ اپنے جماعتی اخبار ''میمن ویلفئر'' بمبئ اور ''مسلم گجرات'' سورت میں شائع کرتے تھے، گجراتی کے بہت اچھے ادیب تھے، مزاج علمی اور دینی تھا۔ ان کے یہاں مولانا دریابادیؒ کے خطوط آتے جاتے تھے اور جانبین میں بڑی محبت و یگانگت تھی حالاں کہ دید و شنید کی باری اب تک نہیں آئی تھی، بس دونوں طرف سے غائبانہ تعلق و تعارف تھا، اسی طرح الحاج محی الدین منیری صاحب بھی مولانا کے شیدائیوں اور فدائیوں میں تھے، اور دریاباد جا کر مولانا کی زیارت کر آئے تھے، اس زمانہ میں محمد احمد برادرس یعنی چاروں بھائی محمد، احمد غریب، حافظ محمد صدیق اور عبدالکریم صبح کو مجھسے ریاض الصالحین پڑھا کرتے تھے اور میں ان کے گھر پر فجر بعد اس کا درس دیا کرتا تھا، بمبئ میں میرے قیام کی بڑی وجہ مرحوم احمد غریب صاحب کی ذات تھی، وہ اکثر مولانا ماجد دریابادی کے آئے ہوئے خطوط دکھایا کرتے تھے،

اسی زمانہ میں برما سے ایک بڑی رقم خدمت قرآن کے لئے مولانا کو ملی، درمیان میں مرحوم احمد غریب صاحب تھے اس سلسلے میں ہر دوسرے تیسرے دن مولانا کے خطوط ان کے پاس آیا کرتے تھے، اسی درمیان میں مولانا دریابادی کو کہیں سے خبر لگ گئی کہ اس رقم کے لئے لکھنؤ کے ایک بزرگ بھی کوشش کر رہے ہیں تو ان کے خطوط تیزی سے آنے لگے، مولانا کو معلوم تھا کہ میرا احمد بھائی مرحوم سے خاص تعلق ہے، اور میں ان کے یہاں ریاض الصالحین کا درس دیتا ہوں، اس لئے اکثر خطوط میں سلام لکھ دیا کرتے تھے اور میں بھی سلام کرنے کی تاکید کیا کرتا تھا، اسی درمیان میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ صاحب کی ہمت افزائی اور تاکید واصرار پر ''معارف'' اعظم گڑھ میں میرے مقالات ومضامین آنے لگے، رجال السند والہند کے علاوہ بعض کتابیں شائع ہوئیں، ان باتوں کی وجہ سے مولانا دریابادیؒ میری کتابوں اور مضامین کے علاوہ حالات سے بھی ایک حد تک واقف ہوگئے تھے اور میرے کاموں کی بڑی قدر فرمانے لگے 'بڑوں' میں مولانا دریابادیؒ نے اپنے قلم سے جس قدر میری ہمت افزائی کی ہے اور میرے کاموں کو سراہا ہے، میرے لیے باعث اطمینان ہے، جب مولانا میرے کسی کتاب پر صدق میں تبصرہ کرتے تو ان کے معاصر قسم کے بعض اہلِ علم ناقدین مجھ سے کہا کرتے تھے کہ ماجد میاں کا قلم بہت بخیل ہے، مگر معلوم نہیں کیوں آپ کے بارے میں بڑا سخی ہے اور خوب داد دیتا ہے۔

۱۹۶۴ء سے ندوۃ المصنفین دہلی کے ناظم محترم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے اسلامی ہند کی تاریخ پر میری کتابیں شائع کرنی شروع کیں، نیز بعض کتابیں دوسرے اداروں سے شائع ہونے لگیں، اور میں اپنی ہر چھوٹی بڑی کتاب اولین فرصت میں مولانا دریابادیؒ کی خدمت میں بھیجنے لگا نیز صدق جدید ہلکے پھلکے مراسلات ومضامین دینے لگا، لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآبادی کی مطبوعات پر خاص طور سے صدق میں مراسلہ دیتا تھا، اس کے بعض مباحث مثلاً قرآن حکیم کے فارسی تراجم، اور شاہ نعمت اللہ کے قصیدے کے بارے میں حصہ لیا ''البلاغ'' سے میرے مضامین کے اقتباسات بھی بعض اوقات صدق میں

دیا کرتے تھے، مگر اب تک مولانا سے نیاز حاصل نہیں ہوا تھا، اور آخر میں تین ملاقاتیں ہوئیں، پہلی ملاقات دارالمصنفین اعظم گڑھ میں یوں ہوئی کہ میں وطن میں تھا، ایک مرتبہ حسب عادت دارالمصنفین گیا تو مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندویؒ نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ ہے، آپ بھی آجایئے، چناں چہ میں حاضر ہوا، اس حاضری کا خاص داعیہ مولانا دریابادیؒ سے ملاقات کرنا تھا، دس بجے دن سے چار بجے شام تک دارالمصنفین میں مولانا کی معیت رہی، بہت اخلاق ومحبت سے ملے، اہل علم اور باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کی موجودگی میں اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور گھنٹوں مختلف موضوعات پر گفتگو فرماتے رہے، کھانا کھانے کے بعد چند کتابیں کتب خانہ سے منگوائیں اور ان کی مراجعت کرتے رہے، اس وقت میں بھی ان کی خدمت میں موجود رہا، اس کے بعد دوسری ملاقات بھی دارالمصنفین ہی میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے موقع پر ہوئی، یہ ملاقات سرسری رہی، ملک کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے، اہلِ علم مولانا سے استفادہ کررہے تھے اور اس میں دخل دینا مناسب نہیں تھا۔ تیسری ملاقات بمبئی میں دارالمصنفین کے وفد کی آمد کے موقع پر ہوئی تھی، یہ بھی کہنا چاہئے کہ سرسری ہی رہی۔ (البلاغ ممبئی ۱۹۷۷ء)

مولانا عبدالباری ندوی

۲۷ رمحرم کو مولانا عبدالباری ندوی نے لکھنؤ میں انتقال کیا، ان کی عمر پچاسی سال کی تھی، وہ ایک عرصہ سے صاحب فراش تھے، وہ بھی فلسفہ جدید کے ماہر اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں اس کے استاذ رہ چکے تھے، ان میں جدت وقدامت کا امتزاج تھا، ایک زمانہ میں فلسفہ کا غلبہ رہا، پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی صحبت وارادت نے ان میں روحانی واحسانی انقلاب پیدا کردیا، علامہ شبلی کے تلامذہ اور مولانا سید سلیمان ندوی کے معاصرین میں تھے، فلسفہ اور تصوف پر ان کی کئی کتابیں ہیں ایک کی کتاب اقتصادیات پر بھی ہے، ان کی وفات مسلمان ہند کی علمی ودینی نقصان ہے۔ (البلاغ ۱۹۷۸ء)

ڈاکٹر عبدالحلیم محمود شیخ الازہر

اکتوبر ۱۹۷۸ء

وسط اکتوبر ۱۹۷۸ء میں الامام الاکبر الدکتور عبدالحلیم محمود شیخ الازہر نے قاہرہ میں انتقال کیا، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً،

جامعہ ازہر کی طرح مشیخۃ الازہر کا عہدہ بھی قدیم زمانہ سے پورے عالمِ اسلام میں بہت ہی محترم ومعزز مانا گیا ہے، نیز مرحوم شیخ الازہر اپنے ذاتی اوصاف وکمالات اور نیکی وشرافت کی وجہ سے بے حد مقبول تھے، ۱۹۷۳ء میں اس عہدہ پر فائزہ ہو کر نہایت کامیابی اور نیک نامی سے خدمات انجام دیں، اسلام پر فلسفۂ روحانیت، خصوصاً غزلیات کے ماہر اور ترجمان تھے ۱۹۴۰ء میں فرانس سے ''اسلام میں تصوف'' پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، عربی اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان کے ماہر تھے، تقریباً تیس چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف ومترجم تھے، کئی اعتبار سے جامعہ ازہر میں ان کی مشیخت کا دور پُر آشوب تھا، صدر جمال عبدالناصر کے دور سے جامعہ ازہر حکومت وسیاست کے دباؤ میں آ گیا تھا، اور حکومت کی مداخلت کی وجہ سے اس کے دینی وتعلیمی اور تربیتی نظام میں بڑا خلل پڑ رہا تھا، اوقاف میں بے جا مداخلت پر احتجاج کر کے کئی ماہ تک جامعہ ازہر سے ترک تعلق کیا، اس زمانہ کے تنخواہ تک نہیں لی، اور اس قضیہ کا سلسلہ وزیرِ اوقاف الشیخ حسین الذہبی کے قتل واغتیال پر ہوا۔ حکومت کی پالیسی سے اختلاف کی وجہ سے بعض اوقات مصالح کے پیش نظر خلاف طبع بھی کام کرنا پڑا۔ وہ متعدد بار ہندوستان تشریف لائے اور مہینوں یہاں کے اسلامی اداروں کی علمی ودینی سیر کی، شاید کسی شیخ الازہر کو یہ موقع نہیں ملا تھا، جمعیت علمائے ہند کے توسط سے جامعہ ازہر میں ہندوستانی طلبہ کے داخلہ کا انتظام کیا۔

جس وقت جنوری ۱۹۷۸ء میں ہم قاہرہ پہونچے، مصر ہنگامی سیاست کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، امریکہ، اسرائیل، مصر اور سارے عرب ممالک کے حکمراں اور نمائندے، یہاں دھاوا بول رہے تھے اسی زمانہ میں بوہروں کے پیشوا اپنی جماعت کے ساتھ سیدہ زینب کے مزار کے لیے سونے چاندی کی ضریح لائے تھے اور شیخ الازہر بے حد مصروف تھے، ملاقات کے لیے وقت نہیں مل رہا تھا، ایک دن ڈاکٹر عبدالعزیز عزت، ڈاکٹر احمد جابر اور ان کے داماد (غالبًا ڈاکٹر داؤد) نے پروگرام بنایا کہ ادارۃ الازہر کے آفس ہی میں ملاقات ہو جائے مگر تین گھنٹہ تک ایک ہنگامی میٹنگ چلتی رہی اور ہم مرحوم سے ملاقات نہ کر سکے، ویسے بمبئی اور مکہ مکرمہ میں زیارت کی حد تک ان سے ملاقات ہوئی تھی۔

خدا کرے ان کے بعد جامعہ ازہر کے اس جلیل عہدہ پر علم و عمل سے بھرپور شخصیت فائز ہو اور اس کی قدیم روایات کو زندہ رکھ کر اس کی افادیت کو چار چاند لگائے۔ آمین۔

(البلاغ نومبر ۱۹۷۸ء)

مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی

۲۸ / اکتوبر ۱۹۷۸ء

۲۸ / اکتوبر ۱۹۷۸ء کو ہندو پاک کے مشہور ادیب و عالم مولانا عبدالعزیز المیمنی راجکوٹی نے کراچی میں انتقال کیا، وہ برصغیر کے بین العالمی عربی زبان کے ادیب و محقق تھے، ان کی کئی گراں قدر تصانیف و تحقیقات ہیں، وہ شبلی و حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کے صحبت یافتہ علماء میں سے تھے، اور متعدد یونیورسٹیوں میں عربی کے صدر شعبہ رہ چکے تھے، گزشتہ دنوں شام کے مشہور عالم دین حبنکہ نے بھی انتقال کیا موجودہ حالات میں وہ ملک شام کے علماء میں بسا غنیمت اور دین کے داعی تھے، اسی طرح اردن کے مشہور ادیب اور ممتاز عالم دین شیخ تیسر الظبیان نے انتقال کیا، پہلے دمشق سے ''الجزیرہ'' کے نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے،
پھر ''الشریقہ'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، جو آخر تک جاری رہا، کئی مدرسے چلاتے تھے اور دین کی خدمت میں بہت آگے تھے۔

نیز پشاور کے مقام اکوڑہ خٹک کے مشہور عالم مولانا بادشاہ گل بخاری کی وفات ماضی قریب میں ہوئی، جو اپنی قائم کردہ جامعہ اسلامیہ کے مہتمم تھے، اللہ تعالیٰ ان تمام بزرگوں کی مغفرت فرمائے اور امت کو ان کا نعم البدل دے آمین۔

ہمارے زمانۂ طالب علمی میں ہندوستان میں تین علماء عربی زبان کے مشہور ادیب تھے، جو عربی ادب میں عبقریت رکھتے تھے، مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی، مولانا ابوعبداللہ محمد سورتی اور مولانا اعزاز علی مدرس دارالعلوم دیوبند، ان میں اول الذکر اس فن میں عالمی شہرت کے مالک تھے اور عرب ممالک اور یورپ کے مستشرقین میں ان کو بڑا مقام حاصل تھا، مولانا عبدالعزیز میمنی کا نام سب سے پہلے ایک ادبی چشمک میں دیکھنے میں آیا، ان کی معرکۃ الآراء کتاب سمط اللآلی، شرح الامالی لابی علی القالی پر مولانا ابوعبداللہ سورتی نے اعتراضات کی بھر

مارکی، جن کے جوابات مولانا عبدالعزیز میمنی نے تفصیل سے دیئے، یہ اعتراضات وجوابات معارف اور برہان میں شائع ہوتے تھے، غالباً میں اس زمانہ میں مقامات حریری پڑھتا تھا اور مجھے عربی ادب کا نیا نیا شوق تھا، اس لیے ان بحثوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھتا تھا، جس سے اچھی خاصی ادبی ولسانی معلومات ہوئیں، آخر میں مولانا اعزاز علی صاحب نے دونوں ادیبوں کے درمیان محاکمہ شائع کیا۔

اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں مولانا میمنی سے ملاقات ہوئی اور کئی دن تک ان کی علمی مجلس میں شریک رہا، وہ کراچی سے بمبئی آئے اور صابوصدیق انسٹی ٹیوٹ شیفر روڈ بمبئی میں یہاں کے اہل علم کی ایک علمی نشست ہوئی، جس میں ''فارسی شاعری پر عربی شاعری کے اثرات'' کے موضوع پر میمنی صاحب اظہار خیال کر رہے تھے، میں چار بجے شام کو دفتر انقلاب سے نکل کر اس میں گیا، میمنی صاحب کی تقریر ہو رہی تھی، میں ایک طرف بیٹھ گیا اور مغرب کے قریب جب یہ مجلس ختم ہوئی تو شہاب الدین دسنوی صاحب نے میرا تعارف کرایا، نام سنتے ہی موصوف مجھ سے لپٹ گئے، سب کو چھوڑ چھاڑ کر اور اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ لے کر بات کرتے ہوئے موٹر تک آئے، ملتے ہی کہا کہ میں نے آپ کا مقالہ ''دولت ماہانیہ سنجان'' معارف میں پڑھا ہے پھر میری ہمت افزائی کی اور کہا کہ آپ کی کتاب رجال السند والہند بھی میں نے پڑھی ہے، اس میں یہ اشعار غلط چھپ گئے ہیں اور بہت سے اشعار رہ گئے ہیں، میں ان کی نشاندہی کر دوں گا، اس کے بعد ان ہی کے ساتھ ان کے میزبان جناب آفندی صاحب راشننگ آفیسر کے مکان پر آیا، جو مینارہ مسجد کے عقب میں واقع تھا، مولانا کئی دن یہاں مقیم رہے اور میں صبح وشام ان کے پاس جایا کرتا اور علم وادب پر ان کی معلومات سے مستفید ہوتا۔ حافظہ غضب کا تھا، بات بات پر عربی کے اشعار برجستہ پڑھا کرتے تھے، بلا مبالغہ ان کو عربی کے لاکھوں اشعار یاد تھے، ان کی علمی وادبی گفتگو میں انا اور خود اعتمادی کا رخ نمایاں رہتا تھا، خلافت معاویہ ویزید کی بات آئی تو کہا کہ ان کو بہت سی نایاب معلومات میں نے دی ہیں۔

مقامات حریری کے بارے میں کہا کہ اس کا سب سے صحیح نسخہ وہ ہے جو نول کشور پریس

میں فارسی ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، کتاب الذخائر والتحف کے مصنف قاضی رشید بن زہیر کا تذکرہ آیا تو اس کے بارے میں معلومات فراہم کیں، مولانا ابوعبداللہ سورتی مرحوم ان کے حریف تھے، جب ان کا نام اور ذکر کرتے تو رضی اللہ عنہ کہتے تھے۔

اس زمانہ میں مولانا کراچی میں حکومت کے تعاون سے ایک علمی ادارہ اور اس کے لیے کتب خانہ قائم کرنے کا پروگرام بنا چکے تھے اور بہت سی کتابیں جمع بھی کر چکے تھے، اس زمانہ میں انجمن خدام النبی بمبئی میں ناسک سے ایک کتب خانہ آیا تھا۔ مولانا نے خواہش ظاہر کی کہ جو کتابیں زائد معلوم ہوں، ان کو میرے نام کراچی منتقل کرا دیں، چناں چہ بہت سی کتابیں ان کو دے دیں گئیں۔ جتنے دن بمبئی میں قیام رہا، میں ان کے پاس برابر آتا جاتا تھا اور وہ کھل کر ہر موضوع پر بات کرتے تھے، ان کی علمی وادبی گفتگو بڑی معلوماتی ہوتی تھی۔

وہ سوراشٹر کے ماقم گونڈل میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے جو راجکوٹ سے قریب ہے، ہندوستان کے مختلف مدارس میں عربی کی تعلیم حاصل کی اورنیٹل کالج لاہور، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور کراچی یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے صدر اور سربراہ رہے۔ المجمع العلمی دمشق کے اعزازی ممبر تھے، جامع ازہر نے ان کی علمی وادبی خدمات پر ڈاکٹریت کی اعزازی ڈگری دی تھی، یورپ کے متعدد علمی اداروں کے ممبر تھے اور عرب ممالک اور یورپ کے متعدد علماء فضلاء سے ان کے تعلقات تھے، یوں تو انہوں نے کئی ادبی کتابیں لکھی ہیں مگر کتاب ''الامالی لابی علی القالی'' کی شرح ''سمط اللآلی'' اور ''ابوالعلاء المعری کی "ماله وماعلیه'' کو عالمی شہرت حاصل ہے، یورپ میں ہندوستان کے دو فضلاء بڑی قدر وعظمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ایک مولانا عبدالعزیز میمنیؒ اور دوسرے ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادیؒ۔ مولانا میمنی نے ۲۸ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو انتقال کیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، عمر اس وقت تقریباً نوے سال کی تھی ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد تھے، مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی کے ساتھ رہ چکے تھے، چھوٹی بڑی ۲۸ر کتابیں لکھیں، ان کی عربی تحریر میں انشاء پردازی کا رنگ نہیں تھا کیوں کہ وہ علمی اور تحقیقی زبان کے عالم ومصنف تھے اور علم وتحقیق کی زبان ان تکلفات سے بری ہوتی ہے، اس کے باوجود ان کی عبارت اور تحریر کا دنیا کے ادباء محققین لوہا مانتے تھے۔ (البلاغ جنوری ۱۹۷۹ء)

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی بارہ بنکویؒ

۸/دسمبر ۱۹۸۳ء

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی بارہ بنکویؒ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز تھے، ایک سو چار برس کی عمر میں ۸/دسمبر ۱۹۸۳ء کو ان کا انتقال ہوا۔ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃ.

ضلع بارہ بنکی کے قصبہ رسولی کے رہنے والے تھے، زہد و تقویٰ، خلوص وللّٰہیت، علم و فضل اور عبادت و ریاضت میں سلف صالحین کی یادگار تھے۔ اخفائے حال کا بے حد اہتمام کرتے تھے، عجز وانکساری کا مجسمہ تھے، علمی استعداد نہایت ٹھوس تھی، زندگی بھر درس و تدریس میں لگے رہے۔ مدینۃ العلوم کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی تھی، جو الحمدللہ کامیابی سے چل رہی ہے۔ مولانا دورۂ حدیث تک کی تعلیم بے تکلف دیا کرتے تھے، وہ اشتہاری پیرومرشد نہیں تھے، ان کے آگے پیچھے خلیفۂ فلاں اور جانشین کا خطاب نہیں لگتا تھا اور نہ اخباری بزرگ تھے، جن کے لیے مریدین مراسلہ بازی کریں۔ ایک زمانہ میں بمبئی بھی آتے تھے مگر ان کے مخصوص حلقہ کے سوا کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی، کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، واقعی وہ بزرگ عالم دین تھے۔ آج جب کہ ہمارے مدرسوں کے ناظم و مہتمم مالک کل بن جاتے ہیں اور ان کو اپنا خاندانی ورثہ بنا کر اپنی اولاد کے لیے کھانے کمانے کا ذریعہ بناتے ہیں، مولاناؒ اپنے قائم کردہ مدرسہ کا اہتمام وانتظام اپنے ایک شاگرد عزیز جو راقم کے بھی شاگرد ہیں مولوی محمد عوف صاحب پینتے پوری سیتاپوری کے حوالے کر کے دنیا سے گئے ہیں اور اخبارات میں باقاعدہ اس کا اعلان کیا کرایا۔ اس ایک واقعہ سے ان کی بزرگی، خلوص اور نیکی وسادگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ناظرین سے گذارش ہے حضرت مولانا کے حق میں دعائے خیر اور ایصال ثواب کریں۔ (انقلاب ممبئی)

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

۱۱/مئی ۱۹۸۴ء

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی دید وملاقات کا شرف مجھے زمانہ طالب علمی ہی سے حاصل تھا، ان دنوں مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور اپنے باحوصلہ اور متحرک ناظم استاذی حضرت مولانا شکر اللہ صاحب کی وجہ سے علماء فضلاء اور ارباب سیاست کا مرکز بن رہا تھا، آئے دن علمی، مذہبی اور سیاسی جلسے جلوس ہوا کرتے تھے، جن میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب، حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب اور دیگر علماء ومشاہیر آیا کرتے تھے، ان میں حضرت مفتی صاحب بھی ہوا کرتے تھے، اسی زمانہ میں ندوۃ المصنفین نیا نیا قائم ہوا تھا، اس کا مجلّہ ''برہان'' اور وہاں کی مطبوعات پابندی سے مدرسہ میں آتی تھیں اور ہم ان سے استفادہ کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب اور وہاں کے مصنّفین سے خصوصی عقیدت کا تعلق تھا۔

اسی دوران میں ایک مرتبہ ندوۃ المصنفین کے دفتر واقع قرول باغ میں حضرت مفتی صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں تکمیل کے لیے ایک سال رہا، اور وہیں سے دہلی گیا تھا، چوں کہ زمانہ طالب علمی میں میرے اشعار اور مضامین رسالہ ''قائد'' مراد آباد میں شائع ہوتے تھے، جو ہمارے بزرگوں کی نظر میں وقیع اور معلوماتی ہوتے تھے، اس لیے حضرت مفتی صاحب نے ازراہِ بندہ نوازی مجھ سے فرمایا کہ برہان کے لیے مضامین لکھا کریں، میں کور کسر درست کردوں گا۔

فراغت کے بعد مدرسہ احیاء العلوم میں تین چار سال تک مدرسی کی، پھر امرتسر گیا اور وہاں سے لاہور پہنچا، جہاں تقریباً تین سال رہا، اسی دوران ملک تقسیم ہوا اور لاہور جانا

نصیب نہ ہوسکا، کسی معقول جگہ کی تلاش تھی، کئی دروازوں پر دستک دی مگر کامیابی نہیں ہوئی، آخر میں مفتی صاحب کو لکھا کہ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل بنائے گئے، آپ ان کے پاس میرے لیے سفارش لکھ دیں تاکہ مجھے کوئی نوکری مل جائے، مفتی صاحب نے جواب دیا کہ آپ میرے حوالے سے مولانا اکبرآبادیؒ کو لکھیں، اگر کوئی جگہ ہوئی تو آپ کو ضرور لے لیں گے، میں نے اس مشورہ پر عمل کیا اور مولانا اکبرآبادی صاحب کا جواب آیا کہ آپ کی درخواست آنے سے دو چار دن پہلے ایک صاحب کا تقرر ہوگیا ہے، اس لیے معذوری ہے، حضرت مفتی صاحب کے مشورے پر میں کلکتہ تو نہیں جاسکا، مگر بعد میں ان ہی کے مشورہ پر بمبئی گیا، تفصیل آگے آرہی ہے۔

مدرسہ عالیہ کی طرف سے ناامیدی کے بعد میں نے اس سلسلے میں بعض اداروں اور جماعتوں کا چکر کاٹا مگر ہر طرف ناکامی رہی، ان ہی دنوں حضرت مفتی صاحب کے ہمدرد اور دوست مولانا محفوظ الرحمٰن نامی (پارلیمنٹری سکریٹری حکومت یوپی) کی نگرانی میں بہرائچ سے ہفتہ وار اخبار انصار جاری ہوا، جس کی ادارت مجھے مل گئی، مگر یہ اخبار ایک سال بھی نہیں چل سکا، جوں توں سال پورا کر کے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرسی کرلی، جہاں حضرت مفتی صاحب اور ان کے اساتذہ شاندار تدریسی خدمت انجام دے چکے تھے، بلکہ ان ہی حضرات نے وہاں کے مدرسہ تعلیم الدین کو جامعہ اسلامیہ بنایا تھا، مگر یہاں بھی ایک سال سے زیادہ رہنا نصیب نہیں ہوا، آخر بمبئی جاکر پناہ ملی۔

صورت یہ ہوئی کہ جمعیت علماء صوبہ بمبئی کے روح رواں جناب حکیم اعظمی (مولانا حکیم فصیح اللہ خاں صاحب اعظمی مرحوم) ''زمزم'' اور ''انصار'' بہرائچ میں میرے اشعار و مضامین دیکھتے تھے اور ہم وطن ہونے کی نسبت سے غائبانہ محبت رکھتے تھے، کبھی کبھی مراسلات بھی اشاعت کے لیے میرے پاس بھیج دیا کرتے تھے، جب میں ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو ان کو لکھا کہ میں بمبئی آنا چاہتا ہوں، آپ اس سلسلے میں میرا تعاون فرمائیں، میرا یہ خط جمعیۃ علماء بمبئی کے دفتر میں جس وقت پہنچا حسن اتفاق سے وہاں

حضرت مفتی صاحب اور استاذی حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب بھی موجود تھے، جو ایک وفد کے ساتھ حج کو جا رہے تھے، ان دونوں بزرگوں نے حکیم اعظمی صاحب سے فرمایا کہ یہ شخص بڑے کام کا ہے، حالات سے مجبور ہے، آپ بلالیں، بمبئی جیسے شہر میں کوئی نہ کوئی مناسب جگہ مل ہی جائے گی، چناں چہ ان حضرات کے مشورہ کے مطابق حکیم اعظمی صاحب نے مجھے بمبئی بلالیا، یہ واقعہ ۱۹۴۹ء کا ہے۔

اس کے بعد مسلسل ایسے حالات پیدا ہوتے رہے کہ مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بار بار بمبئی آتے رہے اور زیادہ زیادہ دنوں تک قیام کرتے رہے، روز نامہ ''جمہوریت'' کا اجراء ہوا، جو جمعیۃ علماء کی پالیسی کا ترجمان تھا اور ان ہی بزرگوں کے مشورہ سے مجھے اس کے ادارہ تحریر میں شامل کیا گیا، اسی زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے انگریزی اخبار جاری کرنے کا منصوبہ تیار ہوا اور بمبئی سے زیادہ سے زیادہ تعاون کی صورت نکالی گئی نیز ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح بمبئی کے مسلمانوں کے حالات الجھے ہوئے تھے اور طرح طرح کے معاملات ومسائل درپیش تھے، پورٹ حج کمیٹی بمبئی اور حج وحجاج کے معاملات تھے، نیز ہنگامی اور وقتی مسائل پیدا ہوتے رہتے تھے اور حضرت مفتی صاحب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے مشیر خاص اور دست راست کی حیثیت سے بمبئی آیا کرتے تھے، دونوں حضرات ایک دوسرے کے رفیق محترم تھے، ان حضرات کا قیام مستقل طور سے بمبئی کے ایک بزرگ حاجی عبداللہ عرب سمکری مرحوم کے دولت کدہ واقع خان منزل، محلّہ کھانڈیا میں ہوتا تھا، حاجی صاحب نہایت بزرگ، نیک نفس اور علماء کے عاشق وخادم تھے، نسلاً ہندوستانی تھے مگر پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی تھی اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی دیارِ پاک میں گزرا تھا، ان کا لب ولہجہ عربیت لیے ہوئے تھا، میرا بھی ان سے خاص تعلق تھا، میری پہلی کتاب ''حیات جمیلہ'' انہوں نے دو ہزار کی تعداد میں چھاپ کر لوجہ اللہ مفت تقسیم کی تھی، حاجی عبداللہ عرب صاحب کے مکان پر ان دونوں حضرات سے ملنے کے لئے شہر اور باہر کے لوگ آیا کرتے، جن میں اکثر اپنے اپنے معاملات پیش کرتے تھے اور

کچھ لوگ بلا غرض ان حضرات کی مجلسی گفتگو میں شریک ہوا کرتے تھے، یہ مجلسیں صبح دس بجے تک اور رات بارہ بجے تک رہا کرتی تھیں، جن میں مختلف موضوعات پر علمی، دینی، سیاسی، ملکی، قومی، جماعتی باتیں ہوتی تھیں، ان خصوصی مجلسوں میں چند مخصوص اہلِ علم اور اربابِ فہم وفراست شریک ہوتے تھے اور مختلف موضوعات پر کھل کر باتیں ہوتی تھیں جن کا عنوان خالص دینی وعلمی ہوتا تھا، میں عام طور سے کوئی موضوع چھیڑتا اور یہ حضرات اس کے بارے میں معلومات کے دریا بہاتے تھے اور پوری مجلس استفادہ کرتی تھی، بمبئ کی یہ مجلسیں دینی وعلمی اعتبار سے یادگار ہیں، ان کے خصوصی شرکاء میں سے مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب بہاری، مولانا حکیم اعظمی، جناب طاہر انصاری، جناب محمد بیگ چغتائی، حاجی عبداللہ سمکری، حاجی یحییٰ محمد زبیر صاحب مالیگانوی اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مفتی صاحب کی طرح اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں رکھے اور مغفرت فرمائے، محترم مولانا مرزا سیف اللہ صاحب ۱۴۰۸ھ میں وفات پاگئے رحمہ اللہ، محترم مصطفیٰ فقیہ صاحب اور بعض دیگر حضرات بقید حیات رہ گئے ہیں جو ان یادگار مجلسوں کے امین ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو تادیر زندہ اور سلامت رکھے۔

اسی زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند کے زیرِ اہتمام اور بمبئ کے مشہور ومخیّر میمن خاندان محمد احمد برادرس کے زیرِ انتظام آل انڈیا دینی تعلیمی کانفرنس کا تاریخ ساز اجلاس صابوصدیق مسافر خانہ بمبئ میں ہوا، جس میں پورے ہندوستان سے علماء فضلاء اور اہلِ مدارس شریک ہوئے، اس دینی تعلیمی کانفرنس کے روحِ رواں مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تھے اور اس کی کامیابی میں محترم الحاج احمد غریب صاحب اور ان کے تینوں بھائیوں کے مالی تعاون اور انتھک کوشش کو پورا پورا دخل تھا، اس سلسلے میں رسالہ "البلاغ" بمبئ کا عظیم الشان تعلیمی نمبر نکالا گیا، جو ہندوستان کے مدارس اسلامیہ کے لیے تاریخی دستاویز ہے۔ مہینوں پہلے سے مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بمبئ تشریف لایا کرتے تھے اور ان کا قیام حاجی عبداللہ عرب سمکری کے یہاں ہوتا تھا، وہیں محفلیں جمتی

تھی اور ہم لوگ اس میں بڑے شوق وذوق اور باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔

اس زمانہ میں میرے مضامین ومقالات بمبئی کے روزنامہ ’’جمہوریت‘‘ روزنامہ ’’انقلاب‘‘ اور ماہ نامہ ’’البلاغ‘‘ میں شائع ہوتے تھے اور حضرت مفتی صاحب کی نظر سے گزرتے تھے، نیز مفتی صاحب اس صورت حال سے واقف تھے جو روزنامہ ’’جمہوریت‘‘ سے ترکِ تعلق کے سلسلہ میں پیدا ہوئی تھی اور مجھے بمبئی سے اکھاڑنے کی کوشش کی گئی تھی، جس میں میرے بہی خواہ میری مظلومیت پر ترس کھا رہے تھے اور بدخواہ بغلیں بجارہے تھے، مفتی صاحب اس معاملہ میں وقتی طور سے میرے خیر خواہ تھے، اگرچہ اس سے ان کو کوئی تعلق نہیں تھا، آخر میں آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کا تاسیسی اجلاس بڑی شان وشوکت سے بمبئی میں ہوا، جس میں دیگر حضرات کی طرح مفتی صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حضرت قاری محمد طیب کے وصال کے بعد اس کے صدر بھی بنائے گئے۔ مسلم پرسنل لابورڈ کے سلسلے میں بھی مفتی صاحب اکثر بمبئی تشریف لایا کرتے تھے، پھر حج کمیٹی کے نائب صدر ہونے کی حیثیت سے دیکھنے اور ان کے اوصاف وکمالات سے واقف ہونے کے مواقع ملے، چوں کہ مفتی صاحب ایک مشہور ومستند علمی وتحقیقی اور تصنیفی ادارہ کے ناظم تھے، اس لیے مجھے ان سے ملنے جلنے اور قربت حاصل کرنے میں علمی لذت محسوس ہوتی تھی، مفتی صاحب بھی مجھے خصوصی التفات سے نوازتے تھے اور بڑی قدر ومحبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، میں اپنے چھوٹوں اور بڑوں سے ملنے جلنے میں بے تکلف ہوں مگر مفتی صاحب کے رکھ رکھاؤ، وضعداری اور خلوص ومحبت کی وجہ سے میں ان سے بے تکلف نہ ہو سکا، بلکہ ان کے لطف وکرم کے سامنے شرمندہ ہی رہا کرتا تھا اور وہ میری شرمندگی کا احترام کرتے تھے، فرماتے تھے، آپ کے ہمارے تعلقات رسمی نہیں عزیزانہ ہیں۔

میرے علمی وتحقیقی اور تصنیفی کاموں کے زبانی قدرداں اور منہ پر تعریف کرنے والے اکابر واصاغر میں بہت سے لوگ ہیں حقیقی قدرداں صرف چند مخصوص بزرگ اور اھلِ علم تھے یعنی استاذی مولانا سید محمد میاں صاحب، مولانا ابوالوفا افغانی صاحب

صدر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، ندوۃ المصنفین دہلی رحمہم اللہ، ان بزرگوں میں مفتی صاحب نے ندوۃ المصنفین سے میری آٹھ کتابیں اپنے شان دار مقدمات کے ساتھ شائع کر کے عملاً میری قدردانی اور ہمت افزائی فرمائی، اس وقت میری کتابوں پر ان کے مقدمات سے کچھ عبارتیں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے ان کے میرے علمی تعلقات کی نوعیت معلوم ہوتی ہے، اس سے پہلے یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ میری علمی نشوونما بے آب وگیاہ صحرا کے اس پودے کے مانند ہوئی ہے جو تیز دھوپ اور تند جھونکوں میں رہ کر سرسبز وشاداب ہوا، میں مدرسہ سے جیتا جاگتا دل ودماغ لے کر نکلا مگر کسی ادارہ یا شخصیت سے مجھے آگے کی راہ نہ مل سکی، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم، اساتذہ کی دعا اور اپنی جدوجہد سے آگے بڑھایا، میری پہلی کتاب ''رجال السند والہند'' کو الحاج احمد غریب صاحب مرحوم (محمد احمد والاخوان المیمنین بمبئی) نے زر کثیر صرف کر کے مصری ٹائپ میں چھپوائی اور اس کتاب کی وجہ سے پورے ملک کے علمی حلقوں میں میرا تعارف ہوا۔ اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نے ندوۃ المصنفین سے میری کتابیں اپنے شاندار مقدمات کے ساتھ شائع کر کے میری علمی خدمات کو عام کیا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ دو شخصیتیں مجھے نصیب نہ ہوتیں تو میں اپنے کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں ہاتھ پیر مارتا ہی رہتا۔

رجال السند والہند، العقد الثمین اور الہند فی عہد العباسیین کے علاوہ میں نے اپنی کتابوں پر کسی سے مقدمہ، تعارف اور پیش لفظ نہیں لکھوایا، مندرجہ بالا تینوں کتابوں پر بعض عرب علماء وفضلاء اور شعراء کے مقدمات میں انہوں نے بڑے حوصلہ اور انشراح سے میری محنت کی داد دی ہے، ہمارے علماء میں یہ حوصلہ بہت کم ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے چند الفاظ وکلمات سے کتاب اور مصنف کی حیثیت ان کے مقام ومرتبہ سے بہت

زیادہ بڑھ جائے گی۔ اس لیے تنگ نظری اور بخل کی حد تک احتیاط کرتے ہیں، پہلی بات تو یہ تھی، دوسری بات یہ کہ ہم محنت کر کے کتاب لکھیں اور رات دن ایک کر کے اس کے نوک پلک درست کریں، پھر دوسروں سے اس کا سرنامہ لکھوانے جائیں، یہ بات مجھے کچھ پسند نہیں ہے، کتاب میں جان ہوگی تو وہ خود اپنا مقام بنالے گی، ورنہ دوسرے کے مقدمہ کی مہمیز بے کار ہے، اس لیے مفتی صاحب نے ندوۃ المصنفین کے ناظم اور ناشر ہونے کی حیثیت سے میری کتابوں پر جو کچھ لکھ دیا، وہی میرے لیے کافی ہے اور ماشاء اللہ ایسا لکھا کہ شاید دوسرا کوئی عالم کتاب کی قدر و قیمت اور مصنف کی خدمت و محنت کا اعتراف اس قدر شاندار انداز میں نہیں کر سکتا تھا۔

اس سلسلے میں ایک بات اور صاف کر دینی ہے، میں نے کبھی علم کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا، ملازمت کے زمانہ میں جو ملا، لے لیا۔ حالاں کہ یہ زمانہ میری سخت آزمائش کا تھا۔ اسی طرح اپنی کتابوں کی قیمت وصول نہیں کی، جواز اور عدم جواز کی بحث سے یکسو ہو کر میرا یہ نظریہ رہا ہے اور اسی پر میں نے عمل کیا ہے، ابتدائی دور میں لاہور میں ایک مختصر سی کتاب پر پچاس روپیہ حق تصنیف لیا تو آج تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ چھپی کہ نہیں، پھر یہ غلطی نہیں کی، حتی کہ مصر اور پاکستان میں اس پیش کش پر میں نے کوئی رقم لینے کے بدلے کچھ کتابیں لے لیں اور پھر یہی سلسلہ چلتا رہا، کتاب لکھ کر بیچنا اہلِ علم کی شان نہیں ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا زیادہ دے دیا ہے کہ کتابوں کی رائلٹی سے اس کا عشر عشیر بھی نہیں مل سکتا تھا، یہ بھی ملحوظ رہے کہ میں جماعتی عصبیت، گروہی تحزب اور شخصیت پرستی سے دور رہا ہوں، اگر میں اپنے کتابوں پر پیسے لینے کے چکر میں رہتا تو شائد ایک آدھ کتاب چھپ جاتی، باقی مسودے بہت سے اہل علم کی کاوشوں کی طرح کیڑے مکوڑوں کی نذر ہو جاتے، اس لیے میں نے اپنے ہر کتاب آزاد رکھی ہے، جس کا جی چاہے چھاپے۔

اب میری کتابوں پر مفتی صاحب کے مقدمے یا پیش لفظ کے کچھ اقتباسات

ملاحظہ ہوں، اس سے اندازہ ہوگا کہ مفتی صاحب میری کتابوں کے قدرداں اس لیے نہیں تھے کہ میں ان کو مفت دیا کرتا تھا، بلکہ اس لیے تھے کہ ان میں علم وتحقیق اور کدو کاوش تھی اور ان کا مصنف اس کا مستحق تھا، ساتھ ہی اس سے مفتی صاحب کے اسلوبِ تحریر، ادبی ذوق اور صاف ستھرے اندازِ بیان کا پتہ بھی چلے گا۔

(۱) سب سے پہلی کتاب ''عرب وہند عہد رسالت میں'' ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۴ء میں ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی، مفتی صاحب بمبئی تشریف لائے تھے، میں نے مسودہ دیا اور کہا کہ اگر یہ کتاب ندوۃ المصنفین کے معیار ومزاج کے مطابق ہو تو شائع کردیں، مفتی صاحب نے مسودہ ہاتھ میں لیتے ہوئے فرمایا کہ ضرور شائع ہوگی، آپ کی کتاب اور ندوۃ المصنفین کے معیار کے مطابق نہ ہو؟ پھر اسی سال شائع کردیا اور اس کے مقدمہ میں لکھا۔

''عرب وہند عہدِ رسالت میں'' ندوۃ المصنفین سے شائع کرکے مجھے خاص مسرت ہورہی ہے۔ مجلّہ ''معارف'' میں اس کے بعض ابواب کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تھا اور اسی وقت سے خیال تھا کہ ایسی معلوماتی اور نفیس کتاب کی اشاعت اسی ادارے سے ہونی چاہیے، شکر ہے کہ اس کا وقت آگیا، لائق مؤلف نے ان مقالات پر نہ صرف وسیع نظرثانی کی ہے، بلکہ متعدد ابواب کا اضافہ بھی کیا ہے۔

مولانا عبدالحلیم صدیقی

افسوس کہ پچھلے دنوں برصغیر ہند کے دو نامور علماء نے انتقال کیا، یکم فروری ۱۹۶۰ء کو مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی اپنے وطن ملیح آباد میں فوت ہوئے مولانا مرحوم بزم علم وسیاست کے مرد میداں تھے، زندگی کا بیشتر حصہ سیاسی اور علمی کاموں میں بسر کیا۔ خلافت اور جمعیۃ العلماء ان کے کام کے مرکز تھے، ایک زمانہ میں بڑے آتش بار اور ولولہ انگیز تقریریں کیا کرتے تھے، حافظ قرآن تھے اور رمضان میں تراویح میں ایک قرآن ختم پڑھتے تھے، سالہا سال سے دھلی اور بمبئی میں اسی طرح قرآن سناتے تھے، عربی کے ادیب وشاعر تھے، ندوہ لکھنؤ، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس رہ چکے تھے، ادھر کئی سال سے زندگی کے دن پورے کررہے تھے، سفر میں فالج کا حملہ ہوگیا، ایک مجلس میں راقم نے عرض کیا کہ آپ پرانے حضرات بالکل خاموش ہوگئے ہیں آخر ہم لوگ کہاں جائیں تو فرمایا کہ میاں ہم نے اپنا کام کرلیا، اب ہم سے توقع نہ رکھو، اب تم لوگوں کا دور ہے، کچھ کر کے دکھاؤ ہم نے جو کچھ کرنا دکھانا تھا، کر دکھایا، اب تو ہم زندگی کے دن پورے کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مرتبہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

ڈاکٹر عبدالمنعم النمر

مئی ۱۹۹۱ء

اس دور میں مصر کے دو ازہری عالموں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور یہاں کی علمی ودینی خدمات وشخصیات سے خصوصی اعتنا کیا ہے اوراس موضوع کے بارے میں عالمِ عرب اور عالمِ اسلام کے لیے بیش بہا معلومات فراہم کیں، ایک سابق وزیر اوقاف ڈاکٹر عبدالمنعم النمر رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مدیر مکتب شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالعزیز عزت حفظہ اللہ وسلمہ اس وقت شیخ عبدالمنعم النمر کا ذکر مقصود ہے جنہوں نے ۲۷/ ماہ ہندوستان میں رہ کر عربی زبان وادب وثقافت کی تعلیم دینے کے ساتھ کشمیر سے مالا بار تک سیاحت کر کے یہاں کے اسلامی آثار وتواریخ کا بغور مطالعہ کیا اور کتابیں لکھیں نیز مولانا ابوالکلام آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور استاد عبدالعزیز عزت نے یہاں کی معدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ شائع کیا، یہ دونوں عالم جامع ازہر اور موتمر اسلامی کی طرف سے ہندوستان میں مبعوث تھے، شیخ النمر کے ذکر سے پہلے استاد عزت کا مختصر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

استاد عبدالعزیز عزت نے جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی اور اسی میں اردو زبان سیکھی اردو کی کتابیں اور اخبارات ورسائل بے تکلف پڑھتے اور سمجھتے ہیں، البتہ بات چیت میں عربی اردو بولتے ہیں جس طرح یہاں کے علماء عربی کتابیں پڑھتے پڑھاتے ہیں اور گفتگو میں ہندی عربی بولتے ہیں اور دونوں کے لیے یہ عیب کی بات نہیں ہے بلکہ اس سے سننے والے اہل زبان کو لطف آتا ہے، وہ جامع ازہر اور موتمر اسلامی کی طرف سے بمبئی میں عربی زبان کی تعلیم کے لیے مبعوث ہوئے اور تقریباً چار سال کے بعد ۱۹۶۵ء میں واپس ہوئے، اس درمیان میں میرے ان کے تعلقات روزانہ انداز کے

ہو گئے، اس کے بعد پاکستان میں مبعوث ہوئے اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرۃ النبی جلد سوم پر تحقیقی مقالہ لکھ کر کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، نیز سید صاحب مرحوم کی کتاب ''عربوں کی جہاز رانی'' کا عربی ترجمہ (الملاحۃ عندالعرب) کے نام سے شائع کیا، جس کا مقدمہ پاکستان میں مصر کے سفیر علی ابوالفضل خشبہ نے لکھا ہے، موصوف نے مصر میں ایک ملاقات میں بتایا کہ اس کا مسودہ اسکندریہ یونیورسٹی کے استاذ بحریات نے مطالعہ کے لیے طلب کیا اور تقاضا کے باوجود واپس نہیں کیا مگر بعد میں کسی طرح اس کو حاصل کر کے شائع کیا، موصوف نے میری کتاب ''عرب وہند عہدِ رسالت میں'' کا ترجمہ ''العرب والہند فی عہدالرسالۃ'' کے نام سے کر کے ۱۹۷۳ء میں قاہرہ کی الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب'' سے شائع کیا اور ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' کا ترجمہ ''حکومات العرب فی الہند والسند'' کے نام سے مکتبہ آل مداللہ البکر ریاض سے شائع کیا، وہ فی الحال مجمع البحوث الاسلامیہ کے رکن رکین اور مدیر مکتب شیخ الازہر ہیں۔

شیخ عبدالمنعم النمر اگست ۱۹۱۳ء میں مصر کے مشہور شہر سوق میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم مقامی درس گاہ میں حاصل کر کے جامع ازہر میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں کلیۃ اصول الدین سے عالمیت کی سند پائی، پھر وہیں سے ۱۹۴۱ء میں ماہر تعلیم کی سند حاصل کر کے جامع ازہر اور مصر کے دیگر معاہد و جامعات میں تعلیمی خدمات انجام دیں، ۱۹۵۶ء میں جامعہ ازہر اور موتمر اسلامی نے ان کو دارالعلوم دیوبند بھیجا، جہاں انہوں نے ۲۷/ ماہ رہ کر عربی ادب وثقافت کی تعلیم دی اور ہندوستان کی سیاحت کر کے یہاں کی اسلامی تاریخ و آثار کے متلق معلومات جمع کیں، ان کے ساتھ شیخ عبدالعال العقباوی بھی استاد و معلم کی حیثیت سے تھے، ۱۹۶۵ء میں کویت کے مجلّہ ''الوعی الاسلامی'' کے رئیس التحریری ہوئے اور مختلف علمی وفقہی موضوعات پر پُر مغزم مضامین ومقالات لکھے، اسی دوران امارت عربیہ متحدہ سے مجلّہ ''المنار'' جاری کیا، ۱۹۷۸ء میں جامعہ ازہر کے وکیل

بنائے گئے اور مدیر البعثات الازہریہ کی حیثیت سے مفوضہ خدمات بوجوہ احسن انجام دیں، ۱۹۷۹ء میں وزیر اوقاف بنائے گئے اور ۱۹۸۶ء میں حکومتِ مصر کی طرف سے ان کی علمی، تحقیقی اور دوسری مختلف خدمات کے اعتراف کے طور پر توصیفی سند پیش کی گئی اور مئی ۱۹۹۱ء (اواخر ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ) میں قاہرہ میں انتقال کیا رحمۃ اللہ علیہ۔

شیخ عبدالمنعم النمر کی شخصیت بڑی طرح دار تھی وہ قدیم وجدید کے جامع اور متوازن ذہن ومزاج کے عالم تھے، علمی وتحقیقی وتصنیفی مشاغل کے ساتھ عالمِ اسلام کے مسائل ومعاملات سے علمی تعلق رکھتے تھے، اسلامی وسیاسی موتمرات میں اپنی باوزن شخصیت اور اصابت رائے کے ساتھ حصہ لیتے تھے، بہترین خطیب تھے، اپنی مختلف الجہات صلاحیت کی وجہ سے دینی وعلمی اور سیاسی حلقوں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور اپنے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول تھے، ایک موقع پر ان کے شیخ الازہر ہو جانے کا امکان پیدا ہو رہا تھا، راقم کی ان سے پہلی ملاقات اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جمعیۃ علماء ہند کی اجلاس میں سورت میں ہوئی، اسی سال وہ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تھے، ہندوستان کی اسلامی تاریخ ان کی طرح میرا بھی خاص موضوع تھا، اس لیے دونوں میں اچھا خاصا تعارف وتعلق ہو گیا، بعد میں مکہ مکرمہ کے مجلّہ ''الحج'' میں انہوں نے المسلمون فی الہند کے عنوان سے مقالات لکھے، جس میں بعض باتیں میرے حوالے سے نقل کیں اور تقریباً دو ہفتہ تک ان سے تفصیلی ملاقات ۱۹۵۸ء میں بمبئی میں ہوتی رہی، جب کہ وہ واپس جارہے تھے، پہلی بار میرے کمرے میں آئے، اور اندر قدم رکھا تو بے ساختہ کہا یاسلام تاھلت الکتب والکتابة اس وقت چٹائی پر کتابیں اور اخبارات بکھرے ہوئے پڑے تھے، ان کا یہ جملہ میرے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے، اس وقت رجال السند والہند مطبعہ حجازیہ بمبئی میں چھپ رہی تھی، اس پر اپنی رائے لکھی، وہ مطبوعہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اس کے بعد دو تین بار بمبئی دیوبند اور دہلی تشریف لائے اور اتفاق سے ہر بار ان سے ملاقات ہوتی رہی اور سب سے زیادہ ملنا جلنا قاہرہ میں ۱۹۷۸ء

میں ہوا، جب وہ مدیر البعثات الازہریہ تھے، اور میں عرب وافریقہ کے علمی سفر میں تھا۔

جس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب الوعی الاسلامی کویت کے رئیس التحریر تھے، ایک لکھے پڑھے آدمی کو جو بمبئی آرہا تھا، مجھ سے ملاقات کرنے اور سلام پہنچانے کی تاکید کی تھی، وہ صاحب عشاء کے وقت میرے کمرے میں آئے مغربی لباس میں تھے، حسبِ معمول کمرے میں چٹائی اور چادر بچھی ہوئی تھی، وہ کھڑے رہے، میں نے تشریف رکھنے کو کہا، انہوں نے کہا میں تاج ہوٹل کے فلاں کمرے میں ہوں، آپ وہیں آجائیں، یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میں نہیں گیا، موجودہ دور کے مصر وعرب کے فضلاومشائخ سمجھ نہیں سکتے کہ ہندوستان کے بوریہ نشین علماء کس طرح دینی وعلمی خدمت کرتے ہیں، انہوں نے ہندوستان سے واپس جاکر قاہرہ میں ہندوستان کے متعلق تین کتابیں تصنیف کیں، (۱) تاریخ الاسلام فی الہند (۲) کفاح المسلمین فی تحریر الہند (۳) سبعۃ وعشرون شہرا فی الہند۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل ک، تاریخ الاسلام فی الہند ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۹ء) میں شائع ہوئی اور ۲۱/اپریل ۱۹۶۰ء کو موصوف نے کتاب میرے پاس بھیجی، اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ جب جامع ازہر اور موتمر اسلامی نے مجھے ہندوستان بھیجنے کا ارادہ کیا تو میں بڑی کش مکش میں پڑ گیا کیوں کہ اس ملک کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کو محمد بن قاسم ثقفی اور سلطان محمود غزنوی نے فتح کیا ہے اور یہاں کے لوگ ہاتھی پر سواری کرتے ہیں، اسی وجہ سے یہاں کی اسلامی تاریخ کی تلاش وتحقیق کا خیال پیدا ہوا اور یہاں آکر تدریس وتعلیم کی مشغولیت میں کشمیر سے مالابار تک مختلف تقریبوں سے سفر کئے اور ہر جگہ مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کیں۔

مرحوم نے تاریخ الاسلام فی الہند کے ساتھ جو خط مجھے لکھا، اس سے ان کی اسلامی ہند کی تاریخ سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، لکھتے ہیں کہ میں آپ کے پاس یہ کتاب بھیج رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ اس میں آپ کے لیے خوش کن باتیں ہوں گی، نیز یہ کہ

آپ مجھے اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھیں گے اور جو کمی ہو، اس کی نشان دہی کریں گے، تاکہ طبع ثانی میں اس سے استفادہ کروں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی کتاب رجال السند والہند کی پہلی جلد شائع ہوچکی ہے، مجھے ایک نسخہ بھیج دیں، اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں ایک کتاب لکھ چکا ہوں، جس میں ہندوستان کے تحریک آزادی سے قیام پاکستان تک مسلمانوں کی جدوجہد کی تفصیل بیان کی ہے، اس موضوع کے بارے میں اگر کوئی خاص بات معلوم ہو تو لکھیں، تاکہ اس سے مدد لوں، اس سال (۱۹۶۰ء) قاہرہ کے ہندوستانی سفارت خانہ نے صوت الہند کے نام سے جریدہ شائع کیا ہے میں نے اس میں ایک طویل مقالہ " النشاط العلمی والاجتماعی للمسلمین فی الہند " کے عنوان سے تحریر کیا ہے، اور انجمن خدام النبی بمبئی اور اسکے ارکان کے بیان پر ختم کیا، یہ جریدہ عالم عربی میں تقسیم کیا گیا ہے، موسمِ حج کی مناسبت سے شائع کیا گیا ہے اور حجاز میں بھی تقسیم کیا جائے گا۔

میری کتاب مترجمہ ڈاکٹر عبداللہ عبدالعزیز عزت حکومات العرب فی الہند والسند پر ڈاکٹر عبدالمنعم النمر مرحوم نے ۱۸/اگست ۱۹۸۰ء کو نہایت شان دار مقدمہ لکھا ہے، مرحوم سے میری آخری ملاقات گزشتہ سال دہلی میں ہوئی تھی، جب کہ وہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات میں آئے تھے، ان کی طلب پر میں العقد الثمین فی فتوح الہند پیش کی اور کہا کہ آپ اب بوڑھے ہوگئے ہیں، انہوں نے اس کے جواب میں کہا وانت ایضاً۔

مہاجر عرب عبداللہ سمکری

رمضان المبارک کی تیسری تاریخ ختم ہو کر چوتھی شروع ہو چکی تھی دوشنبہ کی مبارک رات تھی کہ بمبئی کے مشہور بزرگ اور دیندار مسلمان جناب حاجی عبداللہ احمد عرب، سمکریؒ نے انتقال فرمایا۔ مرحوم حاجی صاحب کے آباء واجداد یہاں سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اور وہیں حاجی صاحب کی پیدائش اور نشو ونما ہوئی تھی، عربی زبان ان کی مادری زبان تھی اردو زبان بھی ان کی زبان تھی، بڑے نیک دل بڑے وضعدار اور بڑے علمی ودینی بزرگ تھے، زندگی بھر قومی تحریکات میں بقدر وسعت حصہ لیتے رہے، ابتدا میں صوت الحق وغیرہ کے ناموں سے کئی اخبارات جاری کئے، مزاج میں عربی ذوق آخر دم تک باقی رہا اور اخلاق ومروت اور آن بان میں اپنی عربیت کو محفوظ رکھا تھا، مولانا ابوالکلام آزاد کے شیدائیوں میں سے تھے اور مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے والہانہ محبت وعقیدت تھی، وضعداری کا یہ عالم تھا کہ مولانا جب بمبئی آتے تو حاجی صاحب ہی کے مہمان ہوتے تھے، نہ مولانا دوسری جگہ جاتے نہ حاجی صاحب جانے دیتے۔

جب راقم شروع شروع میں بمبئی آیا تو حاجی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی اور اس وقت سے لے کر للہ فی اللہ تعلقات رہے، ان کی شفقت ومحبت کا یہ حال تھا کہ بہت سے نجی اور ذاتی کاموں میں احقر سے مشورہ لیا کرتے، سب سے پہلے آپ ہی نے میری کتاب ''حیات جمیلہ یا اسلامی نظام زندگی'' دو ہزار کی تعداد میں شائع کر کے مفت تقسیم کرائی۔

مکہ مکرمہ کی شریفی دور کی تاریخ کو خوب بیان کرتے تھے اور وہاں کے آنکھوں

دیکھے حالات سے اچھی طرح واقف، شریف مکہ سے آپ کے گھرانے کے ذاتی تعلقات تھے اور پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں اور شریف مکہ کے معاملات کی گہرائیوں سے واقف تھے، بہت سی ایسی باتیں بیان کرتے تھے جن کا تواریخ اوراخبار میں کہیں پتہ نہیں ہے، ان کی زندگی کے بہت سے بلند اور نجی حالات ان کی شخصیت کی برتری کے شاہد ہیں، ستر سال کے قریب عمر پائی تھی، اللہ تعالیٰ حاجی صاحب مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اوران کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

(انقلاب بمبئی)

مولانا مفتی عتیق احمد فرنگی محلی

مئی میں مولانا مفتی عتیق احمد صاحب فرنگی محلی لکھنوی نے انتقال کیا۔ جو فرنگی محل کی خاندانی روایات کے آخری حاملین میں تھے۔ پوری زندگی قناعت، گوشہ نشینی، درس وتدریس، افتاءاور زہد وعبادت میں بسر کی تھی۔

(انقلاب ممبئی)

عبدالواحد نرویل

بھیونڈی کے مشہور علمی و دینی خانوادہ شرف الدین واولادہ کے بزرگ عالم مولانا عبدالصمد کے صاحب زادے عبدالواحد نرویل نے وسط نومبر میں انتقال کیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور اہل خانہ کو صبر کی توفیق دے، مرحوم ابھی زیادہ عمر کے نہیں تھے، تین چار ماہ پہلے ان سے ملاقات ان کے دفتر میں ہوئی تھی، اچھے خاصے تھے، صحیح ہے کہ موت کا کوئی وقت نہیں ہے، مرحوم نے دارالقیمہ کا سارا بوجھ اٹھا رکھا تھا، کتابوں کی اشاعت کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، انھوں نے اپنی نگرانی میں المعجم المفہرس، تحفۃ الاشراف، اور سنن نسائی الکبریٰ وغیرہ جیسی حدیث کی نادر و نایاب اور ضخیم کتابیں اپنی نگرانی میں اعلی معیار پر چھاپ کر شائع کیں، علم دوست، باشعور سنجیدہ، اور شریف الطبع آدمی تھے، آخر میں سنن نسائی الکبریٰ چھاپ رہے تھے، ابتدائی دو جلدیں راقم کو ہدیۃً دی تھیں تیسری جلد تقریباً تیار تھی کہ اس حال میں ان کا انتقال ہو گیا، اب معلوم نہیں اس کتاب کی طباعت کا کیا حال ہوگا، تقریباً دس جلدوں میں مکمل ہوگی، مرحوم سے راقم کے ذاتی تعلقات نہایت خوش گوار تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی دینی و علمی خدمات کو قبول فرمائے، اور اس کی بہترین جزا دے، مولانا عبدالصمد کے لیے بڑھاپے کی انتہائی منزل پر صاحب زادے کی موت کا صدمہ بڑا صبر آزما ہے، اللہ تعالیٰ ان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(انقلاب بمبئی)

مولانا عبدالسلام فاروقی لکھنویؒ

افسوس کہ مولانا عبد السلام صاحب فاروقی بن حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنوی نے ۱۵/اگست کی رات میں دورۂ قلب کے وقتی عارضہ میں انتقال فرمایا، اور دوسرے دن لاکھوں کے مجمع میں ان کی تجہیز وتکفین اور تدفین ہوئی۔ مولانا عبد السلام صاحب مولانا عبد الشکور صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے اوران کے جانشین تھے، خاص طور سے وعظ اور مناظرہ میں بہت آگے تھے، طبیعت میں انکساری لاابالی پن کی حد تک تھی، بڑے بے تکلف، مرنجا مرنج اور ملنسار آدمی تھے، دارالمبلغین کے ناظم ومہتمم بلکہ روح رواں تھے، جو حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کی علمی یادگار تھا، اور جہاں سے بہت سے علماء مستفیض ہوکر نکلے تھے، اس خاندان مین ویسے تو متعدد علماء ہیں مگر اب مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقی اس خانوادہ کے ترجمان کی حیثیت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(انقلاب ممبئی)

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری

آخر حضرت مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی خبر آہی گئی کہ ۲۱/اگست کو مولانا نے ملتان میں جان آفریں کو جان سپرد کردی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

مولانا عطاء اللہ صاحب بخاری برصغیر ہندو پاکستان میں محتاج تعارف نہیں ہیں اور شاید ہی غیر منقسم ہندوستان کا کوئی باشعور آدمی ہو جو آپ کی شخصیت سے واقف نہ ہو۔ جنگ آزادی کا یہ شعلہ بار خطیب ایک زمانہ میں ہر سیاسی اسٹیج، مذہبی منبر اور دینی محراب کا بے نظیر مقرر تھا۔ اور آٹھ آٹھ گھنٹے تک اس طرح بے پناہ ہجوم کو خطاب کرتا کہ ایک متنفس کو سر ہلانے کی مجال نہیں ہوتی تھی۔ ملک کی آزادی میں مولانا مرحوم نے قید فرنگ کے مصائب جھیلے اپنوں کے ہاتھوں کروڑوں تکلیفیں اٹھائیں۔ مگر اپنے منصب پر ڈٹے رہے۔ ساتھ ہی مولانا بخاری بڑے باغ و بہار آدمی تھے، مجلسوں میں وہ کچھ اور ہی نظر آتے اور ان کی جاذبیت بڑھ جاتی تھی۔ مجلس احرار لاہور کے دفتر میں ایک مرتبہ احباب جمع تھے راقم الحروف بھی تھا۔ شعر و شاعری کا دور چل رہا تھا۔ ''خون شہیداں'' کے موضوع پر احباب سن سنا رہے تھے، حضرت شاہ صاحب نے ایک شعر سنایا اور دس پندرہ مرتبہ پڑھ کر خود جھومتے رہے اور مجلس کو جھماتے رہے، وہ شعر یہ تھا:

مچلتا ہی رہا خون شہیداں   سمٹتا ہی رہا دامن کسی کا

جنگ آزادی کے بہادر سپاہیوں کی یہ آخری یادگار بھی مٹ گئی، اور حلقۂ علماء کا یہ ایک محترم و معزز فرد بھی جاتا رہا۔

اللہ تعالیٰ مولانا عطاء اللہ شاہ غازی پر اپنی رحمت کے پھول برسائے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین (انقلاب)

عبدالستار بھائی میمنی

سیٹھ عبدالستار عمر بھائی (احمد مل بمبئی) رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ۲۰ رمئی کو ہوا، مرحوم چند ماہ سے شدید مرض میں مبتلا تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق دے، مرحوم بمبئی میں ایک خاص مقام و مرتبہ رکھتے تھے، کاروباری اعتبار سے بھی چند مخصوص لوگوں میں سے تھے، مرحوم نے بہت سے رفاہ عام کے کام میں حصہ لیا، اور مسلمانوں کی مشہور و مخیّر میمن برادری میں بہت نمایاں حیثیت کے مالک تھے، راقم کے ساتھ بڑے خلوص و عقیدت کا معاملہ رکھتے تھے، لوجہ اللہ تقسیم کرنے کے لیے دینی کتابوں کی طباعت واشاعت میں مشورہ لیا کرتے تھے، ان کے خلوص و محبت کی وجہ سے میں ان سے خاص طور سے گاہے گاہے ملاقات کرنے جایا کرتا تھا، تو خوش ہو جاتے تھے، اور خاطر داری کا خاص اہتمام کرتے تھے، ''میمن گزٹ'' میں میرے مضامین کے ترجمے شائع ہوتے تھے، جن کو مرحوم بڑی توجہ سے پڑھا کرتے تھے، اور یہ باہمی تعلق کا باعث ہوا، جناب احمد غریب (محمد احمد برادرس) رحمہم اللہ کے بعد ان سے میرا خصوصی تعلق رہا، اور انھوں نے علمی قدردانی کا سلسلہ پورے احترام سے جاری کیا، وہ دنیاوی اعتبار سے جتنے بڑے تھے، ان کی نجی زندگی میں دور دور تک ان کی بڑائی کا پتہ نہیں چلتا تھا، وہ کھل کر سامنے نہیں آئے، مگر قومی اور جماعتی امور و معاملات میں حصہ لیتے تھے، افسوس راقم ان کے انتقال کے وقت بمبئی میں موجود نہیں تھا، اور ان کے جنازہ میں شریک نہیں ہو سکا، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ (انقلاب بمبئی)

سید عبدالرحمٰن بافقیہ

جناب سید عبدالرحمٰن بافقیہ تھنگل کی موت ملت ہندیہ کے حادثات میں ایک بڑا حادثہ اورالمیہ ہے، وہ اپنی ذات سے جنوبی ہند کی مقبول ترین شخصیت کے مالک تھے، خاص طور سے کیرالا کے عوام وخواص میں وہ عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اوراپنی بےلوث اور مخلصانہ خدمات کی وجہ سے انہوں نے اپنا اہم مقام پیدا کرلیا تھا، ان کی ذات عرب وہند کے قدیم تعلقات کی یادگار تھی، ان کا خاندان حضرموت سے آکر جنوبی ہند کے ساحل پر آباد ہوا، اور تجارت کی راہ سے آگے بڑھا، اور عزت وناموری حاصل کی، مرحوم محمد اسماعیل کے بعد وہ مسلم لیگ کے صدر ہوئے تھے، اور کامیابی اور ذمہ داری سے اس عہدہ کو سنبھال رہے تھے، وہ ہوائی جہاز سے حج کے لیے گئے تھے، بمبئی میں چند منٹ ان سے ملاقات رہی، وہ صورت وسیرت اوراپنی وضع وقطع سے پکے مسلمان اور سچے انسان معلوم ہوتے تھے، وضع داری اور روایت نوازی کا یہ حال تھا کہ وہی عربوں کا قدیم لباس زیب تن کیے ہوئے تھے، اور عربی میں گفتگو فرماتے تھے، ان کی موت قابل رشک ہے، حج وزیارت سے بار بار مشرف ہوئے تھے، اب کے بار حج کو گئے تو معمولی سی بیماری میں انتقال کیا، اور جنت المعلیٰ میں لاکھوں فرزندان توحید کی دعاؤں کے ساتھ سپرد خاک کیے گئے اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ (انقلاب بمبئی)

مسٹر عبدالقیوم انصاری

حال ہی میں مسٹر عبدالقیوم انصاری وزیر جیل حکومت بہار کا انتقال ہوا، مرحوم ہندوستان میں ایک تحریک اور جماعت کے سربراہوں میں سے تھے، غالباً حضرت مولانا عبداللہ مئوی غازی پوری کے نواسے تھے، ان کی خدمات کا اعتراف سب کو تھا، اوراپنے حلقہ بڑی قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(انقلاب بمبئی)

ڈاکٹر عبدالحق صاحب بابائے اردو

ہماری محفل کے دوستوں کی وہ آخری شمع بھی بجھ گئی، جس کے دم سے ماضی کی یاد زندہ تھی، اور ہماری تہذیب وثقافت کا نمونہ پیش کر رہی تھی، یعنی بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے ۱۶ر اگست کو کراچی میں داعی اجل کو لبیک کہا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے، بلکہ کہنا چاہئے کہ وہ کافی جیئے ۹۱ر سال کی عمر پائی تھی، ادھر چند ماہ سے صحت بالکل ہی جواب دے چکی تھی، کینسر کا موذی مرض بھی بڑھاپے میں موت کا باعث ہوا، دوچار دن پہلے سے متضاد خبریں آ رہی تھیں، کبھی یہ خبر آتی کہ ہوش وحواس اور گویائی کی قوت جواب دے چکی ہے، اور کبھی یہ خبر آتی کہ وہ ہشاش بشاش ہیں کہ یکبارگی ان کے مر نے کی خبر آ گئی۔

مرحوم یوں تو ہماری تہذیب وتمدن کے چلتے پھرتے نمونے تھے، مگر اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، اور خوب کام کرتے تھے، اردو کی ترویج وترقی کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دے کر انجمن ترقی اردو کو اپنایا، اور کام کیا، اور اردو کی ترقی ہی کے لالچ میں وہ پاکستان بننے کے بعد کراچی گئے، اور اردو یونیورسٹی کے لیے کوشاں رہے، واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ہماری مجلس علم وادب کے صدر نشینوں میں سے ایک تھے، سرسید، شبلی، حالی، نذیر احمد کے ساتھی، اور دوست تھے، ان کے دم سے مربیان علم وادب کی یاد تازہ تھی، اور ان کی آنکھ بند ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری پون سو سالہ علمی وادبی تاریخ کی کتاب بند ہو گئی، اللہ تعالیٰ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو ان کے کاموں کی نیک جزا دے، اور ان کی مغفرت فرمائے، آمین

ڈاکٹر صاحب کی وفات ہر محبّ اردو ہندو مسلمان کے لیے حادثہ ہے، جو اردو کی بقاء وترقی کے لیے کوشش کی دعوت دیتا ہے۔ (انقلاب بمبئی)

مولانا عبدالحکیم الکتبیؒ

افسوس کہ مہینوں کی بیماری کے بعد مولانا عبدالحکیم شرف الدین کتبی (شرف الدین الکتبی اولادہ محمد علی روڈ بمبئ) ۶ر فروری کو ساڑھے چار بجے انتقال کر گئے۔ غفراللہ لہ ورحمہ اللہ۔

مرحوم بمبئ کے مشہور علمی اور دینی خاندان کے ایک وقیع فرد تھے۔ عالم اسلام کی علمی اور دینی مطبوعات کی تجارت اپنے والد مرحوم سے ورثہ میں پائی تھی۔ خود بھی بہت اچھے عالم اور اہل علم کے قدردان تھے۔ توحید وسنت پر قائم رہ کر اپنے اخلاق وعادات میں بڑے بااصول تھے۔ اہل علم کے بڑے قدردان اور احباب نواز تھے۔ ان کا تجارتی کتب خانہ ہندوستان اور عرب ممالک بلکہ یورپ تک کے اہل علم وتحقیق کی بزم بنا رہتا تھا۔ ہر طبقہ اور ہر مکتب فکر کے اہل علم سے ان کے تعلقات خوشگوار رہا کرتے تھے۔ علمی تعلقات میں کبھی ذاتیات کو دخیل نہیں ہونے دیا۔ وہ مزاج شناس بھی تھے۔ اور نفسیاتی اصول سے اپنے ملنے والوں سے ملتے تھے۔

راقم جب ۱۹۴۸ء میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں معلم بنکر آیا تو پہلی بار ایک دن کے لیے بمبئ آیا۔ اور آپ سے پہلی بار ملاقات کی۔ میں نے کہا کہ بمبئ میں میرا پہلی بار آنا ہے۔ اس کی یادگار میں مجھے کوئی عمدہ سی کتاب آپ کے یہاں سے خریدنی ہے۔ میں بالکل اجنبی ہوں۔ آپ ہی کوئی اچھی کتاب تجویز کر کے دیدیں۔ مرحوم نے امام ابن قیمؒ کی ''الجواب الکافی'' کا ایک نسخہ نہایت ارزاں قیمت پر دیا۔ یہ آپ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اور آپ کے یہاں کی علمی ودینی یادگار تھی۔ اس کے ایک سال کے بعد جب میں مستقل بمبئ آیا تو مرحوم سے علمی تعلقات نہایت خوشگوار رہے۔ آپ کا تجارتی کتب خانہ میرے علمی اور تحقیقی کاموں کے لیے ہمیشہ کھلا رہا۔ جب جی چاہا جا کر جو کتاب چاہی خود نکال کر مطالعہ اور نقل کرتا تھا۔ مرحوم نہایت شفقت ومحبت سے تعاون فرماتے تھے۔ اور شرمندہ ہونے کی حد تک خاطر تواضع کرتے تھے۔ بالالفاظ

دیگر علم و تحقیق کو نوازتے تھے۔ رجال السند والہند کے نسخے غیر ممالک میں بھیجتے تھے۔ اور میں اس کے عوض میں آپ سے کتابیں لیتا تھا۔ اس طرح سے سیکڑوں کتابیں میرے ذاتی کتب خانہ میں آپ کے تعاون سے پہنچیں۔ اور میں ان سے مستفیض ہوتا ہوں۔ میری کئی تصنیفات میں آپ کے علمی تعاون کا بڑا حصہ ہے۔ مرحوم نے تحفۃ المودود، رحلۃ الصدیق اور التاج المکلل وغیرہ کو نہایت عمدہ جدید طرز پر عربی ٹائپ میں طباعت کی، تمام فنی نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ چھاپا ہے۔ ایسے بے لوث اور اہل علم کے قدردان اس مادی افادہ اور استفادہ کے شہر سے اٹھ جانا بڑی کمی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اور تمام اعزہ واقارب اور متعلقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ اور عزیز گرامی شرف الدین صاحب، احمد صاحب اور ان کے برادران خورد اور دیگر اہل خانہ کو ابتلاء سے محفوظ رکھے۔ اب لے دے کر تو مولانا عبدالصمد شرف الدین صاحب اس علمی خانوادہ کے فرد واحد ہیں۔ اللہ ان کے علمی کاموں میں برکت دے اور تادیر زندہ رکھے آمین۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا غلام محمد خطیب جامع مسجد بمبئی

۱۶ر دسمبر

گذشتہ ماہ بمبئی کے کئی مخلصوں کا انتقال ہوا کہ وطن میں رہنے کی وجہ سے ان کی تجہیز وتکفین میں شرکت کے ثواب وسعادت سے محروم رہا۔ مولانا غلام محمد صاحب خطیب جامع مسجد بمبئی نے ۱۶ر دسمبر کو انتقال کیا۔ اللہم اغفرلہ وارحمہ.

مولانا مرحوم زہد وتقویٰ، طہارت، دینداری، حق گوئی اور علم وفضل میں شہر بمبئی میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے، وضعداری، اخلاق اور قدر نوازی جیسی صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں، بمبئی کے اہل علم میں ان صفات میں بھی بے مثال تھے، راقم کے تعلقات مولانا مرحوم سے نہایت خوشگوار اور استوار اور عزیزانہ حد تک تھے۔ جب تک بمبئی میں مستقل قیام رہا ہفتہ دو ہفتہ میں ان کے گھر پر حاضری دیتا تھا، اور مولانا اپنی شفقت ومحبت سے نوازتے تھے۔ ایک زمانہ میں جامع مسجد کی بالائی منزل پر کتب خانہ میں مولانا مرحوم اور میں دونوں بیٹھ کر تفسیر بیضاوی کا مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ ان کی عنایت وتوجہ سے میں نے امام ابن شاہین کی کتاب ''الثقات'' شائع کی۔ قدیم وجدید علم کے جامع تھے، رجال السند والہند کی تصنیف میں میں نے مدد لی تھی، اور بہت سی عربی عبارتوں میں ان سے اصلاح لی، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، اور اعلیٰ علیین میں ان کو جگہ دے۔

(روزنامہ انقلاب ممبئی)

غازی محمود دھرم پال

ایک زمانہ تھا غازی محمود دھرم پال کا شہرہ شہر شہر اور قریہ قریہ تھا، حال ہی میں آپ نے بھی انتقال کیا، مشرقی پنجاب کے رہنے والے تھے، نام عبدالغفور تھا، ابتداء میں آریوں سے بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے، اور اسی راہ میں قربان ہوگئے اور اسلام کے بارے میں متعدد کتابیں لکھیں جن کے جوابات مرحوم مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے دیئے۔ توفیق الٰہی نے اسلام کی راہ دکھائی تو حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے اور آریوں کے خلاف کفر توڑ وسر توڑ دینے والی کتابیں لکھیں، اور خوب خوب شہرت حاصل کی، ادھر مدتوں سے گم نام تھے، تقسیم کے بعد حکومت پاکستان نے وظیفہ مقرر کیا تھا، اور اسی پر خاتمہ ہوا، اللہ تعالیٰ ان کے نیک کاموں کی بہترین جزا دے۔

(انقلاب ۱۳ ؍اپریل بمبئی)

خواجہ غلام جیلانی

بمبئی کے مشہور قومی رہنما، خادم اور مسلمانوں کے خیر خواہ جناب خواجہ غلام جیلانی صاحب کا انتقال قومی و ملی خسارہ ہے۔ مسلم لیگ حج کمیٹی، کارپوریشن جہاں بھی رہے اپنی بے لوث خدمات پیش کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا فیض الحسن حسرتؔ موہانی رح

۱۳ر مئی ۱۹۵۱ء

آج ۱۳ر مئی ۱۹۵۱ کو بارہ بجے دن میں علم وفضل، شعروادب اور خدمت وسیاست کا آفتاب غروب ہو گیا، اور سید الاحرار مولانا سید فضل الحسن حسرتؔ موہانی بھی ہم سے دامن چھڑا کر ملاءِ اعلیٰ میں جا بسے، آپ انیسویں صدی کے آخر دور میں پیدا ہوئے، جسے آپ جیسے دوسرے بے شمار ہندوستانی اکابر کے گہوارہ بننے کا فخر حاصل ہے، آپ کا خاندان سادات خراسان سے تعلق رکھتا ہے، موہان ضلع اناؤ کو آپ کے مولد بننے کا شرف حاصل ہے۔

ابتدائی کتابیں وطن مین پڑھنے کے بعد علی گڈھ جا کر تعلیم مکمل فرمائی، وہیں سے ۱۹۱۴ء میں اردو ادب کا مشہور اور مستند ترجمان ''اردو معلیٰ'' جاری کیا، جو آخر دور میں کان پور سے نکلنے لگا تھا۔

۱۹۱۲ء سے آپ کی سیاسی زندگی شروع ہوئی، سیاست میں اترنے کے لیے آپ نے کانگریس کا اکھاڑہ تجویز کیا، پھر جب ۱۹۱۶ء میں بمبئی کے اندر مسلم لیگ اور کانگریس کا مشترکہ اجلاس ہوا، اس وقت لارڈ ولنگڈن نے مسٹر جناح سے وعدہ لیا کہ مسلم لیگ کے اجلاس میں حکومت کی مخالفت نہ کی جائے گی، مولانا پہلی بار لیگ کے اجلاس مین شریک ہوئے تھے، انھیں جب اس وعدہ کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ جوش میں آکر کھلے اجلاس میں مسٹر جناح مرحوم پر برس پڑے، اور کہا کہ آپ نے اس طرح کا وعدہ کس کی اجازت سے کیا، آپ کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

استخلاص وطن اور آزادی قوم کی خاطر تین مرتبہ جیل و بند سے دوچار ہوئے، اور زندگی کا ایک حصہ اسارت میں گذارا، ایک عرصہ تک یہ زندانِ فرنگ یوپی کی مختلف جیلوں کی سیر کرتا رہا، اور اپنی شوریدہ سری اور ہنگامہ پسندی سے ہر جیل کو تماشہ بناتا رہا،

۱۹۲۵ء میں احمد آباد کانگریس کے صدر منتخب کیے گئے، جب کہ آپ جیل میں بند تھے، ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ میں داخل ہو کر آل انڈیا لیگ کونسل کے ممبر ہوئے، مسلم لیگ پارلیمنٹری کمیٹی میں بھی شریک رہے، لیکن ذاتی طور پر جناح صاحب سے ان کی کبھی نہ بنی، مولانا اپنا سیاسی عقیدہ اسلامی کمیونزم بتایا کرتے تھے، ۱۹۴۷ء میں دستور ساز کے ممبر منتخب ہوئے اور دستور جمہوریہ ہند کے پاس ہونے کے وقت مولانا حسرتؔ واحد ممبر تھے، جنھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں اس دستور کو منظور نہیں کرتا۔

مولانا نے نظموں اور غزلوں کے کئی دیوان چھوڑے ہیں۔ اور شعر وادب کی ان کی چلتی پھرتی یادگاریں بھی ملک میں بکثرت ہیں، اردو غزل گوئی میں انھوں نے ایک الگ اسکول قائم کیا، آپ کی غزلیں سیاسی مسائل سے پُر ہوا کرتی تھیں، اس بات پر آپ کو فخر بھی تھا۔ مثلاً

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشہ ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے جب آپ دہلی جاتے تو نئی دہلی میں ایک مسجد کے حجرے میں رہتے تھے، پارلیمنٹ کے اجلاس کے سلسلہ میں جو الاؤنس ملتا تھا، اسے جمع کرتے تھے، گذشتہ سال اسی جمع شدہ رقم سے آپ نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل فرمائی، جاتے ہوئے بمبئی سے گئے، اور آتے ہوئے کراچی آئے۔

مولانا حسرتؔ اپنے زہد و تقویٰ اور اخلاص و ایثار میں ہندوستان کی ممتاز ہستیوں میں تھے، ان کا دامن لیڈرانہ رنگینیوں سے ہمیشہ پاک رہا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے، اور ان کی شاندار خدمات کو ان کے لیے باعث اجر و ثواب بنائے۔ (انقلاب ممبئی ۱۵ر مئی ۱۹۵۱)

حضرت مجاہد فضل الٰہیؒ

۵؍مئی ۱۹۵۱ء

غیر منقسم ہندوستان کی ایک مقدس امانت ۵؍مئی ۱۹۵۱ء کو ہم سے جدا ہوگئی، یہ امانت اپنی تاریخی روایات اور دین و ملک کی خدمات کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے ہم اپنی گذشتہ سوسالہ تاریخ میں جگہ دیں، امیر المجاہدین حضرت مولانا فضل الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے حضرت سید احمد بریلویؒ اور حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تحریک آزادی کی آخری نشانی بھی ہم سے چھن گئی۔

مولانا فضل الٰہیؒ مسلم قوم کے ان چند افراد سے تھے جو قوم کو صحیح معنوں میں اسلام اور آزادی پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے، اور اس گروہ کے ایک ممتاز فرد تھے، جو برصغیر ہندوستان میں انیسویں صدی میں پیدا ہوا، اور جس کا خیال تھا کہ اسلام اور مسلمان کی بہبود اس ملک میں اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ غلامی کا جوا ان کی گردن میں پڑا رہے گا مگر چند ذی شعور مسلمانوں کی وجہ سے اسلامیان ہند کا یہ گروہ بالاکوٹ کے مقام پر جام شہادت نوش کر گیا، پھر ان کی شہادت کے بعد اس جماعت کے بقیہ افراد ترک وطن کر کے انگریزی سلطنت سے نکل گئے، اور سرحد کی پہاڑیوں میں دین و آزادی اور جہاد کا وعظ فرماتے رہے۔

مولانا فضل الٰہی رحمۃ اللہ علیہ ۲۸ سال سے قبائیلیوں کو جہاد کی تلقین کرتے رہے، پھر ۱۹۴۱ء میں شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں گئے، اور وہاں کے لوگوں کو فضائل جہاد سے آگاہ فرمایا، بالآخر جب انگریزوں کی لعنت اس ملک سے دور ہوئی تو آپ اپنے وطن تشریف لائے، وفات

کے وقت آپ کی عمر ۸۰ سال کی تھی، آپ کا جنازہ وزیرآباد سے بالاکوٹ لے جایا گیا، جو ایبٹ آباد کے قریب ہے، جہاں حضرت سید احمد بریلویؒ اور حضرت اسماعیل شہیدؒ محوِ خواب ہیں، انھیں دونوں حضرات کے پہلو میں حضرت مولانا فضل الٰہیؒ کو بھی سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری تحریک اسلام وانقلاب کے اس داعی آخر کو ان کی خدماتِ مقدسہ کا اجر اضعاف دراضعاف دے، اور ان کے کارناموں کے نقوش پر ملک و قوم کو چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا حکیم محمد فصیح اللہ خاں اعظمی

۲۸؍ جون ۱۹۶۴ء

شہر بمبئی کی گزشتہ پچیس سالہ دینی اور سیاسی سرگرمی کی ایک شخصیت بارزہ آخر کار گم ہوگئی اور اس صدی کے جمعیۃ علماء بمبئی کے عظیم رکن جناب مولانا الحاج حافظ حکیم محمد فصیح اللہ خان صاحب اعظمی نے ۱۷؍ صفر ۱۳۸۴ھ مطابق ۲۸؍ جون ۱۹۶۴ء کو اتوار کے دن گیارہ بج کر دس منٹ پر انتقال فرمایا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے آمین۔ حکیم اعظمی صاحب ضلع اعظم گڈھ کے ایک مقام حمید پور کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے عربی کی متوسطات جامع العلوم کانپور میں پڑھیں اور طب بھی وہیں حاصل کی اور بمبئی آ کر اپنی ذاتی قابلیت سے بڑی شخصیت کے مالک ہوئے، حکومت بمبئی نے ان کی قابلیت کی بنا پر جے پی کا عہدہ دیا تھا، مرکزی جمعیت علماء ہند کی مجلس عاملہ کے ممبر رہے جمعیۃ علماء مہاراشٹر کے صدر رہے اور پورٹ حج کمیٹی کے نائب صدر ہوئے اور اپنی بضاعت بھر ہر عہدہ پر رہ کر فرائض کے انجام دینے کی کوشش کرتے رہے، حکیم اعظمی طبعاً خاموش اور خشک تھے، مگر ان کی خاموشی اور خشکی میں گویائی اور رنگینی ہوا کرتی تھی۔ پورٹ حج کمیٹی کی چیرمینی کے زمانے میں کئی بار حج وزیارت سے مشرف ہوئے، آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن بمبئی سے متعدد بار تقریریں نشر کیں۔ بمبئی سے باہر کئی جمعیتی اور تعلیمی کانفرنسوں کی صدارت کی بڑے غیور اور خوددار مرد تھے۔ مطب اور دواخانہ کی قلیل آمدنی ان کے خاندان کا واحد ذریعہ معاش تھی۔ اسی پر انہوں نے زندگی بھر قانع وصابر رہ کر جس قدر ہوسکا، سیاسی مذہبی اور اجتماعی کام کیا۔ اگر ان کی قانع زندگی کا یہ پہلو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ انہوں نے اپنی بساط سے زیادہ کام کیا۔ ان کی خاموشی کا یہ عالم تھا کہ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھے

رہئے مگر کیا مجال کہ حکیم صاحب بات کریں اور گویائی کا یہ عالم تھا کہ اگر بات چیت کرنے پر آئیں تو سننے والے کو بٹھا بٹھا کر باتیں کریں، خود داری اور بے نیازی کا یہ حال تھا کہ جب پہلے پہل بمبئی میں ایک مکان لے کر مطب کھولا تو تین دن تک نہ کوئی مریض آیا نہ ایک پیسہ کی آمدنی ہوئی مگر حکیم صاحب فاقوں پر فاقے کر کے ایسی بیٹھے رہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ نے دست گیری نہ فرمائی، اپنی جگہ سے نہ اٹھے، چوتھے دن جب کہ آمدنی ہوئی تو مطب سے اٹھ کر ہوٹل میں کھانا کھایا، سیاسی زندگی میں اکھاڑ پچھاڑ جوڑ توڑ اور رقابت معمولی بات ہے، حکیم صاحب ایسے وقت میں بڑے خاموشی اور بے پروائی سے کام لیتے۔ جمعیۃ علماء کو انہوں نے اپنی سرگرمی کا محور بنالیا تو آخر تک اسی کو نصب العین بنائے رکھا، حکیم صاحب بڑے کام کرنے کا موقع فراہم کرنے کی کوشش کرتے، جہاں تک ان کی کم آمیزی اور خاموشی کا تعلق ہے، وہ ان کی فطری چیز تھی۔ اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں کے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ تھا، جو لوگ ان کے اس افتادِ طبع سے واقف تھے، انہیں معذور سمجھتے اور ناواقف انہیں خشک اور کم آمیز سمجھتے۔

راقم الحروف ۱۴ رسال سے زائد بمبئی میں مرحوم حکیم صاحب سے یوں متعلق رہا کہ اگر دو ایک دن ملاقات نہیں ہوتی تو حکیم صاحب اسے شدت سے محسوس کرتے اور ملاقات پر فوراً اس کا اظہار کرتے۔ حکیم صاحب کی ذات نے مجھے ممبئی آنے کی جرأت دلائی اور لکھا کہ فی الحال کوئی کام تو سامنے نہیں ہے مگر آپ آجایئے میں حتی الامکان آرام پہونچانے کی کوشش کروں گا، چنانچہ مرحوم نے آخر وقت تک اسے نبھایا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شروع میں تقریباً بیکار تھا تو حکیم صاحب مختلف کام لیتے اور چپکے سے میری جیب میں روپے ڈال دیا کرتے تھے۔ بمبئی میں بعد میں میرے قیام کے ظاہری سہارے دو تھے جن پر مجھے اعتماد اور جن سے سکون واطمینان رہا اور نفسیاتی طور سے ان سے میں بہت مطمئن رہا، ایک حکیم صاحب اور دوسرے احمد غریب صاحب اگر یہ دونوں ظاہری سہارے نہ ہوتے تو میں لکھنے پڑھنے کے کام میں گم رہنے والا شخص ایسے پُر ہنگامہ شہر میں

ٹک نہیں سکتا۔ ان دونوں سے میں نے اپنی وضعداری یوں برقرار رکھی کہ ایک کے ہاں شام کو اپنی حاضری کو گویا اپنے معمولات میں سے بنالیا، حکیم صاحب مرحوم کی وفات سے ایک سہارا جاتا رہا، مرحوم اپریل میں جے ٹی اسپتال میں تھے تو باتوں باتوں میں بمبئی میں دارالمعارف الاسلامیہ کے قیام پر گفتگو ہوئی تو بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہا کہ اچھا آپ وطن سے واپس آجائیں اور میں اسپتال سے نکل جاؤں تو اس کام کو مل کر کر ڈالیں اور بمبئی میں ایک ایسا ادارہ بنائیں، جو اس شہر کے شایان شان ہو اور وہاں سے اسلامی علوم وفنون کی خدمت ہو، یہ ان کی آخری خواہش تھی، جسے وہ میرے ذریعہ پورا کرنا چاہتے تھے، مگر افسوس کہ دوسری بہت سی خواہشوں کی طرح وہ اسے بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ ان کا مطب حجاج، وزراء، علماء وفضلاء اور سیاسی لوگوں کا مرجع رہا کرتا تھا اور مدرسوں کے چندوں سے بڑے بڑے سیاسی کاموں میں بھی بساط بھر مدد کرتے تھے۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے روحانی نسبت رکھتے تھے۔

(انقلاب بمبئی)

فاروق شاہ مصر

۱۹۶۵ء

مصر کے سابق بادشاہ فاروق کا اٹلی میں انتقال ہوا اور عارضی تجہیز و تکفین بھی وہیں ہوئی، شاہ فاروق اتنا بُرا انسان نہیں تھا جتنا کہ بدنام کیا گیا، بلکہ اس دور کے دوسرے بادشاہوں کی طرح وہ زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر جب بھی کسی پر ادبار کی آندھی چلتی ہے تو اس کے تمام محاسن کو ختم کر کے معائب، مثالب کے گرد و غبار سے چھپا دیتی ہے، دنیا کا یہی دستور رہا ہے، پہلے بھی یہی صورت تھی اور آج بھی یہ بات موجود ہے کہ جب ایک شخص کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ سنبھالنے والے اسے ہر طرح بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کی بدنامی پر اپنے نیک نامی کا قلعہ تعمیر کرتے ہیں، آخر انگریز نے بھی تو یہی کیا کہ مغل حکومت کو خاص طور سے حضرت محمد اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ کو خوب بدنام کیا۔

بہر حال یہ تو ایک تاریخی حقیقت تھی، جس کا ایک حصہ فاروق سابق شاہ مصر کو بھی ملا تھا۔ فاروق کا جنازہ یوں نکلا کہ آگے ان کا اکلوتا لڑکا فواد تھا، اس کے بعد اس کی تین لڑکیاں، فاروق کا موسیقار ساتھی بھی تھا۔ فاروق کی میت کو اٹلی کے قبرستان کے ایک پرائیوٹ کمرے میں رکھ دیا گیا ہے جس کی دیواروں پر سونے کے گوٹ لگے ہوئے پردے ہیں۔ مرحوم کے وکیل نے بتایا ہے کہ ان کے ورثاء نے فاروق کی میت کو اٹلی سے باہر لے جانے کی اجازت حاصل کر لی ہے اور بہت سے مسلم ممالک سے رابطہ قائم کیا جا رہا ہے کہ وہ ان کو اپنے یہاں دفن کرنے کی اجازت دیں گے یا نہیں دیں گے۔ مرحوم نے وصیت کی تھی کہ ان کو مدینہ منورہ میں دفن کیا جائے، اگر سعودی حکومت نے انکار کیا تو پھر شاہ ایران سے جگہ مانگی جائے گی۔

عبرت کا مقام ہے کہ بادشاہوں کو مرنے کے بعد دفن کی جگہ بھی نہیں مل رہی ہے اور جہاں انہوں نے بادشاہی کی وہاں تو درکنار دوسری جگہ بھی قبر کی بھیک نہ مل سکی۔ چناں چہ سابق شاہ ترکی سلطان عبدالحمید کی لاش کا بھی یہی معاملہ رہا کہ ان کی لاش بھی وقتی طور سے دفن کی گئی تاکہ بعد میں کسی مناسب مقام پر تدفین کی جائے۔ مرحوم کے لیے حیدرآباد میں بھی اس کا بندوبست ہو رہا تھا مگر نہ ہوسکا۔ اب شاہ فاروق کی لاش کا بھی یہی معاملہ ہے کہ دنیا کی کسی حکومت میں اس کے لیے جگہ تلاش کی جا رہی ہے، اور ابھی کتنے دن کی بات ہے کہ اسٹالن کی لاش کو خروشچوف نے اس کی قبر سے نکال کر باہر پھینک دیا۔ اسٹالن کی محرومی معزول بادشاہوں سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ سب سے بڑھ کر ہے، کیوں کہ وہ خود بھی بادشاہوں اور شخصی حکمرانوں سے کئی درجہ زیادہ با اقتدار حکمراں تھا۔

اس معاملہ میں بھی غریب وفقیر ہی خوش قسمت ہیں کہ ان کا دم نکلا وہیں، ان کی قبر بنی، اور کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، دنیا میں ہلکے پھلکے جئے اور ہلکے پھلکے ہی دنیا سے گئے۔ نہ جینے کا معاملہ اہم رہا، نہ مرنے کی ٹیڑھی رہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی ہی زندگی اور ایسی ہی موت سب کو دے۔ (البلاغ مارچ ۱۹۶۵ء)

حضرت مولانا سید فخر الدین احمد
شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند
۱۵/ اپریل ۱۹۷۲ء

افسوس کہ ۲۰/ صفر ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۵/ اپریل ۱۹۷۲ء بروز چہار شنبہ ایک بجکر تیس منٹ پر شب میں کم وبیش ساٹھ سال سے ریاض رسولؐ میں چہکتا ہوا بلبل خاموش ہوگیا، یعنی استاذنا وشیخنا حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند نے وصال فرمایا رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً وصال کے وقت عمر تقریباً ۸۰/ سال کی تھی، حضرت مولانا مرحوم میرے تین لڑکوں کے حدیث استاد تھے، میں نے مدرسہ شاہی جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں آپ سے حدیث پڑھی۔ اور دو لڑکوں نے دار العلوم دیوبند میں آپ سے شرف تلمذ پایا اور ایک کو آپ نے سندِ حدیث دے کر اپنے حلقۂ تلامذہ میں شامل فرمایا۔ پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ پورے برصغیر ہندو پاکستان میں علمِ حدیث کی تدریس کا وہ طریقہ حضرت مولانا کے وصال سے ختم ہوگیا جو ہماری دینی درس گاہوں میں ماضی قریب تک رائج تھا، یعنی احادیث کے رجال واسناد پر بحث، فقہی مذاہب کی تفصیل اور وجہِ ترجیح کے ساتھ راجح مسلک کے دلائل اور مرجوح مسلک کے جوابات میں ایک ایک حدیث پر بعض اوقات کئی دنوں تک تقریریں ہوتی تھیں، اور استاد اور طالب علم دونوں معلوم ہوتا تھا کہ ائمہ سلف کی مجلس میں احادیث کا مذاکرہ کر رہے ہیں، مولانا مرحوم کا یہی طریقہ تھا، آپ نے بلا مبالغہ پچاسوں ہزار علماء کو حدیث کا درس دیا ہے، صحیح بخاری پڑھانے میں آپ خصوصی ملکہ وامتیاز کے مالک تھے، ابوابِ بخاری پر عربی زبان میں کتابیں بھی لکھی ہیں۔ باب اور اس کے تحت احادیث کی مناسبت اور ایک باب کے بعد دوسرے باب کے مناسبت اور ربط پر آپ کی کئی تصنیفات ہیں۔ علم الفرائض میں ایک منظوم رسالہ بھی ہے، حضرت مولانا بھی ہمارے علمی سلسلہ کے بزرگوں کی طرح

دین اور سیاست دونوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ملکی تحریک میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ متعدد بار جیل بھی کاٹ چکے تھے، آخری دور میں جمعیۃ علماء ہند کے صدر تھے، ایک مرتبہ اثنائے درس میں فرمانے لگے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حجاز جانے لگے تو میں نے عرض کیا کہ مجھے اپنی شاگردی کی سند عنایت فرمادیجئے، اس پر شیخ الہند نے ایک مختصر سے کاغذ پر اپنے قلم سے کچھ تحریر فرمادیا، یہی میری سند ہے۔ اور اسی کو میں اپنا علمی و دینی سرمایہ سمجھتا ہوں، نیز فرمایا کہ حضرت شیخ الہند نے فراغت کے بعد مدرسہ شاہی مرادآباد میں مجھے رکھ دیا، بس اسی دن سے آج تک یہیں پڑا ہوں۔ حالان کہ بڑی جگہیں آئیں اور اصرار ہوا مگر استاد نے جس جگہ بیٹھا دیا تھا، اس سے اٹھنا گوارا نہ ہوا، اور ۴۰ سال سے زائد سے صحیح بخاری کا درس دے رہا ہوں۔

تقریباً دو سال ہوئے مبارک پور تشریف لے گئے تھے، میں بمبئی میں تھا، مگر میری عدم موجودگی میں لڑکوں کی گزارش یوں قبول فرمائے کہ گھر پہونچ کر اور میرا کتب خانہ اور اس کی کتابیں ملاحظہ! فرما کر فرمایا کہ اس جگہ آ کر سکون ہوا۔ دیر تک کتابیں نکال نکال کر ملاحظہ فرماتے رہے اور اپنے نالائق شاگرد کے بارے میں نیک خیالات ظاہر کرتے رہے کہ طالب علمی کے زمانے میں مجھے محسوس ہورہا تھا کہ یہ طالب علم آگے چل کر کام کا ہوگا اور اس سے ہمارے سلسلے کی نیک نامی ہوگی۔ خالد کمال سلمہ کے بارے میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا، بڑے انشراح اور مسرت سے چھوٹے بچوں کو گود میں لیتے اور فرماتے تھے کہ تم لوگ مجھ سے مت ڈرو، میں تمہارے دادا کا استاد ہوں، تمہارے باپ کا استاد ہوں، اور تم سب کا دادا ہوں۔ دسترخوان پر چائے کے ساتھ آپ زمزم اور مدینہ منورہ کی کھجور بھی تھی۔ دونوں تبرکات کو نہایت شوق و محبت سے تناول فرمایا، بلکہ بچی ہوئی کھجوروں کے بارے میں حکم دیا کہ اسے میرے ساتھ کردو، بے نفس اور عشق رسول ﷺ کی یہ ادائیں ہما شما کے لیے قابل عبرت ہیں، بچوں نے میری تمام عربی اور اردو کی تصنیفات پیش کیں، جن کو نہایت انشراح وانبساط کے ساتھ قبول کیا۔

میں مارچ ۱۹۷۰ء میں مراد آباد گیا۔ اتفاق سے مولانا مرحوم وہاں تشریف فرماتھے، فوراً حاضر خدمت ہوا۔ خبر پاتے ہی ناسازئ طبع کے باوجود تشریف لائے اور اپنے ایک ادنی سے ادنی شاگرد کو اصرار کے ساتھ چارپائی کے سرہانے بٹھانا چاہا اور خود سامنے بیٹھنے کی کوشش فرمائی۔ بالآخر دوسری چارپائی آئی اور اس پر خود بھی سرہانے بیٹھ کر مجھے اپنے خواہش کے مطابق بٹھایا۔

اللہ اللہ! یہ ہمارے اساتذہ ومشائخ تھے، جن کے عجز وانکسار نے اخلاقیات کے قصرہائے معلیٰ تعمیر کیے ہیں۔ ہم ان کے ناخلف نام لیوا ہر مجلس میں اونچی اور نمایاں جگہ میں عزت محسوس کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت خادم نے ایک اور کتاب حال ہی میں العقد الثمین لکھی ہے تو ان الفاظ میں اس کا تقاضا فرمایا ''مجھے یہ کتاب کب دی جائے گی''، میں نے عرض کیا کہ شام کو حاضر کروں گا۔ فرمایا نہیں دوپہر میں یہیں کھانا کھاؤ اور کتاب لے کر آؤ، چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ راقم بالکل بجا محسوس کرتا ہے کہ اس کے لکھنے پڑھنے کا یہ ذوق اور اس کی تصانیف کی یہ مقبولیت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے ساتھ ان بزرگوں کے توجہات کی دین ہے۔

اسی سفر میں ایک بار پھر حضرت کے درس صحیح بخاری میں طلبہ کی صف میں بیٹھا، اس روز مولانا مرحوم ''ثلاث کذبات'' والی حدیث تقریر فرما رہے تھے اور من وعن وہی الفاظ وبیان تھے، جو تیس سال پہلے اس حدیث کے درس میں مدرسہ شاہی مراد آباد میں سنے تھے۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ برادر معظم حضرت مولانا اختر الاسلام صاحب اور برادر عزیز مولانا حکیم معین الدین صاحب اور جمیع اہل خانہ کو ہم خدا کی طرف سے صبر وشکر کی تلقین ہے۔

(البلاغ مئی ۱۹۷۲ء)

شاہ فیصل بن عبدالعزیز آل سعودؒ

۲۵/ مارچ ۱۹۷۵ء

۲۵/ مارچ ۱۹۷۵ء ۱۱/ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ سہ شنبہ کو سعودی عرب کے حکمراں جلالۃ الملک فیصل رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے بھتیجے فیصل بن مساعد بن عبدالعزیز نے شاہی محل میں جبکہ مرحوم سرکاری کاموں میں مصروف تھے سلام کرنے کے انداز میں سامنے آ کر گولیوں سے شہید کر دیا، مرحوم گولی لگتے ہی گر گئے اور دو گھنٹے کے بعد انتقال کر گئے، اس وقت ان کی عمر ۶۹ سال کی تھی اور حکومت کا گیارہواں سال تھا، اسی وقت شاہ مرحوم کے چچا الامیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن نے ولی عہد خالد بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کے ہاتھ پر بیعت کی ساتھ ہی موجودہ شاہی افراد نے بیعت کی، دوسرے دن صبح کو بیعت عامہ ہوئی اور عصر کے بعد شاہ مرحوم کو ریاض کے شاہی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

موت برحق ہے ہر چھوٹے بڑی کے لئے لازمی ہے، مگر بہت سی اموات بڑے ابتلاء کا باعث ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ جلالۃ الملک فیصل کی وفات کو عرب ممالک اور عالمِ اسلام کے لئے باعث ابتلاء نہ بنائے، انہوں نے گیارہ سال کی مدتِ حکومت میں حرمین شریفین اور مقامات مقدسہ ہی کو نہیں پورے عرب ممالک بلکہ عالم اسلام کو جو تازگی اور بشاشت اپنے عزم وارادہ اور اپنی بے پناہ دولت سے دی ہے وہ پچھلی دوسو سالہ اسلامی تاریخ میں بے نظیر کارنامہ ہے، وہ ایسے وقت دنیا سے گئے جب کہ عرب ممالک اور عالم اسلام کو ان کی شدید ضرورت تھی، مرحوم نے جس تدبر حوصلہ مندی، بہادری، اور عزیمت وبسالت سے اسرائیلی جارحیت، یورپ اور امریکہ کی چال، اور عرب ممالک کی باہمی

نفرت کا مقابلہ کر کے سب کو زیر کیا یہ ان ہی کا حصہ تھا، کون سا اسلامی ملک ہے جس کے دینی وعلمی ادارے اور افراد بالواسطہ یا بلا واسطہ ان سے فیضاب نہیں ہوئے، حرمین شریفین کی تعمیر وتوسیع، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، رابطہ عالم اسلامی، اسلامی سکریٹریٹ، اسلامی بنک، رباطہ، ملائشیا، پاکستان میں اسلامی کانفرنس، وغیرہ ان کے دل اور دولت کے تناور درخت ہیں جن کے زیر سایہ عالم اسلام نے نئی زندگی پائی ہے، ان کے کارناموں سے عربوں میں جینے کی نئی امنگ پیدا ہوگئی ہے، اسلامی علوم وفنون کی تعلیم واشاعت کے لئے مرحوم فیصل شاہ نے افریقہ کے مسلمانوں کی خاص طور سے علمی، دینی، اخلاقی اور اقتصادی مدد کی، یہ ان کا ہنر تھا کہ امریکہ جیسے دوست کو تیل کے معاملہ میں لوہے کے چنے چبوائے، اور عرب ممالک یورپ کے مد مقابل بن کر کھڑے ہو گئے، مرحوم شاہ فیصل نے دین ودولت یا مذہب وسلطنت کے اسلامی نظریہ کو پھر ایک بار دنیا کے سامنے عملی طور سے پیش کر دیا تھا۔ اور گذشتہ دور کی مسلمانوں کی دینی وسیاسی تحریکات کا نتیجہ یوں سامنے آ گیا تھا کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے مذہب اور حکومت کو ساتھ لے کر ابھر رہے تھے، اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو قائم ودائم رکھے اور ان کے کارناموں کی بہترین جزا ان کو دے۔ اور جلالۃ الملک خالد بن عبد العزیز کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، اس حادثہ فاجعہ پر تمام عالم محزون دل وغمگین ہے۔

(ماہنامہ البلاغ ممبئی)

جناب فخر الدین علی احمد

صدر جمہوریہ ہند

۱۱؍فروری ۱۹۷۷ء

افسوس ہے کہ ۱۱؍فروری ۱۹۷۷ء کو صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد نے اپنے عہدہ صدارت پر رہتے ہوئے انتقال کیا وہ ملک کے مایہ ناز سپوت اور بہترین ملکی اور ملی قومی رہنما ہونے کے ساتھ مسلمان آدمی تھے اور دینی قدروں کے حامل تھے، ان میں سرافت و انسانیت اور مقبولیت تھی، صدارت سے پہلے کئی عہدوں پر نہایت کامیاب رہے اور ملک وقوم کی خدمت کی ان کا تعلق اس طبقہ سے تھا جو دینی کاموں میں پیش پیش رہتا ہے۔ اس لئے علماء اور جمعیۃ العلماء سے ہمیشہ متعلق رہے۔ آسام میں انھوں نے شاندار خدمات انجام دیں مرکز میں آئے تو یہاں اپنے حسن کارکردگی سے صدارت کے عہدہ تک پہنچے، ان کی وفات جمعہ کے دن ہوئی اور تدفین نئی دہلی کی جامع مسجد کے سامنے ہوئی یہ ان کے حق میں نیک نشانیاں ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق۔

(البلاغ بمبئی)

حضرت مولانا فضل اللہ گیلانیؒ

۹ رمئی ۱۹۷۹ء

گزشتہ دنوں ہندوستان کے دینی اور علمی حلقہ کے کئی علمائے بارزین نے انتقال کیا، جس سے اسلامی ہند بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس شدید نقصان کا تدارک بظاہر نہیں ہوسکتا۔

غالباً ۹ رمئی ۱۹۷۹ء کو مولانا فضل اللہ صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے علی گڑھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا مرحوم ہندوستان کے محدثین کبار اور علمائے عظام میں صف اول کے عالم و برزگ اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں تفسیر کے استاد تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الادب المفرد'' کی شرح عربی زبان میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھی، جو مصر سے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی اور بعد میں بیروت سے بھی شائع ہوئی، اس کے علاوہ اپنے استاد مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کی شرح ترمذی کو اپنی محدثانہ علمیت وبصیرت سے ہر اعتبار سے کامل ومکمل کیا اور اس کی طباعت واشاعت کے لیے پوری زندگی کوشاں رہے، حتی کہ اس کے لیے سعودی عرب اور کراچی کا سفر بڑھاپے میں کیا اور بڑی تکلیف اٹھائی مگر افسوس کہ یہ ضخیم کتاب شائع نہ ہوسکی، راقم پر بے حد مہربان تھے، اپنی تصنیف فضل اللہ الصمد شرح الادب المفرد عنایت فرمائی۔ اور شرح ترمذی کے سلسلہ میں برابر خط وکتابت فرماتے رہے، جب بھی بمبئی آتے خوردہ نوازی فرماکر خود راقم کے کمرہ پر تشریف لایا کرتے تھے، ایک مرتبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جانا ہوا تو بار بار ملاقات کے لیے آتے رہے اور اپنی قیام گاہ پر چائے اور ناشتہ کی دعوت کی۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ کے پوتے اور مولانا احمد علیؒ کے صاحب زادے تھے، علم ومشیخت خاندانی ورثہ میں ملی تھی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (البلاغ جولائی ۱۹۷۹ء)

حضرت مولانا شاہ قمرالدین

امیر شریعت بہار واڑیسہ

۵/رجب ۱۳۷۶ء

۵/رجب ۱۳۷۶ھ میں بہار اوراڑیسہ کے تیسرے امیر شریعت اورزبردست عالم وصاحب دل حضرت مولانا الحاج شاہ قمرالدین صاحب نے ۶۴ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا آپ ۱۳۱۲ھ میں پیدا ہوئے تھے ۱۳۲۹ھ میں ظاہری اور باطنی علوم سے فارغ ہوگئے، اور بیعت، تعلیم تربیت، باطنی اجازت ،خلافت جمیع سلاسل، اور سندمرویات حدیث، اپنے والد حضرت مولانا الحاج شاہ بدرالدین صاحب امیر شریعت بہار واڑیسہ سے حاصل فرمائیں مرحوم نے دومرتبہ حج زیارت کی دولت پائی پہلی مرتبہ ۱۳۴۵ھ اور دوسری مرتبہ ۱۳۵۳ھ میں دونوں مرتبہ حرمین شریفین کے علماء اوراہل اللہ سے بھی اسناد حدیث اوراجازت سلاسل صوفیا حاصل کیں آخری وقت تک مولانا مرحوم درس وتدریس اور خدمت تصوف میں مصروف رہنے کے علاوہ امارت شریعہ کے کام ومتعلقہ امور و معاملات کو بحسن خوبی انجام دیا کرتے تھے ،۱۳۶۶ھ میں بہار اڑیسہ کے امیر شریعت ثالث باتفاق آراآپ مقرر کیے گئے تھے۔

مولانا مفتی کفایت اللہ مفتی اعظم ہند

۳۱/ دسمبر ۱۹۵۲ء

موت العالِم موت العالَم

عالم کی موت گویا عالم کی موت ہے مصداق اس کی مفتی اعظم کی موت ہے
ہے سوگوار آج گلستانِ علم و فضل اسرار علم وفضل کے محرم کی موت ہے
ہو رہا ہے کمال کا ماتم
عالم بے مثال کا ماتم
کر رہے ہیں مسائل امروز
اب جواب وسوال کا ماتم

(**اطہر**)

اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر انقلاب وتغیر، کون وفساد اور ایاب وذہاب کا سلسلہ اس وقت سے جاری ہے، جب سے یہ دنیا بنی اور اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک دنیا رہے گی، ان ہی تکوینیات کے سلسلہ ہست ونیست میں بعض ایسے جگر خراش، دل دوز اور اہم واقعات پیش آجاتے ہیں، جو تاریخ کے سینہ میں داغ بن کر رہ جاتے ہیں، اور اس دنیا کے لیے اہم ترین المیہ بن جاتے ہیں، اور تمام دنیا اس سے متاثر ہوتی ہے۔

ایسا ہی ایک المیہ کل بروز چہار شنبہ ۱۳/ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱/ دسمبر ۱۹۵۲ء کو

دہلی میں پیش آیا، جس کا ظہور مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کی شکل میں ہوا۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم قحط الرجال کے موجودہ دور میں علم وفضل اور دین ودیانت میں بین الاسلامی حیثیت کے مالک تھے، ان کے فیض سے دنیا سیراب ہورہی تھی، مرحوم کئی ماہ سے مرض الموت میں مبتلا تھے، ادھر مہینوں سے حالت نہایت نازک چل رہی تھی، آخر اللہ کا امر آیا اور وہی ہوا جسے بہر حال ہونا تھا۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم ماشاء اللہ خوب جیئے اور اپنی زندگی کی آخری گھڑی تک دنیا کو فیض پہونچاتے رہے، زندگی اسی راہ پر گذاری، جو علمائے اسلام کے لیے خدا نے معین کی ہے، پڑھا پڑھایا، اور ہزاروں ایسے شاگرد پیدا کیے، جن سے ملک مالا مال ہے، سامراجی طاقت کے مقابلہ میں جب تک طاقت رہی ڈٹے رہے، اور جیل وبند کو آباد کر کے یوسفی سنت کو زندہ رکھا، مدتوں جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے، اور افتاء کو اپنی زندگی کا ممتاز ترین مشغلہ بنایا، آپ نے عربی زبان میں حدیث کی مشہور کتاب نسائی شریف یا ابن ماجہ شریف کا حاشیہ لکھا، اردو میں مسلمان بچے اور بچیوں کے لیے مشہور کتاب ''تعلیم الاسلام'' تصنیف فرمائی، جو سینکڑوں زبانوں میں ترجمہ ہو کر کروڑہا کروڑ کی تعداد میں شائع ہو کر مسلمان بچوں کے لیے دین کی بہترین کتاب ثابت ہوئی، حضرت مرحوم نے اپنی زندگی کو دنیا بھر میں اس طرح مقبول بنالیا تھا کہ ملک کے تمام افراد اور فرقہ کے فرقہ کے لوگ آپ کا یکساں احترام کرتے تھے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت المرحوم کی وفات کو ہمارے لیے باعث ابتلاء نہ بنائے، اور ہمیں ان کا صحیح جانشیں دے، اور خود حضرت مرحوم کے ساتھ وہی معاملہ کرے، جو ایسوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ (انقلاب بمبئی یکم جنوری ۱۹۵۳ء)

مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی

۱۳۸۸ھ اوائل ذی قعدہ میں مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانیؒ نے اپنے وطن پانی پت میں انتقال فرمایا۔ مولانا تحریک خلافت اور تحریک آزادی کے صف اول کے لوگوں میں تھے، ساتھ ہی ساتھ صاحبِ دل اور صاحب نسبت بھی تھے عزم واستقلال اور صبر وتوکل کا کوہ گراں تھے، ۱۹۴۷ء میں جبکہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے خون کا دریا بہ رہا تھا اور مسلمان قافلہ در قافلہ ترک وطن کرتے تھے، مولانا نے پانی پت نہیں چھوڑا اور تن تنہا اس خون اور آتش کی بستی میں پڑے رہے، اور یقین ایمان کا یوں مظاہرہ کیا کہ جو لوگ مسلمان کے نام سے نفرت کرتے تھے وہ ان پر پروانہ کی طرح گرتے تھے اور ان کو بزرگ ترین انسان مان کر ان کی خدمت کرتے تھے، علم وروحانیت کا یہ پیکر اس دور میں ہندستان کے پرانے فقراء اور اہل اللہ کی یاد تازہ کر رہا تھا، اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ اپنی رحمت سے نوازے۔

حاجی محمد زاہد صاحب مبارکپوریؒ

(۲۰ جنوری ۱۹۵۱)

انسان فطرتاً حریص واقع ہوا ہے، اس کی طبیعت میں جلب منفعت کا رجحان بہت زیادہ ہے، وہ زندگی کے کسی مرحلہ پر پہنچ کر استغنا کا اظہار نہیں کرتا، بلکہ اس کی حریص طبیعت ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتی ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر ابن آدم کو سونے کی ننانوے وادیاں بخش دی جائیں تو اس کی تمنا ہوگی کہ ایک اور مل جائے، تو سو پوری ہو جائیں، مگر انسانی فطرت کا یہ مظاہرہ انسان کے لیے کمال نہیں، بلکہ نقص ہے، کمال یہ ہے کہ بے نیازی اور استغنا اس درجہ ہو کہ قدرت خود اس پر شیدا ہو کر اسے نوازنا شروع کر دے، حدیث شریف میں ہے کہ اصل غنیٰ دل کا غنیٰ ہے۔

آج ہم ایک ایسے ہی صاحب دل اور غنی انسان کی موت کا ماتم کر رہے ہیں، جس کی موت کے ساتھ ساتھ کتنی بیواؤں کی آرزوئیں، کتنے یتیموں کی امیدیں، کتنے بے سہاروں کے آسرے، کتنے بے کسوں کی ہمتیں، کتنے محتاجوں کے حوصلے مر گئے۔ اور اس ایک مرد کی موت سے ہزاروں انسانوں کی زندگی میں خلا پیدا ہو گیا۔

مبارکپور ضلع اعظم گڈھ کے مشہور بزرگ اور صاحب دل جناب حاجی محمد زاہد صاحب ۱۳؍ جمادی الاولیٰ چہار شنبہ مطابق ۲۰؍ جنوری (۱۹۵۱ء) کو انتقال کر گئے، مرحوم ضلع اعظم گڈھ کے ان بے نفس اور بے لوث مالداروں میں تھے جن کی دولت شاید خاندان سے

زیادہ مسلمانوں کے دینی، مذہبی، علمی اور اجتماعی کاموں پر صرف ہوئی، آپ کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ان اطراف میں جو مجددانہ کارنامہ انجام دیا ہے، اس میں بڑے بھائی کی دولت اور دلی استغنا کا بڑا ہاتھ رہا، بیس سال سے مرحوم کا خاندان علم و مذہب کی خدمت میں مشہور رہا ہے، اس خاندان کے افراد، اور اس کے سرمائے ملک کی کتنی تحریکوں اور اداروں کے کام آئے۔ مبارکپور میں مدرسہ احیاء العلوم، جدید جامع مسجد، عیدگاہ جیسی عظیم الشان اسلامی یادگاریں جن میں قوم نے کئی لاکھ روپیہ خرچ کیا حضرت حاجی صاحب مرحوم کی فیاضانہ طبیعت کا خصوصی ثبوت ہیں۔

افسوس کہ ایک حاجی محمد زاہد کی موت نے کئی دینی اداروں اور ان کے کارکنوں کے لیے ابتلاء پیدا کر دیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم میں ان کا مثل پیدا فرمائے، ان کے پسماندگان کو صبر جمیل دے، اور ان کو جنت الفردوس میں وہ مقام دے جو امتِ محمدیہ کے فداکاروں کے لیے مہیا ہے، اب ان اطراف کے ارباب کار کی نگاہیں حضرت مرحوم کے بڑے صاحب زادے محترم مولانا عبدالباری القاسمی امیر جامعہ عربیہ احیاء العلوم پر پڑ رہی ہیں، خدا کرے مولانا مرحوم کو خاندانی روایت کے زندہ رکھنے کی توفیق ملے۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا محمد اسلم فرنگی محلی

۲۲/اگست ۱۹۵۱ء

ہندوستان کی علمی لغت میں فرنگی محل ایک کثیر المعنی لفظ ہے، جس کی شرح عہد عالم گیری سے لے کر آج تک دنیا پڑھ رہی ہے، سرزمین اودھ کی ساری برکتیں اور علمی سرگرمیاں سمٹ کر لکھنؤ کے ایک محلّہ فرنگی محل میں آ گئی تھیں، فرنگی محل کا علمی خاندان تقریباً دوسو سال سے علم وفضل میں مشہور رہا ہے، حضرت قطب الدین شہید سہالی کے فرزندوں سے لے کر آج تک اس کا فیض ہندوستان اور بیرون ہند جاری ہے۔

حضرت مولانا محمد اسلم صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اسی خاندان کی اسی سالہ متبرک نشانی تھے، جو ۲۲/اگست ۱۹۵۱ء کو ہمیشہ کے لیے فرنگی محل سے نکل کر فردوس بریں چلے گئے، مولانا مرحوم اپنی علمی اور عملی زندگی میں اپنے بزرگوں کے سچے پیرو تھے، عبادت وتقویٰ اور درس وتدریس کے ساتھ خاندانی کام یعنی تصنیف وتالیف بھی مولانا قائم رکھتے تھے، ساری زندگی دنیاوی ہنگاموں سے الگ رہ کر خاموشی سے علم کی خدمت کرتے رہے، ساتھ ہی رشد وہدایت کے فیض کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔

افسوس کہ قحط الرجال کے اس زمانہ میں علم وفضل کی یہ آخری یادگاریں بھی رخصت ہو رہی ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کی روح کو جنت میں خوش رکھے، اور دنیا میں ان کا صحیح جانشین پیدا فرمائے۔ آمین

(انقلاب ۳۰/اگست ۱۹۵۱ء)

مرزا محمد عسکریؒ

ستمبر ۱۹۵۱ء

ستمبر کا مہینہ اردوادب کے لیے اس حیثیت سے جانکاہ رہا ہے کہ اس ماہ میں اب تک اس کے تین محسنوں کے مرنے کی اطلاع آچکی ہے ''مولوی مہیش پرساد'' ''مولانا ابوسعید بزمی'' کے سانحے کی خبر ملنے کے بعد تیسری خبر یہ ہے کہ لکھنؤ کے مشہور ادیب مرزا محمد عسکری بھی انتقال کر گئے۔ آپ کی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت میں بسر ہوئی، سخن سنجی، سخن فہمی کی بہترین قابلیت کے آدمی تھے، زبان کے اسلوب نگارش اور طرز ادا میں روزمرہ کے محاورات کے ماہر تھے، مرحوم اردو کی متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں، ذریعۂ معاش سرکاری ملازمت تھی۔

یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ آزادی کے بعد سے جب کہ اردو کی مخالفت پر پورے ملک نے سوائے ایک گروہ کے کمر باندھی، اور سرکاری اور غیر سرکاری زور اس کا گلا گھوٹنے میں خرچ ہوا، اس زبان کے بڑے بڑے ادیب وشاعر بھی اس سے جدا ہو گئے، مگر ان نازک ترین حالات مین بھی یہ زبان اپنی سخت جانی کی وجہ سے زندہ وتابندہ ہے۔

ضرورت ہے کہ پیش رووٴں کے پسماندگان اور باتوں کی طرح زبان کی سرپرستی میں بھی اپنے اسلاف کی پیروی کر کے بہترین اخلاف ثابت ہوں۔

(انقلاب ممبئی ۲۴؍ستمبر ۱۹۵۱ء)

مولانا محمد فاروق جون پوریؒ

(۷/اپریل ۱۹۵۲ء)

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ علم وفضل پر بھی زوال آیا، آخری دور میں جب شاہان شرقیہ نے سرزمین جون پور کو اپنا مرکز بنایا تو سرزمین ہند سے علم وفضل کی کائنات سمٹ کر جون پور میں آ گئی اور شاہ جہاں کو فخریہ لہجہ میں کہنا پڑا، ”پورب شیراز ماست“ سرکار جون پور میں بڑے بڑے فضلائے روزگار اور اکابر ملت اٹھے، اور اپنا کام کر کے روپوش ہوئے، باقیات صالحات میں آخری زمانہ تک کئی ہستیاں رہ گئی تھیں، ان ہی میں حضرت مولانا محمد فاروق صاحب جون پوری رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جن کا وصال ۷/اپریل ۱۹۵۲ء کو ہوا، مولانا مرحوم علمائے جون پور کی آخری یادگار تھے، علم وفضل خدا ترسی، تقویٰ، دیانت میں اپنی مثال آپ تھے، زندہ رہے تو اس طرح کہ شہرت سے کوسوں دور رہے، اور وصال فرمایا تو اس طرح کہ شاید متعلقین کو بھی خبر نہ ہو سکی، افسوس کہ ان بزرگوں کے اٹھنے سے ہمارا ملک ارباب علم وفضل سے خالی ہوتا جاتا ہے، اور ان کی جگہ خالی کی خالی رہ جاتی ہے۔

(انقلاب بمبئی ۱۴/اپریل ۱۹۵۲ء)

علامہ محمد زاہد کوثری مصریؒ

۱۰/اگست ۱۹۵۲ء

عالم اسلام کے لیے یہ خبر حد درجہ غم ناک ہے کہ دنیائے اسلام کے مشہور ترین عالم حضرت علامہ محمد زاہد کوثری مصری حنفی رحمۃ اللہ علیہ ۱۰/اگست ۱۹۵۲ء کو قاہرہ میں انتقال فرما گئے۔

یہ علمی حادثہ دنیائے اسلام کے لیے ایک عظیم الشان سانحہ ہے، مولانا محمد زاہد کوثریؒ سلطان ترکی کے زمانے میں وکیل فتویٰ تھے، فقہ حنفی کے زبردست عالم تھے، انقلابِ ترکی کے بعد جان لے کر مصر چلے آئے اور مرتے دم تک قاہرہ کے دریبۃ العباسیہ میں مقیم رہے، آپ کی عمر ستّر اسّی کے لگ بھگ تھی، آخر وقت میں موتیابند کی وجہ سے بینائی جواب دے چکی تھی مگر لکھنے پڑھنے اور مطالعہ میں ہمیشہ منہمک رہا کرتے تھے اور اس زمانہ میں بھی اپنے دوستوں کو جو جواب لکھتے وہ اس قدر دلچسپ اور طویل ہوتا تھا کہ بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی تھی، راقم الحروف کو آپ کے متعدد خطوط دیکھنے اور پڑھنے کا شرف حاصل ہے، مرحوم مسلمانوں کے قدیم و جدید رجال کے بہت بڑے ماہر تھے اور چودہ صدیوں کے علمائے اسلام کے حالات میں کافی بصیرت رکھتے تھے، مسلمانوں کی قلمی اور غیر مطبوع کتابوں کے حالات و اسماء کے لیے تو ایک جامع فہرست کی حیثیت رکھتے تھے، ہر قسم کی نادر کتابوں کے بارے میں واقفیت رکھتے تھے کہ اس کے نسخے دنیا میں کہاں کہاں ہیں اور کن کن صدیوں میں کن کن لوگوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، اسلامی کتب اور

اسلامی مصنفین کے بارے میں اتنی بصیرت شاید ہی اب کوئی دوسرا رکھتا ہو، ہندوستان کے متعدد فضلائے روزگار سے ان کے علمی تعلقات تھے اور باہمی خط وکتابت رہا کرتی تھی، آپ چھوٹی بڑی پچاس کتابوں کے مصنف ہیں۔ ''ظفر الامانی'' سیرت امام محمد بن حسن شیبانیؒ آپ کی مشہور ترین تصنیف ہے۔

لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد سے آپ کے قدیم علمی اور تصنیفی تعلقات تھے، اس کے علاوہ اور بھی کئی فضلائے ہند سے مراسم تھے، اس سطحی دنیا میں علم وفضل کی گہرائی کے یہ لوگ اب نہیں ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی روح پر فتوح کو جنت الفردوس میں سکون دے۔

علمائے اسلام کی زندگی

ایک مرتبہ علامہ زاہدی کوثری (سقاہ اللہ الکوثر) بحری راستہ سے کہیں تشریف لے جارہے تھے، سینہ تو کتب خانہ تھا ہی، سفینہ کو بھی کتب خانہ بنالیا تھا، بے شمار قیمتی کتابیں اور مسودات ساتھ ساتھ لیے سفر کررہے تھے، کیوں کہ زندگی کا یہ سرمایہ ایک لمحہ بھی اپنے سے جدا کرنا گوارا نہ کرتے تھے، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کشتی ڈوب گئی، ساتھ ہی ساری کتابیں اور مسودے بھی غرق ہوگئے، خود ڈوبتے ڈوبتے کسی طرح بچے مگر سمندر کا پانی لگ جانے سے آنکھوں کی بینائی پر برا اثر پڑا، نیز دوسرے امراض بھی لاحق ہوگئے اور زندگی بھر ''السفر کالسقر'' کی تلخی سہتے رہے۔

یہ واقعہ حضرت مولانا ابوالوفا الافغانی صدر احیاء المعارف النعمانیہ نے ایک مجلس میں راقم الحروف کے ایک علمی حادثہ پر بیان فرمایا تھا: اللہ اکبر! ارباب علم وفضل دنیا میں کس قدر سکون واطمنان کے مستحق ہیں، لکھنا، پڑھنا، مطالعہ کرنا، مظامین کی فراہمی،

تصنیف وتالیف کی کاوش کہیں بے اطمینانی میں ہوتی ہے؟ مگر زمانہ گواہ ہے کہ اسلام کے بڑے بڑے امام علوم وفنون اور مصنفین علم وفن کو کبھی سال دو سال سکون نہیں مل سکا ہے، اس کے باوجود علمی کاوش اور تصنیف وتالیف میں وہ دنیا کے بڑے بڑے سکون یافتہ لوگوں سے بدر جہاں بڑھے ہوئے ہیں، علامہ زاہدی کوثری سقاالله الکوثر بھی ان ہی پاک بازوں میں سے ہیں سارا علمی سرمایہ ''این دفتر پارینہ غرق مئے ناب ادنیٰ'' کی طرح سمندر کی نذر ہوگیا ترکی سے لٹے پٹے مصر میں ہجرت کے دن گزار رہے تھے مگر تصنیف و تالیف اور علمی ودینی گہرائی تک پہونچے ہوئے تھے، اسی لئے تو امام تاج الدین سبکیؒ نے ''طبقات الشافعیۃ الکبرائی'' میں امت محمدیہ کی کرامتوں میں اس کا صاحب تصانیف کثیرہ ہونا بھی شمار کیا ہے۔

(انقلاب ممبئی)

مشر و والا

۹ر ستمبر ۱۹۵۲ء

ملک میں یہ خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۹ر ستمبر ۱۹۵۲ء کی شام کو مسٹر کشوری لال مشر و والا وار دھا میں انتقال کر گئے، مسٹر مشر و والا ہماری سیاسی اور ملکی زندگی میں گاندھی جی کے دست راست تھے، ہریجن کی ایڈیٹری میں مشر و والا نے گاندھی جی کے نظریات کو ملک میں اصلی صورت میں پیش کیا، ان کے مرنے سے ہمارا ملک گاندگی جی ایک نہایت ہی ایسے مخلص شاگرد سے محروم ہو گیا، جو اپنے استاذ کی طرح ہوا کے کسی رُخ پر اصول کی چٹان سے ذرا بھی نہیں ہٹا۔

مسٹر مشر و والا نے نہ صرف یہ کہ اپنی زندگی کو گاندھیائی فلسفہ میں ڈھال لیا تھا، بلکہ اس موضوع پر متعدد کتابیں بھی انھوں نے لکھی ہیں، جو اپنا جواب آپ ہیں، مسٹر مشر و والا ۱۸۹۱ء میں گجرات کے مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے، ۱۹۱۶ء میں مہاتما گاندھی کے ساتھ ہو گئے، اس وقت ان کی عمر ۲۵ رسال تھی، اس کے بعد سے گاندھی جی نے تمام عمر اپنے ساتھ رکھا، اور اپنے خاص لوگوں میں ان کا شمار کر لیا، حتیٰ کہ گاندھی جی کے مرنے کے بعد بھی چار پانچ سال مسٹر مشر و والا ان کے خاص ہی لوگوں میں رہے، اور اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہٹے۔ ہم اپنے ایسے مخلصوں کی موت پر اس لیے اور زیادہ غمگین و رنجیدہ ہوتے ہیں کہ آج ہمارا ملک ایسے لوگوں کی خدمت کا اصلی مستحق ہے اور ان کے نہ ہونے پر ان کی جگہ سنبھالنے والے نظر نہیں آتے۔

آج جب کہ ملک میں فرقہ واریت، لوٹ، گھسوٹ، طبقاتی جنگ سر اٹھائے ہوئے ہے، مسٹر مشر و والا کی موت ملک کے لیے اہم سانحہ ہے، ضرورت ہے کہ ملک کے ذمہ دار حضرات مرنے والوں کے مشن کو زندہ رکھ کر ملک و قوم کو اسی راہ لے چلیں، جس پر گاندھی جی اور مشر و والا جیسے مخلص لے جانا چاہتے تھے۔ (انقلاب بمبئی ۱۱ ستمبر ۱۹۵۲)

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

۵/جون ۱۹۵۶ء

اسلامی، دینی اور علمی حلقوں میں یہ خبر نہایت ہی حسرت وافسوس کے ساتھ سنی گئی کہ سہ شنبہ ۲۶/شوال المکرّم مطابق ۵/جون ۱۹۵۶ء کو ہندو پاک کے مشہور عالمِ دین اور زبردست مفکر ومصنف حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وطن گیلان ضلع پٹنہ میں وصال فرما گئے۔

حضرت المرحوم ہماری بزمِ علم ودین کی آخری شمع تھے، اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد علمی تبحر، وسعتِ معلومات، کثرتِ مطالعہ، دقت نظر، اور فکر ونظر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف میں ایک کامل ومکمل شخصیت کے مالک تھے، افسوس کہ دیکھتے ہی دیکھتے شب دوشین کی یہ آخری شمع سحری بھی خاموش ہوگئی اور مجلسِ علم وفن کی ہنگامہ گستری دم کی دم میں ختم ہوگئی، اب حضرت مونا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی علمیت وجامعیت میں ان کا کوئی ہم پلہ نظر نہیں آتا۔

مولانا مرحوم جس طرح علم وفضل کے مجسمہ تھے، اسی طرح اعلیٰ اخلاق کے بہترین نمونہ تھے، مدتوں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے شعبۂ دینیات کے صدر رہے اور اپنے علمی فیض سے جامعہ عثمانیہ کو نوازتے رہے، ان کی تصنیفات میں ''مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' جیسی اہم ضخیم اور پُر مغز کتاب موجود ہے، اس کے علاوہ ''سوانح قاسمی'' اور ''ہزار سال پہلے'' جیسی محققانہ کتابیں بھی آپ نے اپنی یادگار میں چھوڑی ہیں، پھر ادھر چالیس پچاس سال سے ہندوستان کا کون سا علمی اور تحقیقی رسالہ اور اخبار تھا جس ''معارف'' اعظم گڑھ ''ماہ نامہ'' ''برہان'' دہلی'' اور ہفتہ وار ''صدق جدید'' لکھنؤ تو گویا ان کی تحققات ومعلومات کی جولان گاہ تھے، جس میں مولانا مرحوم کا اشہب قلم فراٹے

بھرا کرتا تھا، ادھر پچھلے دوسال میں آپ نے مجلّہ ''البلاغ'' بمبئی کو خوب خوب نوازا اور اسے بجا فخر ہے کہ حضرت المرحوم کے آخری تحریری تبرکات اسی کے صفحہ قرطاس کے ذریعہ قوم تک پہونچے اور آپ کے آخری افکار وخیالات کی ابلاغ وتبلیغ کا شرف بڑی حد تک رسالہ ''البلاغ'' ہی کو حاصل ہوا، افسوس کہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی وفات حسرت آیات نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک علمی اور دینی شخصیت سے محروم کردیا، جس کا وجود علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بعد مسلمانوں کے لیے باعث صبر وسکون تھا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کو اعلیٰ علیین میں اپنے جوارِ رحمت سے نوازے اور ان کی روح کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس کی بہار نصیب کرے اور مولانا کے متوسلین ومتلقین اور ہم تمام مسلمانوں کو صبر جمیل اور نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

(البلاغ جون ۱۹۵٦ء)

سحبان الہند علامہ محمد مبین چریاکوٹیؒ

یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

اکتوبر ۱۹۵۶ء کی پہلی تاریخ کو سحبان الہند علامہ محمد مبین صاحب کیفی چریاکوٹیؒ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا، آپ ضلع اعظم گڑھ کے مردم خیز مقام خطۂ یونان چریاکوٹ کے رہنے والے تھے اور استاد دوراں حضرت مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تھے، آپ خاندانی علمی روش سے ہٹ کر شعر وشاعری کی راہ پر چلے اور سحبان الہند کے لقب سے ملقب ہوئے، اقبال سہیل کے بعد علامہ چریاکوٹی کی وفات اعظم گڑھ کی شعری وادبی محفل کے لئے بڑا حادثہ اور ہماری اردو زبان کے لئے نقصان عظیم ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(البلاغ نومبر ۱۹۵۶ء)

مولانا محمد شاہد فاخری

۱۹۷۵ء

۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء شروع رمضان میں مولانا محمد شاہد فاخری رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عمر میں انتقال فرمایا، وہ الہ آباد کے مشہور روحانی مرکز دائرہ شاہ اجمل سے تعلق رکھتے تھے۔ دینی وروحانی مشاغل کے ساتھ ملکی وسیاسی امورمین عملی دلچسپی رکھتے تھے، اس سلسلے میں قید وبند سے دوچار ہوئے۔ جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر تھے۔ آخر میں یوپی پارلیمینٹری سکریٹری ہوگئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(البلاغ نومبر ۱۹۷۵ء)

شیخ محمد علی حرکان

۱۹۸۴ء

رابطہ عالم اسلامیہ مکہ مکرمہ کے جنرل سکریٹری (الامین العام) شیخ علی حرکان کا انتقال چند دن پہلے مکہ مکرمہ میں ہوا، اور عالم اسلام اس دور کی اپنی بہت بڑی محسن وفعال شخصیت سے محروم ہو گیا، رابطہ عالم اسلامی مسلمانان عالم کا سب سے بڑا منظّم ادارہ ہے، جس نے پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت مختلف جہات سے کی ہے، اس کے پہلے امین عام الشیخ صالح قزاز تھے، ان کے بعد مرحوم شیخ محمد علی حرکان آئے تو ان کے دور میں رابطہ کا دائرۂ عمل مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک پھیل گیا، اور مرحوم نے دینی واسلامی حمیت اور ہمت سے اس ادارہ کو مفید تر بنایا۔

آج کا دور پورے عالم اسلام کے لیے بہت ہی صبر آزما اور ابتلا کا ہے، یوروپ کی مسیحی طاقتیں صلیبی جنگوں کا بدلہ عالم اسلام پر سیاسی وفکری غلبہ کے بعد دوسرے انداز امیں لے رہی ہیں، اور اس دور میں ان کی اسلام دشمنی کا سب سے بڑا نشان اسرائیل کا وجود ہے، جس سے عرب ممالک خصوصاً اور عالم اسلام عموماً عجیب کش مکش میں ہے، اور اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں سخت اضطراب محسوس کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کی عجیب شان ہے کہ اس عجیب کش مکش کے دور میں جہاد کے بجائے عربوں کی دولت سے اسلام کی خدمت لے رہا ہے، جس کا سب سے بڑا امرکز رابطہ عالم اسلامی ہے، بلاشبہ یہ ادارہ اس دور میں اسلام کی خدمت اور اس کے صحیح تعارف میں بڑا کام کر رہا ہے، اور اس کے ذریعہ فکری اور اقتصادی جہاد برپا ہے، اس جہاد کے امیر شیخ محمد علی حرکان مرحوم تھے، جنھوں نے بڑی دوراندیشی اور پامردی سے کام کیا، اللہ تعالیٰ ان کو ان خدمات کا بہترین صلہ دے، اور رابطہ عالم اسلامی کی خدمات کے لیے ان کا بہترین بدل عطا فرمائے۔ آمین (انقلاب بمبئی ۲۰ را کتوبر ۱۹۸۴ء)

شیخ محمود عبد الفتاحؒ

۱۶/ اگست ۱۹۵۸ء

مصر کے مشہور مصنف، صحافی، اور محرر محمود عبد الفتاح مغربی جرمنی کے شہر بون میں ۱۶/ اگست ۱۹۵۸ء کو انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم مصر کے بہترین انشاء پرداز اور سیاسی مدبر تھے سیاست وصحافت کے مرکز تھے، ''المصری'' اخبار کی ایڈیٹری کے ساتھ سابق مصری پارلیمنٹ کی ممبری کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، موجودہ حکومت سے ان کی ان بن ہوگئی تھی، جس کے نتیجے میں وہ مصر سے جلاوطن ہو کر مغربی جرمنی میں رہنے لگے تھے، اور وطن سے دور رہ کر بھی وطن کی ہنگامی سیاست میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔

مرحوم محمود عبد الفتاح کی موت سے مصر اپنے ایک بڑے صحافی اور مدبر سیاسی سے محروم ہوگیا، اگر چہ یہ محرومی کئی سال پہلے ہی سے عملاً ہو چکی تھی، مگر اب ان کی موت نے اسے حقیقی اور دائمی بنا دیا۔

عام طور سے دنیا میں نڈر اور بے باک انسانوں کا انجام یہی ہوتا ہے کہ جس ملک کی فضا میں آنکھ کھول کر پروان چڑھتے ہیں، آخر میں ان کو اسے حسرت و یاس کے ساتھ جیتے جی خیر باد کہنا پڑتا ہے، اور وہ غریب الوطنی کی موت مرتے ہیں۔

(انقلاب ۲۵/ اگست ۱۹۵۸ء بمبئی)

مولانا محمد ابراہیم عمادی اعظمی

۱۷؍جنوری ۱۹۸۵ء

افسوس کہ مولانا محمد ابراہیم عمادی صاحبؒ بھی ۲۴؍ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۷؍جنوری ۱۹۸۵ء کو بمبئی میں انتقال کر گئے، رحمۃ اللہ علیہ

وہ اسی برس سے زائد کے رہے ہوں گے، ادھر پندرہ سالوں سے معذور ہو گئے تھے، جب تک طاقت رہی، چلتے پھرتے رہے، انھوں نے پوری زندگی بمبئی میں تعلیمی سلسلہ میں گذاردی، ساتھ ہی کئی کام کی کتابیں لکھیں، وہ ندوی اور جامعی یعنی قدیم وجدید کے جامع تھے، اعظم گڈھ کے ایک مغربی علاقہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے، جوان کا آبائی وطن تھا، چند سال پہلے کچھ دنوں وہاں مقیم رہے، مولانا مرحوم نے مسلمان سائنس دانوں کے حالات پر نہایت مستند کتاب لکھی تھی، اس کے کچھ حصے مختلف اخبار ورسائل میں طبع بھی ہوئے تھے، ان کی آخری تمنا تھی کہ یہ کتاب چھپ جائے، اور موجودہ جدید تعلیم یافتہ نسل اس کے ذریعہ اپنی ذہنی مرعوبیت ختم کرے، راقم سے اس پر مقدمہ لکھوایا تھا، معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوا یا ہوگا؟ بڑے نیک، متواضع، کریم النفس اور علم دوست بزرگ تھے، راقم کے بمبئی آنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد سے ان سے نیازمندانہ تعلق رہا، جو آج تک باقی رہا، وہ خود نہایت نیازمندی سے پیش آتے تھے، جس کی وجہ سے اپنا سر ندامت سے جھک جاتا تھا، یہ تھی ان شرافت اور علم دوستی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور اپنے جوار رحمت میں ان کو جگہ دے، اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازے۔

(انقلاب بمبئی ۲۸؍جنوری ۱۹۸۵ء)

الحاج محمد عمر بھڑوچہ

نومبر ۱۹۵۸ء

ہمارے محترم دوست مدرسہ امدادیہ دارالعلوم دوٹانکی بمبئی کے ناظم اور جمعیۃ علماء بمبئی کے رکن محترم الحاج ولی عمر بھڑوچہ صاحب کے والد محمد عمر بھڑوچہ نے گذشتہ دنوں اچانک انتقال کیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم پرانے وضع کے اور خاموش طبیعت کے آدمی تھے، اور ریاوشہرت سے دور رہ کر نیکی کے کام کرتے تھے، جس کی زندہ شہادت ان کے صاحب زادے الحاج ولی عمر بھڑوچہ کی خاموش علمی اور دینی خدمات ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے، اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، موت کے وقت پس ماندگان کے لیے رنج وغم کا ہونا فطری امر ہے، مگر اس میں اعتدال قائم رکھنا اور حد سے زیادہ غم کر کے اپنے کو ناامیدی اور قنوط میں ڈال دینا اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے، اس لیے اسلام نے ایسے موقع پر صبر جمیل کی شدت سے تلقین کی ہے۔

(انقلاب بمبئی)

شیخ محمد صالح المکیؒ

۱۸؍رجب ۱۳۸۰ھ

غالباً ۱۹۰۷ء کی بات ہے کہ مکہ مکرمہ سے محمد صالح مکی نام کا ایک نوجوان بمبئی آیا، اور اس نو وارد مسافر کا بکس وغیرہ چوری ہوگیا، دیارِ غیر میں اس مسافر کا لٹ جانا اس کے لیے مستقل تاریخ بن گیا، ایسی تاریخ جو آج مکمل ہوگئی، یہ لٹا ہوا عرب نوجوان بمبئی کی مینارہ مسجد میں آیا، غیرت اور خودداری نے کسی آدمی کے دروازے کے بجائے اسے اللہ کے در پر پہونچایا، ٹرسٹیوں نے حال واحوال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مجبور مسافر ہے، اس سے دریافت کیا کہ اذان دینی آتی ہے، اس کے جواب میں اس نے حجازی لہجہ میں کعبہ کے سوز وساز والی اذان سنائی اور تمام لوگ لٹو ہوگئے، اور کہا کہ آپ اس مسجد میں موذنی کی خدمت انجام دیں، اس دن سے آج ۱۸؍رجب ۱۳۸۰ھ کی سحر تک اللہ کا یہ بندہ مینارہ مسجد میں رہ بس گیا، اور اس نصف صدی کی زائد مدت میں ایک دن کے لیے مسجد سے باہر نہیں نکلا، غالباً چار سال ہوئے کہ ان کو حج کے لیے بھیجا گیا، تو گئے اور اپنے بھائی کے یہاں رہ کر حج ادا کیا، اور چلے آئے، صبح کو گھر سے نکلتے تو شام تک حرم محترم میں پڑے رہتے، پھر رات کو جا کر سو جاتے، اس نصف صدی سے زائد کی زندگی میں انھوں نے صرف اللہ سے رشتہ جوڑے رکھا، اور تجرد کی زندگی اس طرح بسر کی کہ آس پاس کے چھوٹے بڑے لوگوں کے یہاں بھی نہیں آئے گئے، نہ کسی سے آدھی بات ہوئی، ابتداء میں مینارہ مسجد سے متعلق ایک مدرسہ تھا، اس مدرسہ میں پڑھاتے تھے، اور ''بانگی جناب'' کے نام سے مشہور تھے، اس زمانہ کے ان کے شاگرد اب بھی ان کی بزرگی، خودداری، سادگی، بےنفسی کی کہانی سناتے ہیں، مسجد کا ایک تنگ سا حجرہ ان کا مسکن تھا، ان کے دور میں مینارہ مسجد میں بہت سے امام آئے گئے، مگر کسی سے ان کو کوئی اختلاف وتضاد نہ رہا، نہ اس مدت میں

کبھی نماز پڑھائی، اور نہ کسی سے کسی بات پر اختلاف کیا، حالاں کہ خود بھی نہایت اچھے حافظ اور جید قاری تھے، جو کچھ مسجد سے ملتا، کچھ کھاتے پیتے اور کچھ سال دو سال کے بعد مکہ مکرمہ اپنے بوڑھے بھائی کے پاس ان کے بال بچوں کے لیے بھیج دیتے، زہد وتقویٰ اور بزرگی وخدا ترسی کی زندگی کا کامل نمونہ تھے، نہ کسی کی دعوت میں جاتے، نہ کسی سے چاپلوسی کی بات کرتے اور نہ کسی سے بیکار تعلق رکھتے، بلکہ جوانی سے لے کر بوڑھاپے تک کی آخری منزل تک اس مسافر کے مانند رہے، جو اپنا گھر بھول کر کسی اجنبی سرائے میں پڑا ہو، جس کے جاننے پہچاننے والے نہ ہوں، اور بات بھی یہی ہے کہ حرم خداوندی کا یہ لٹا ہوا مسافر مینارہ مسجد کے ایک خلوہ اور زاویہ میں ٹھہر گیا، اور زادسفر سے زیادہ سامان نہ لیا۔

ادھر مدت سے صحت خراب رہا کرتی تھی، غذا بہت کم ہوگئی تھی، گذشتہ رات ایک صاحب کوئی دوا لے کر آئے اور کھلانے کے بعد ان کے سینے پر ہاتھ پھیرا، اور فرمایا کہ اب حالت اچھی ہے، چلے جاؤ پھر مسجد کے ایک ملازم کو بلا کر کہا کہ آج کی رات میرے قریب ہی سونا اور صبح صادق کے وقت نماز فجر سے ڈیڑھ دو گھنٹہ پہلے اسی سرائے سے چلے گئے، غیرت وخودداری کی یہ زندگی اور یہ موت قابل رشک ہے کہ مرتے وقت بھی انھوں نے کسی کا احسان نہیں لیا، اور اس طرح پائے گئے جیسے چادر تان کر باقاعدہ سوئے ہوئے ہیں۔

اس تحریر کے وقت حضرت الشیخ محمد صالح المکی الموذن رحمۃ اللہ علیہ سپرد خاک کیے جاچکے، حرم مکی کی یہ مقدس وپاکیزہ ہستی بمبئی کی آغوش میں چلی گئی۔

موت انسانی زندگی سے حجاب اٹھ جانے کا دوسرا نام ہے، حضرت مرحوم کے اٹھ جانے کے بعد ان کی حقیقت ہمارے سامنے آئی، اللہ تعالیٰ اپنے حرم پاک کے اس پردیسی کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

تاریخ ورجال کی کتابوں میں علمائے اسلام اور حضرت اولیاء کے تذکروں میں آتا ہے کہ وہ ذوان مسجد کے امام تھے، یا موذن تھے، حضرت محمد صالح المکی الموذن کی زندگی سے ان کے امام وموذن ہونے کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ (انقلاب ۹ رجنوری بمبئی)

حاجی محمد عمر کاکل

۲۱/ مارچ ۱۹۶۳ء

بمبئی کے مشہور سیاسی ورکر اور شہری وسماجی امور ومعاملات میں پیش پیش رہنے والے جناب حاجی محمد عمر کاکل صاحب ۲۱/ مارچ ۱۹۶۳ء کی دوپہر میں حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال کر گئے رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً

مرحوم سیاسی سماجی کاموں میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ علمی ودینی امور ومعاملات میں اچھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے، گجراتی زبان کے اونچے محققانہ ومؤرّخانہ مقالہ نگار تھے، گجرات کی اسلامی تاریخ خصوصاً اور ہندوستان کی دینی اور علمی تاریخ پر عموماً اچھی نظر تھی اور گجراتی اخبارات ورسائل میں مقالات ومضامین لکھتے تھے، اسی رشتہ سے احقر سے بہت محبت کرتے تھے اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر گھنٹوں باتیں کرتے تھے، بلکہ میرے بعض مقالات مندرجہ ''معارف'' اعظم گڑھ کا گجراتی ترجمہ بھی شائع کیا، کرایا تھا، اور میری کتاب نامہ ''نارجیل سے نخیل تک'' کی اشاعت کے خصوصی اہتمام وانتظام کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ پورٹ حج کمیٹی بمبئی کے ممبر تھے اور حجاج کی خدمت میں بے انتہا دلچسپی لیتے تھے، اسی طرح انجمن خدام النبی ان کی خدمات کا محور ومرکز مدتوں سے رہا اور وہ اس کے سرگرم ممبروں میں سے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو ان کے نیک کاموں کا بہتر سے بہتر صلہ دے اور مغفر فرمائے۔

(انقلاب بمبئی ۲/ اپریل ۱۹۶۳ء)

علامہ شیخ محمود شلتوت

۱۲/دسمبر ۱۹۶۳ء

یہ خبر عالم اسلام اور علمی و دینی دنیا میں بڑے رنج وغم کے ساتھ سنی جائے گی کہ جامعہ ازہر قاہرہ کے شیخ الجامعہ شیخ اکبر علامہ محمود شلتوت ۱۲/دسمبر ۱۹۶۳ء کو انتقال فرما گئے، رحمہ اللہ،

جامعہ ازہر ایک ہزار سال سے زائد سے اسلامی علوم وفنون کی عالمی درس گاہ ہے، اور ہر زمانہ میں اس کے شیخ اکبر وقت کے سب سے بڑے مصری رہا کیے ہیں، چنانچہ شیخ محمود شلتوت بھی علمائے مصر میں اپنے علم وفضل اور تبحر وقابلیت میں اس معیار پر پورے اترے، اور جامعہ ازہر کی مشیخت کے مسند نشیں رہے، شیخ شلتوت ویسے تو جملہ اسلامی علوم وفنون پر گہری نظر رکھتے تھے، مگر اسلامی فقہ اور اصول فقہ میں ان کا مقام بہت بلند تھا، انہوں نے اپنے دور مشیخت میں جامعہ ازہر کو ئی حالات میں گذرتے دیکھا، اور کوشش کی کہ خوبی اور خوب صورتی کے ساتھ جامعہ ازہر اپنے معیار پر قائم رہے، انھوں نے اس سلسلہ میں کئی خالص دینی معاملات ومسائل میں عام اسلامی فکر اور علمائے اسلام کے نظریہ سے الگ بات کی، جن میں سے بعض پر ہم نے بھی شدید انداز میں انھیں کالموں میں نکیر کی تھی، مگر مرحوم شیخ کے سامنے جو حالات تھے، اور جن صورتوں میں رہ کر انہوں نے ان مسائل میں اپنی رائے ظاہر کی تھی، وہ ہمارے سامنے نہیں ہیں، اس لیے ان کو ان میں معذور قرار دینے کے وجوہ ہیں، اور ان کی نیت میں شبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، پھر انہوں نے جن بعض مسائل میں انفرادی بات کی تھی، اس کے لیے وہ بھی دلیل بیان کرتے تھے، اور پہلے کے بعض علماء کی آراء سے استشہاد کرتے تھے، ذمہ دار علماء احوال وظروف کی نزاکتوں میں رہ کر کام کرتے ہیں، جن سے بعض اوقات دوسروں کو غلط فہمی ہوتی ہے، اللہ کرے جامعہ ازہر کی صدارت وریاست کے لیے کوئی اونچا صاحب علم وفضل مل سکے، جو تبحر کے ساتھ ساتھ دینی ذہن ومزاج میں بھی امام ہو، شیخ محمد الغزالی شیخ محمد ابوزہرہ اور شیخ محمد ابوشہبہ جیسے ارباب علم وفضل کی ہستیاں موجود ہیں، دیکھنا ہے کہ جامعہ ازہر کی مشیخت ان میں کس کے حصہ میں آتی ہے۔ (انقلاب بمبئی ۱۵/دسمبر ۱۹۶۳ء)

(

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب دھلوی

۲/اپریل ۱۹۶۵ء

جمعہ مبارکہ ۲۹/ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۲/اپریل ۱۹۶۵ء کو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب دہلوی لاہور میں انتقال فرما گئے اور ان کی لاش بذریعہ ہوائی جہاز دہلی لاکر دفن کی گئی۔

یہ ہے پوری کہانی اس زندگی کی جس نے صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عالم اسلام میں الجزائر و مراکش سے لے کر چین و جاپان تک دینی اور اسلامی ذہن و مزاج پیدا کرنے کے لیے تبلیغی سرگرمی پیدا کی تھی اور جس کی داستانِ جدوجہد پورے عالم اسلام میں بیان کی جاتی تھی، اس عالم گیر، پر جوش اور سماجی زندگی کی تمام تبلیغی ہنگامہ آرائیوں اور دین کے لیے ساری عالمی محنتوں کو موت نے سمیٹ کر مختصر کر دیا، یہ ہے وجود و عدم کی بات اور یہ ہے موت و حیات کا فرق!

حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تبلیغی کاموں کو جس جوش اور ولولہ کے ساتھ آگے بڑھایا تھا، یہ ان کی زندگی کا کامیاب ترین کارنامہ ہے، والد مرحوم نے اپنی ساری زندگی ایک علاقہ کی اصلاح پر صرف کر کے دین داروں کی ایک جماعت تیار کی تھی، جس نے ہندوستان میں گھوم گھوم کر دین کا کام کیا اور مرحوم کے صاحب زادے نے اپنے عزم وارادہ سے اسے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔

تبلیغی کام کسی منظّم ادارہ، دفتر، رکنیت، فیس اور تنظیم کے ماتحت نہیں ہو رہا ہے

اور تبلیغ اسلام کا کام ہوتا رہے گا، مولانا محمد یوسف صاحب شعلہ جوالہ بن کر دنیا بھر میں پھرا کرتے تھے، چار چار گھنٹہ تقریر فرماتے تھے، رات و دن ایک کیے رہتے تھے۔ اسی کے ساتھ بڑی خوبی یہ تھی کہ علمی اور تصنیفی کاموں میں بھی لگے رہتے تھے، چناں چہ شرح طحاوی اور حیات الصحابہ ان کی دو کتابیں عربی زبان میں ان کے علمی کارناموں کی یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو ان کے نیک کاموں کی بہترین جزا دے اور ان کے دینی کاموں کے لیے اپنے بندوں کو تیار کرے، جو اُن ہی کی طرح تن من دھن سے اس کام میں لگے رہیں۔

اخلاص، للّٰہیت، دین کی سچی تڑپ اور اسلام پر فدائیت کا جو رنگ مولانا مرحوم پر تھا، وہ ان ہی کا حق تھا، جو اُن کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا، اللہ تعالیٰ دین کے مخلص خادموں کو ان کے نقش قدم پر چلائے کہ آج اس کی بڑی ضرورت ہے۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا محمد شعیب رسول پوریؒ مبارکپوری

۱۲؍دسمبر ۱۹۶۵ء

مولانا محمد شعیب صاحب رسول پوری مبارکپوری نے ۱۸؍شعبان ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۲؍دسمبر ۱۹۶۵ء کو اپنے وطن میں انتقال فرمایا، اور رسول پور کی معلّمی بزم کا ایک اور چراغ گل ہوگیا۔ مولانا محمد شعیب صاحب تقریباً ۶۵ سال تک چشمۂ رحمت کالج غازیپور سے متعلق رہے۔ اور مدتوں اس کی صدر مدرسی کی عمر اسّی سے زائد ہوچکی تھی، بڑے بڑے علماء وفضلاء آپ کے تلامذہ میں ہیں، زندگی بھر درس وتدریس میں رہے، نیکی اور شرافت نفس میں اپنی مثال آپ تھے آپ سے پہلے آپ کے والد مولانا عبدالعلیم صاحب رسول پوری چشمۂ رحمت کالج غازیپور کے پرنسپل تھے۔ اس طرح اس خاندان کا علمی اور دینی تعلق غازیپور سے سینکڑوں سال تک رہا، مولانا محمد شعیب نے درسیات کی تکمیل کی تھی۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی، مولانا محمد طیب عرب مکی وغیرہ سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ مولانا فاروق چریاکوٹی سے بھی فیض حاصل کیا تھا، جس زمانہ میں مولانا چریاکوٹی چشمۂ رحمت کالج میں مدرس تھے۔

مولانا محمد شعیب صاحب زہد وتقویٰ، بےنفسی اور شرافت وانسانیت میں اپنی مثال آپ تھے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو ان کے نیک اعمال کی جزا میں اور اپنے فضل وکرم سے جوار رحمت میں جگہ دے۔ جب کبھی کسی کتاب کے سلسلے میں مجھے خط لکھتے تو اس طرح خطاب فرماتے جیسے کوئی چھوٹا اپنے بڑے کو خطاب کررہا ہے، حالاں کہ وہ میرے ماموں ہوتے تھے اور ہر اعتبار سے مخدوم ومحترم تھے۔ کسر نفسی میں وہ سب سے الگ اور ممتاز تھے۔ ایسے بزرگوں کی مستقل سوانح لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ ان سے سبق حاصل کریں اور اپنی دنیا وآخرت سنواریں۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا مسعود علی صاحب ندوی

۲۸/اگست ۱۹۶۷ء

افسوس کہ ۲۸/اگست ۱۹۶۷ء کو مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے اعظم گڑھ میں انتقال کیا، اس وقت ان کی عمر اسی کے قریب تھی، انہوں نے تقریباً ۵۲/سال تک دارالمصنفین کے انتظام واہتمام کو سنبھالا اور اپنے سلیقہ مندی اور حسنِ انتظامی سے اس ادارہ کو ترقی دی۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی قابلیت اور مولانا مسعود علی ندوی کی انتظامی صلاحیت نے دارالمصنفین کو دارالمصنفین بنایا۔ مولانا مسعود علی علامہ شبلی کے مخصوص تلامذہ اور علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام کے ہم سبق اور ساتھی تھے، انہوں نے اپنی سیاسی سمجھ بوجھ سے بڑا کام لیا، اور تحریک خلافت میں نمایا خدمات انجام دیں۔ ان کے تعلقات گاندھی جی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے سیاسی لیڈروں اور رہنماؤں سے بڑے شگفتہ تھے۔ معیارِ زندگی نہایت اونچا تھا۔ خورد و پوشش اور رہنے سہنے میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ ساتھ ہی بڑے باذوق، خوش مذاق زندہ دل اور بذلہ سنج آدمی تھے۔ مجلسی زندگی کی جان تھے، ویسے تو کئی سال سے فالج کے مرض میں مبتلا ہو کر کہنا چاہیے کہ مرحوم ہو چکے تھے اور ان کی زندگی معطل ہو کر رہ گئی تھی، پھر بھی اپنی جیسی تیسی زندگی کے ساتھ پچاس سالہ تاریخ رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ خدا کرے دارالمصنفین حضرت شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور محترم سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے علم وانتظام کے زیرِ سایہ اپنے روایت کو برقرار رکھے اور ترقی کرے۔

(البلاغ ستمبر ۱۹۶۷ء)

حضرت علامہ محمد ابراہیمؒ بلیاوی

۲۸/دسمبر ۱۹۶۸ء

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ کے ماتم میں قلم کی دیدہ تری ابھی تک ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ حضرت علامہ جامع المعقول والمنقول مولانا مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ مدرس اعلی دارالعلوم دیوبند کا ماتم کرنا پڑ گیا۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ ۲۵/رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ ۲۸/دسمبر ۱۹۶۸ء پنجشنبہ کو فالج کے مرض میں فوت ہوئے رحمہُ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

اگر اپنے اپنے زمانہ میں ہندوستان کے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور علامہ محمود جونپوری (جن کا مولد بھیرا ضلع اعظم گڑھ تھا) پورے عالمِ اسلام میں علوم عقلیہ کے بلا اختلاف سب سے بڑے امام تھے تو بلاشبہہ علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ اپنے زمانہ میں اسی حیثیت کے مالک تھے، ان کے بعد ہندوستان میں غزالی، رازی، جوینی وماتریدی، اور اشعری کے علوم وفنون کا سمجھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب دارالعلوم دیوبند کی بزم علمِ وفن کی آبرو تھے، اوران کی ذات پر جامعیت ختم تھی۔ ان کے حلقہ درس میں ہندوستان سے لے کر سمرقند و بخارا تک کے طالبانِ علم وفن یکساں فیض یاب ہوئے اور تقریباً نصف صدی تک ان کی نظر سے ہزاروں اہلِ علم کیمیا گر بن گئے، علوم دینیہ، فقہ، حدیث، تفسیر میں مہارت تامہ رکھتے ہوئے منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، اور علمِ کلام میں عبقریت کے مالک تھے، اب تو ہماری درس گاہوں میں توضیح تلویح، شرح مطالع، الافق المبین ملا جلال، میر زاہد، مسامرہ، خیالی، قطبی، اقلیدسی، سبع شداد، شرح چغمینی، تصریح، صدر شمس بازغہ کے نام تک سننے میں نہیں آتے، مگر حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کے دم سے یہ کتابیں ان کی بزم تدریس کی زینت تھیں، درآں حالانکہ

جس شان سے مولانا ان کتابوں کو پڑھاتے تھے اور اپنے درس میں میر باقر داماد اور طوسی نہیں بوعلی سینا، ابونصر فارابی بلکہ افلاطون اور ارسطو سے ٹکراتے تھے، اسی شان سے احادیثِ رسول کا درس دیتے، صحیح مسلم شریف، اور جامع ترمذی شریف کا درس تو کہنا چاہیے کہ ان ہی کا حصہ تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ وشیوخ کی خصوصیت خاصہ روحانی نسبت ہے، اس میں بھی مولانا مرحوم اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے، آج مولانا دنیا میں نہیں رہے، مگر کئی ہزار کی تعداد میں ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ دنیائے اسلام میں اپنے شیخ کی علمی ودینی واراثت تقسیم کررہے ہیں۔ ساتھ ہی مولانا مصنف بھی تھے، سُلّم کی شرح چھپ چکی ہے، ترمذی شریف کی نہایت جامع شرح عربی زبان میں کئی جلدوں میں لکھی ہے جس سے ان کے علم حدیثِ رسولؐ میں تبحر اور مہارت وبلوغت کا پتہ چلتا ہے۔

برصغیر ہندوپاکستان کا یہ علمی دینی نقصان بڑا سانحہ عظیم ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو ان کی دینی وعلمی خدمات کی بہترین جزادے اور جنت الفردوس کے غرفہ میں وہ خوش ہوں اور پس ماندگان کو صبر جمیل کے ساتھ ہمیں نعم البدل دے۔

(البلاغ جنوری ۱۹۷۹ء)

علامہ محمد نصیف جدہ

۲۶؍جولائی ۱۹۷۱ء

علامہ محمد نصیف جدہ نے تقریباً ستر سال کی عمر میں طائف میں ۲۶؍جولائی ۱۹۷۱ء کو انتقال کیا اور جدہ میں دفن کیے گئے۔ وہ نسلاً ترکی تھے اور ترکوں کے زمانہ میں ان کے آباءواجداد امریکہ کے وکیل ہوا کرتے تھے۔ سعودی حکومت میں انہوں نے اپنی خدمات سے کافی مقبولیت حاصل کی تھی، نیز سعودی حکومت سے ان کے مراسم خصوصی اور گہرے تھے، جدہ کے اعیان واشراف میں بڑے اہم مقام کے مالک تھے، کتابوں اور اہلِ علم سے تعلق تھا، ان کے خاندانی کتب خانہ میں تقریباً سولہ ہزار کتابیں مطبوعہ اور قلمی موجود تھیں۔ نادر ونایاب کتابوں کی طباعت واشاعت کا ذوق بہت اونچا تھا، اس سلسلے میں علمی تعاون کے ساتھ مالی مدد خود بھی کرتے تھے اور دوسروں سے بھی کراتے تھے، ہندوستان کے بعض علمی ودینی حلقے بھی ان کے اس علمی فیض سے مستفیض ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

(البلاغ اگست ۱۹۷۱ء)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ

۱۲/دسمبر ۱۹۷۴ء

افسوس کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ناظم، رسالہ معارف کے ایڈیٹر اور بہت سی علمی، تاریخی، ادبی، اور دینی کتابوں کے مصنف حضرت مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی رحمۃ اللہ علیہ ۲۸/ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۲/دسمبر ۱۹۷۴ء کو جمعہ کے دن ۴/بجے شام میں اچانک انتقال کر گئے، حسب معمول بال بنوایا، غسل کیا، کھانا کھایا، نماز جمعہ ادا کی، پھر سو گئے اور عصر کی نماز کے وضو کے لیے اٹھ رہے تھے کہ زمین پر گر گئے اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئے۔ وصیت کے مطابق اپنے وطن ردولی لے جا کر آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

سلسلۂ صابریہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت احمد عبدالحق ردولویؒ سے شاہ صاحب کا نسبی تعلق تھا، انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۷۲/سال کی تھی، جس میں سے تقریباً ۴۷ سال دارالمصنّفین میں گزرے تھے، ان کے انتقال سے دارالمصنفین سے بزمِ شبلی وسلیمان کی، کہنا چاہیے کہ آخری یادگار ختم ہوگئی، علامہ سلیمان کے دارالمصنفین چھوڑنے کے بعد وہی اس کے ناظم اور معارف کے ایڈیٹر رہے۔ شاہ صاحب اپنی نیک نفسی، شرافت طبع، خوش خلقی، وضعداری، علمی وقار اور دینی وروحانی زندگی کے اعتبار سے بڑی پُرکشش شخصیت کے مالک تھے، ان کا علمی اور ادبی ذوق نہایت صاف ستھرا تھا۔ تصنیف وتالیف اور طرزِ نگارش میں شبلی وسلیمان کے ترجمان تھے۔ تواریخ وسوانح کے موضوع پر بہت سی معیاری کتابیں لکھیں، آخری دور میں ''دینِ رحمت'' نامی کتاب لکھی، جو اسلام کے محاسن ومفاخر کے بیان میں اپنے طرز کی خوب کتاب ہے، گزشتہ سال اپنے استاد مولانا سید سلیمان کی سوانح ''حیات سلیمان'' کے نام سے شائع کر کے حق شاگردی ادا کیا۔ جس

طرح خود سید صاحب نے حیات شبلی لکھ کر اپنے استاد کا حق ادا کیا تھا۔ ان کی بھار بھرکم شخصیت دارالمصنفین کا بھرم تھی، علمی و تصنیفی خدمات پر حکومت کی طرف سے ان کو ایوارڈ بھی ملا تھا۔ قد ابھرتا ہوا جسم موزوں، سرخی لیے ہوئے چہرہ پر نورانی داڑھی رنگ گندمی، آواز بھاری بھرکم تھی، چہرے بشرے سے معصومیت ظاہر ہوتی تھی، طبیعت میں سادگی تھی، خوش خورد و خوش پوش تھے، طبعاً خاموش اور کم آمیز تھے، مگر جن سے وابستگی ہو جاتی تھی ان کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے کھل کر ملتے تھے، معمولی معمولی باتوں پر ان کی پریشانی اور گھبراہٹ قابل دید ہوتی تھی۔ داؤ پیچ سے قطعاً نا آشنا تھے، دارالمصنفین کی نظامت میں محترم سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب پر پورا اعتماد رکھتے تھے، موصوف نے بھی شاہ صاحب کی نیابت میں بہترین انتظامی صلاحیت سے کام لے کر دارالمصنفین کو نامساعد حالات میں اس کے کیف و کم کے ساتھ برقرار و استوار رکھا۔

بیس سال سے زائد مدت سے راقم کو شاہ صاحب سے نیاز مندانہ تعلق رہا ہے، اس سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ شاہ صاحب نے خود اپنے اخلاق و محبت سے مجھے اپنے قریب فرمایا، صورت یہ ہوئی کہ ''البلاغ'' میں میرے مضامین شائع ہوتے تھے، جن کو شاہ صاحب مستقل طور سے ملاحظہ کرتے تھے، اور جب کبھی ملاقات ہو جاتی تو فرماتے کہ ان مضامین کا حلقہ ''البلاغ'' کا نہیں ''معارف'' کا حلقہ ہے۔ ان تاریخی و تحقیقی اور علمی مضامین سے ''البلاغ'' کے قارئین کو کیا دلچسپی ہوگی، آپ ان کو معارف میں دیا کریں، میں اس کو درست کر کے شائع کروں گا۔ چناں چہ سب سے پہلا مضمون ''رجال سندھ و ہند'' ساتویں صدی تک معارف میں چار قسطوں میں سر مقالہ بنا کر شائع کیا اور اس کی تعریف کر کے تشجیع و تشویق کی شاہ صاحب سے اس کا تذکرہ ہوا تو مسودہ دیکھنے کی خواہش کی، میں نے دیا تو ہفتوں کے بعد بکمال حفاظت واپس کر کے ہمت افزائی کی اور کتاب چھپ گئی تو معارف کے شذرات میں اس کا شاندار تذکرہ کیا۔ اس کے بعد معارف میں میرے مقالات برابر شائع کرتے رہے اور اکثر مضامین کو سر مقالہ بناتے تھے ابتدا میں

اکثر مضامین عرب و ہند کے علمی و دینی تعلقات پر ہوا کرتے تھے۔ بعد میں دیار یورپ کے علماء و شائخ اور علمی سرگرمی سے متعلق ہوتے تھے، جب کوئی مضمون روانہ کرتا تو فوراً رسید سے مطلع کرتے اور پہلے خود بالاستیعاب پڑھ لیتے تھے ان کو دیار یورپ کے علم و علماء سے متعلق مضامین سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ملاقات ہوتی تو خوب داد دیتے اور فرماتے کہ آپ نے اس دیار کی علمی تاریخ لکھ کر بڑا کام کیا۔ یہ قرضہ اب تک باقی تھا، جسے آپ نے ادا کیا ہے۔ میرا معمول تھا کہ جب وطن جاتا تو متعدد بار دارالمصنفین جا کر شاہ صاحب سے نیاز حاصل کرتا تھا۔ اگر جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا عبدالباری (ابوعلی اعظمی) جناب یحیی اعظمی مرحوم، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی اور دیگر احباب سے ملنے ملانے میں دیر ہو جاتی اور شاہ صاحب کو میری آمد کا علم ہو جاتا تو خود آواز دے کر بلاتے یا ملازم کو بھیجتے، اور حاضری پر بڑے نشاط و انبساط کے ساتھ بٹھاتے، فوراً پان کی ڈبیہ مع دیگر لوازم کے پیش کرتے، اور سلام و کلام کے بعد کسی موضوع پر بات چھڑ جاتی، جس کا سلسلہ گھنٹوں تک چلتا تھا، اور میں جب اٹھنے کا ارادہ کرتا تو بٹھاتے، اس طرح تین چار بار ''چل رہا ہوں، اور رہئے'' کے بعد اجازت دیا کرتے تھے۔ ایک بار دارالمصنفین میں حاضری ہوئی تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں ابھی کل ردولی سے آیا ہوں اور وہاں کی بہترین مٹھائی لایا ہوں، چلئے آپ کو کھلاؤں، یہ کہ کر دفتر سے اٹھے اور ساتھ لے کر چلے، راستہ میں میرے کاندھے پر نہایت شفقت سے ہاتھ رکھ کر فرمایا قاضی صاحب! مجھ کو آپ سے بڑی محبت ہے، آپ خوب کام کر رہے ہیں، بمبئی جیسے ہنگامہ خیز اور غیر علمی شہر میں رہ کر انقلاب، البلاغ، مستقل تصنیف و تالیف اور دوسرے رسائل کے لیے مضامین لکھنے کا وقت کہاں سے پاتے ہیں؟ پھر اپنے قیام گاہ پر لے جا کر خاطر تواضع کی اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔

میرے قیام مبارک پور کے زمانہ میں اگر دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ ہونے والی ہوتی تو پہلے ہی دعوت دے کر شرکت کے لیے تاکید کرتے تھے، اور میری

حاضری سے مسرور ہوتے تھے۔

دارالمصنفین کے پچاس سالہ جشن کے سلسلے میں بمبئی تشریف لائے تو یہیں اس میں شرکت کی یہ کہہ کر دعوت دی کہ باقاعدہ وہاں سے دعوت نامہ کے منتظر نہ رہیں، آپ کے تعلقات عزیزانہ ہیں۔ جو اس قسم کے تکلفات سے بالاتر ہیں۔ مگر میں مصروفیت کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہوسکا، بعد میں معارف کے شذرات میں اس تعلق کا اظہار فرمایا۔

اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے موقع پر میں وطن میں تھا اور اس میں شرکت کی، شاہ صاحب اس سے بے حد خوش ہوئے۔

ان کی شفقت ومحبت کی وجہ سے میں ان سے بہت بے تکلف ہوگیا تھا، بعض میرے الٹے سیدھے تبصروں سے بہت خوش ہوتے اور خود بھی تفریحی باتیں کرنے لگتے۔ الغرض ان کے کریمانہ اخلاق، مربیانہ شفقت اور علمی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے مجھ کو ان سے بڑی عقیدت پیدا ہوگئی تھی اور وہ بھی مجھ سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اگر شاہ صاحب کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو یقین ہے کہ وہ مجھے دارالمصنفین میں کھینچ لیتے، چناں چہ حج ۱۳۹۳ھ کے موقع پر بھی فندق مکہ میں مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کی موجودگی میں اس قسم کی بات آئی تھی۔

پہلی بار حج وزیارت کے سفر سے پہلے اکثر ملاقات میں اپنے ذوق وشوق اور ارادہ کا اظہار فرماتے اور میں عرض کرتا کہ جب پختہ ارادہ ہو تو فرمائے گا میں بھی چلوں گا۔ اللہ کی شان کہ شاہ صاحب نے دو مرتبہ حج ادا فرمایا اور دونوں مرتبہ راقم ان کے ساتھ رہا۔ ۱۳۸۵ھ میں شاہ صاحب نے پہلا حج خاندان کے بعض افراد کے ساتھ کیا، مجھ سے چند دن پہلے روانہ ہوئے، میں بعد میں پہونچا، حرمین شریفین میں روزانہ بلکہ دن میں بار بار ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مکہ مکرمہ میں اہل علم سے ملنے میں عموماً ساتھ رہا کرتے تھے۔ ویسے شاہ صاحب کم آمیز تھے مگر کبھی کبھی کہتے کہ آیئے ذرا تفریح کرلیں۔ اور مدرسہ صولتیہ یا ہندوستانی سفارتخانہ یا پھر بعض ہندوستانی معاصر اہل علم کے یہاں چلے جاتے تھے،

مدینہ منورہ میں بھی ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، فرماتے تھے کہ یہاں آ کر بڑا سکون معلوم ہوتا ہے اور قلب وروح کو عجیب کیفیت محسوس ہو رہی ہے۔ یہاں سب سے زیادہ تفریحی موقع عصر اور مغرب کے درمیان مسجد نبوی شریف کے صحن میں اس وقت ہوتا تھا، جب کہ جامعہ اسلامیہ کے ہندوستانی اور پاکستانی طلبہ کے درمیان میری اور فضیلۃ الشیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد مصری استاذ جامعہ کی کسی موضع پر گفتگو چھڑ جاتی اور طلبہ لطف لیتے، شاہ صاحب بھی اس مجلس میں پابندی سے شریک ہو کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس مجلس میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوا کرتی تھی اور کبھی کبھی مناظرانہ رنگ آ تا تھا۔ ہندو پاکستان کے طلبہ اس میں شریک ہو کر اس لیے خوش ہوتے تھے کہ عرب علماء سمجھتے ہیں کہ ہندو پاکستان کے علماء علم ومعلومات میں ان سے کمتر درجہ کے ہوتے ہیں، حالاں کہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ عربی میں مافی الضمیر کو ادا نہیں کرتے۔

۱۳۹۳ھ میں شاہ صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی ملک فیصل کی دعوت پر حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اتفاق کی بات کہ راقم بھی اس سال اس نعمت سے بہرہ ور ہوا۔ ان حضرات کا قیام فندق مکہ میں تھا۔ راقم اکثر حاضر ہوا کرتا تھا کئی مقامات پر ان حضرات کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا۔ خاص طور سے حدیقۃ الزہرا کی اور حج سے دو دن پہلے منیٰ، عرفات، مزدلفہ کی سیر بہت پُرلطف رہی۔

شاہ صاحب خاندانی مشیخت رکھتے تھے۔ صابریہ، چشتیہ اور قدسیہ سلسلے ان کے گھر کے تھے۔ اسی مناسب سے اس سلسلے کے ایک بزرگ کی عرفیت ''بساون'' تھی اور خاندان میں اسی سے پکارے جاتے تھے۔ مگر علم وتحقیق کو ترجیح دے کر سجادہ نشینی کی زندگی سے دور رہے، بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ آخر میں مونا محمد زکریا صاحب کاندھلوی سے بیعت ہو گئے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ ایک زمانہ میں مولانا عبدالغنی پھول پوری مجھ سے کچھ کشیدہ رہا کرتے تھے۔ دارالمصنفین آتے تو مجھ سے ملاقات نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ میں نے ان کو پکڑا اور کہا کہ مولوی عبدالغنی! میں نے سنا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو، معلوم نہیں ہے کہ تم

میرے خاندان کے پروردہ ہو۔ یہ سلسلہ قدوسیہ کس کا ہے؟ یہ سنتے ہی مولانا عبدالغنی صاحب معذرت کرنے لگے اور کہا کہ نہیں شاہ صاحب یہ بات نہیں ہے، ہمارے پاس جو کچھ ہے، آپ ہی کے بزرگوں کا عطیہ ہے۔ ایک مرتبہ بتایا کہ میں ایک دن لکھنؤ میں تھا، معلوم ہوا کہ فرنگی محل میں عرس ہورہا ہے، میں بھی چلا گیا اور مجلس میں ایک کنارے خاموشی سے بیٹھ گیا، کچھ دیر بعد جب لوگوں نے مجھے دیکھا تو زبردستی اٹھا کر اپنے پاس بٹھایا اور نذرانہ پیش کیا، میں نے قبول کرنے سے انکار کیا، مگر اصرار کر کے کہا کہ یہ ہمارے بزرگوں کا معمول ہے، آپ کو لینا ہوگا۔ ہمارا خاندان آپ کے خاندان کا خادم ہے، آپ ہمارے مخدوم ہیں۔ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اگر شاہ صاحب سجادہ نشینی اور مشیخت کی زندگی بسر کرنے پر اتر آتے تو ان کو کیا مقام و مرتبہ حاصل ہوتا،؟ مگر یہ ان کی بے نفسی تھی کہ خود دوسرے کے در پر جا کر گھر کی دولت حاصل کی۔

اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحب کو کروٹ کروٹ اپنے رحمتوں سے نوازے، بہت خوب آدمی تھے۔ میں نے اس مضمون میں شاہ صاحب سے اپنے ذاتی تعلقات و تاثرات بیان کئے ہیں اور دیدہ و دانستہ اسے ان میں محصور کیا ہے۔

(البلاغ اپریل ۱۹۷۵ء)

ڈاکٹر سید محمود صاحب

۲۸؍ستمبر ۱۹۷۱ء

افسوس کی ۲۸؍ستمبر ۱۹۷۱ء کو ڈاکٹر سید محمود نے ۸۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ مرحوم ہندوستان کی تحریک آزادی کے مرد مجاہد تھے، ساتھ ہی سچے پکے مسلمان اور اسلامی ذہن و مزاج اور اسلامی تہذیب کے حامل تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بہت کچھ کیا اور بہت کچھ کرنا چاہتے تھے، آخر میں اسی مقصد کے لئے انھوں نے مجلس مشاورت کی سرپرستی قبول فرمائی تھی، ساتھ ہی انکا مزاج علمی تھا وہ مورخ و ادیب اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے صدر تھے، علمی و دینی رجال اور اداروں سے خاص تعلق رکھتے تھے، اہم سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہ چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور مسلمانوں کو ان کا نعم البدل دے۔

(البلاغ ممبئی)

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب

۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۵ء

افسوس کہ ایک ماہ کے اندر ہندوستان کے دوز بردست عالم و بزرگ اور ساتھی نے انتقال کیا، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ۱۶/ شوال ۱۳۹۵ھ ۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۵ء بروز چہار شنبہ دہلی میں اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی نومبر ۱۹۷۵ء کے آخر میں اپنے وطن سنبھل میں فوت ہوئے۔ رحمھما اللہ رحمۃً واسعۃً وغفر لہما، دونوں حضرات راقم کے حدیث کے استاد تھے، اور دونوں ہی بزرگ جمعیۃ علماء ہند کے بنیادی اراکین، جامعہ قاسمیہ مراد آباد کے مدرس اور ملکی وقومی رہنما تھے، اور متعدد بار اس راہ میں قید و بند سے دوچار ہوئے۔

مولانا سید محمد میاں صاحب اپنے علم وفضل، اخلاص وایثار اور خدمت میں سلف صالحین کی سچی یادگار تھے، نام ونمود اور شہرت سے کوسوں دور رہ کر علمی، دینی، سیاسی اور مختلف قسم کی خدمات انجام دیں۔ زندگی بھر درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور علم وآگہی میں لگے رہے۔ ایک زمانہ تک جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں حدیث اور عربی ادب کے مدرس رہے۔ آخر میں جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم، اس کے بعد مدرسہ امینیہ دہلی کے صدر مدرس اور مفتی ہوئے، اسی حال میں وصال فرمایا اور ہر دور میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا، حتی کہ آخر دنوں میں بھی دو تین کتابیں زیرِ تصنیف تھیں، ان کی تصانیف میں ''علمائے ہند کا شاندار ماضی''، ''علمائے حق''، ''سیرت رسول''، ''تاریخِ اسلام'' اور دینی تعلیم کے رسالے بہت مشہور ہیں۔ راقم کے حال پر بے حد مہربان تھے اور میری ہر کتاب پر تشجیع فرماتے تھے، آخری ملاقات ۲۹/ شعبان ۱۳۹۵ھ کو ان کے مکان پر ہوئی، میں نے اپنی نئی کتاب '' خلافت امویہ اور ہندوستان'' پیش کی تو مولانا نے اپنی جدید کتاب ''تحریک شیخ الہند'' عنایت فرمائی۔ اس وقت بھی بے حد کمزور اور چلنے پھرنے سے تقریباً معذور تھے، میں نے عرض کیا کہ مولانا کیا اس

عالم میں تصنیف وتالیف کا کچھ سلسلہ جاری ہے؟ فرمایاہاں تین کتابیں زیرِ کتابت ہیں۔خلوص وایثار، بے نفسی، خیر خواہی اور بے لوث خدمت میں مولانا اپنے مثال آپ تھے، انتقال کے وقت ۷۲ رسال کی عمر تھی، اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل سنبھلی

نومبر ۱۹۷۵ء

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی بہترین مدرس ومعلم اور بہترین مقرر تھے، ایک زمانہ میں ان کے وعظ وتقریر کی دھوم تھی اور ہندوستان کے بڑے دینی اور سیاسی جلسوں میں ان کے وعظ وتقریر سے گرمی پیدا ہوتی تھی۔ بڑے خوش پوش تھے،طبیعت میں نفاست ونزاکت تھی، درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔مقامات تصوف اور اسرارالتنزیل کے علاوہ ان کی بعض اورتصانیف ہیں۔زندگی کا زیادہ حصہ مدرسہ شاہی مرادآباد کی مدرسی میں گزارا، آخر میں گجرات اور بنارس کے مدارس میں درس حدیث دیتے رہے۔طلبہ کے ساتھ محبت وشفقت کا برتاؤ کرتے تھے،ایک زمانہ میں یوپی اسمبلی کے ایم،ایل،اے بھی رہ چکے تھے، ان کی مجلس بڑی پُر بہار اور بارونق ہوا کرتی تھی، صحیح مسلم کے خصوصی مدرس تھے، کتاب الایمان کی درسی تقریر طلبہ میں بہت مشہور تھی، آخری دور میں مقامات تصوف کی طباعت کے سلسلے میں بمبئی تشریف لائے تھے تو ہفتوں ملاقاتیں رہیں۔ بڑی شفقت ومحبت کا معاملہ فرمایا۔ بلکہ اپنے ایک ادنیٰ شاگرد سے اس کتاب پر مقدمہ لکھوایا، اس سے ہمارے بزرگوں کی بے نفسی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ان کی عمر بھی ۷۰ یا ۷۲ سال کی رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت ومغفرت سے ان کو نوازے، اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

ہماری بزم کے ان چراغوں کے اٹھ جانے سے جو اندھیرا ہوگیا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے اُجالے کی صورت پیدا فرمائے۔ (البلاغ دسمبر ۱۹۷۵ء)

حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن۔شاہ جہاں پوریؒ

۲۹/اپریل ۱۹۷۶ء

افسوس کہ ۲۹/ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ مطابق ۲۹/اپریل ۱۹۷۶ء کو بزم علم وفضل کی ایک اور شمع بجھ گئی اور حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوری وطن میں ۹۶/سال کی عمر میں وصال فرمایا، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً حضرت مفتی صاحب کی پوری زندگی درس وافتاء اور تصنیف وتالیف میں گزری، انہوں نے تقریباً بیس سال تک گجرات میں رہ کر افتاء کی خدمت انجام دی، پھر دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی ہوئے، ادھر کئی سال تک اس عہدہ پر رہ کر سن رسیدی اور ضعف کی وجہ سے وطن میں زندگی بسر کر رہے تھے، ان کے علم وفضل کا شہرہ ہم نے زمانہ طالب علمی میں سنا تھا، پھر قیام جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے زمانہ میں ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی علمی مجلس سے بارہا مستفیض ہونے کا موقع ملا، وہ فقہ وحدیث کے مشاہیر علماء میں سے تھے، ان دونوں میں ان کی دقتِ نظر، وسعتِ معلومات تبحر کے درجہ تک تھی، ان تصانیف میں امام محمدؒ کی کتاب ''الحجۃ علی اہل المدینۃ'' کی شرح چار جلدوں میں لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد سے نہایت شان دار طباعت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، اسی طرح امام محمدؒ کی کتاب الآثار کی شرح قلائد الازہار بھی دو جلدوں میں چھپ کر اہلِ علم کے ہاتھوں میں پہونچ چکی ہے، آخر میں السیف المجلی علی المحلی تصنیف کی، جس کے چند اجزاء شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ساری تصانیف عربی زبان میں ہیں، جو ان کے فقہ وحدیث میں تبحر پر شاہد عدل ہیں۔ وہ اردو شاعری کا نہایت ستھرا ذوق بھی رکھتے تھے، اخلاق نہایت کریمانہ اور محبت وشفقت کے پیکر تھے، آخری عمر میں عوارض وامراض کا بے پناہ ہجوم رہتا تھا، مگر اس حال میں بھی علم حاضر اور قلم جاری تھا، وہ اپنی علمی وفنی خصوصیات میں ہندوستان کے چند گنے چنے علماء میں سے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ (البلاغ جولائی ۱۹۷۶ء)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی

۱۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء

برصغیر ہندو پاک کے مشہور عالم دین، مفسر قرآن، مفتیِ اعظم، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے ۱۲ شوال ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو کراچی میں انتقال فرمایا، رحمۃ اللہ علیہ ان کی عمر اسی سال سے اوپر ہی رہی ہوگی، تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے، اس سے پہلے پوری زندگی دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور افتاء میں بسر کی، ان کے تلامذہ اور تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے، وہ علم وروحانیت کے جامع اور دینی معاملات میں مسلمہ شخصیت تھے، حکومت پاکستان کے خاص علمی ودینی معتمد ومشیر اور ریڈیو پاکستان کے مفسر تھے، ان کی تفسیر ''معارف القرآن'' کے نام سے چھپ چکی ہے، کراچی میں بہت بڑا دینی مدرسہ قائم کیا، جو پوری افادیت کے ساتھ جاری ہے، ان کی سرپرستی میں ماہ نامہ ''البلاغ'' کراچی سے نہایت آب وتاب اور افادیت کے ساتھ اعلی معیار پر جاری ہے، وہ علمائے دیوبند کے ان حضرات میں سے تھے جن کے علم وفضل کی عظمت ہر طرح مسلم تھی، حضرت تھانویؒ کے خاص مسترشدین اور معتمدین میں سے تھے، ان کی وفات برصغیر کا زبردست دینی وعلمی نقصان ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، اور ہم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

(انقلاب بمبئی)

مولانا محمد اویس نگرامی

۲۷/اگست ۱۹۷۶ء

افسوس کہ ۳۰/شعبان ۱۳۹۶ھ ۲۷/اگست ۱۹۷۶ء کو جناب مولانا محمد اویس صاحب ندوی شیخ التفسیر ندوۃ العلماء لکھنؤ نے انتقال کیا، رحمہ اللہ تعالیٰ وغفرلہ، مولانا مرحوم ہندوستان کے مشاہیر اہل علم میں سے تھے، تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور ارشاد وتلقین میں پوری زندگی بسر کی، ندوہ سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند اور دارالمصنفین اعظم گڑھ میں رہے، اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ التفسیر کی حیثیت سے پوری زندگی بسر کی، قرآن حکیم سے خاص شغف تھا، ان کی مجلس علمی اور دینی اور بڑی دلچسپ ہوتی تھی، باغ وبہار طبیعت رکھتے تھے، جب بمبئی تشریف لاتے تو ان کی مجلس میں حاضری کا موقع ملتا تھا، اپنی آمد کی اطلاع کراتے اور مطالعہ کے لیے اپنے ذوق کی کتابوں کا مطالعہ فرماتے، اس زمانہ کی مولانا کی علمی مجلسیں میرے لیے بڑی دلچسپ اور یادگار تھیں، ان کا خاندان علمی اور دینی تھا، خوشی کی بات ہے کہ اولاد میں یہ ذوق باقی ہے، تصنیف وتالیف کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے، اس لئے عوامی شہرت ونا موری سے دور رہ کر اہل علم میں مقبول رہے، اللہ ان کو اپنے مقبولین بارگاہ میں شامل کر کے جوار رحمت میں جگہ دے، اور ہم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

(البلاغ ستمبر ۱۹۷۶ء)

مولانا محمد سعید صاحب راندیری

۶ / نومبر ۱۹۷۶ء

گجرات کے مشہور عالم اور جامعہ حسینیہ راندیر کے مہتمم مولانا محمد سعید بن مولانا ابراہیم راندیری نے ۶ / نومبر ۱۹۷۶ء کو ۶۹ سال کی عمر میں انتقال کیا رحمۃ اللہ علیہ، مرحوم کا خاندان پشتہا پشت سے دینی و علمی خدمت کرتا چلا آیا ہے، وہ نہایت نیک نفس عالم باعمل اور اونچے درجہ کے مدرس تھے، علم اور اہل علم سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، ایک مرتبہ راقم جامعہ حسینیہ راندیر میں حاضر ہوا تو بڑی شفقت و محبت اور اخلاص سے پیش آئے نئے نئے حج سے آئے تھے، مکہ مکرمہ کی تاریخ ''القریٰ لقاصدام القریٰ'' لائے تھے، میرے ذوق کی رعایت سے کتاب فوراً نکلوائی اور میں نے اس سے استفادہ کیا بعد میں یہ کتاب میرے پاس آ گئی ان کا علمی و روحانی تعلق علمائے دیوبند سے تھا۔ تحصیل و تکمیل کے بعد پوری زندگی درس و تدریس اور ابلاغ و تبلیغ میں بسر کی، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

مولانا محمد سلیم صاحب کیرانویؒ

۱۸؍جولائی ۱۹۷۷ء

افسوس کہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے ناظم مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مختصر علالت کے بعد ۲؍شعبان ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۸؍جولائی ۱۹۷۷ء کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کا وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر تھا۔ ان کا تعلق شیخ الاسلام مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی متوفی ۱۳۵۷ھ سے یہ تھا کہ ان کے بھتیجے محمد صدیق صاحب کے فرزند مولانا محمد سعید صاحب متوفی ۱۳۵۷ھ کے صاحب زادے تھے، مولانا محمد سلیم صاحب کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی اور مدرسہ صولتیہ میں تعلیم وتربیت ہوئی، یہ وہی مدسہ ہے، جسے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر مکی نے ۱۲۹۰ھ میں کلکتہ کی ایک مخیّر خاتون صولت النساء بیگم کی مدد سے جاری کیا تھا، جس پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی خاص نظر رہی۔ مولانا محمد سلیم صاحب ۱۳۴۶ھ میں اس کے نائب ناظم اور ۱۳۵۷ھ میں ناظم ہوئے اور نہایت عزم واستقلال کے ساتھ مدرسہ صولتیہ کا نظم ونسق سنبھالا۔

بڑے باغ وبہار عالم تھے۔ مجلسی زندگی رکھتے تھے، ترکی دور سلطنت اور سعودی سلطنت کے بارے میں معلومات کا خزانہ رکھتے تھے، سلاطین ترکیہ عثمانیہ کی حرمین شریفین سے والہانہ عقیدت کی داستانیں بڑی دلچسپی سے سناتے تھے، جب راقم دوسری بار ۱۳۸۵ھ میں حرمین شریفین میں حاضر ہوا تو ان سے متعدد ملاقاتیں رہیں، اور بڑی شفقت ومحبت سے پیش آئے، گھنٹوں حرمین شریفین کی تاریخی واقعات، ترکی سلطنت کے آخری ایام کی داستانیں اور سعودی سلطنت کی ابتدائی باتیں بیان کیں۔ جن میں بعض نہایت اہم اور راز دارانہ تھیں، راقم سے فرمایا کہ تم چند ماہ میرے ساتھ رہو تو میں انکو لکھوادوں۔ اب مجھ میں خود

لکھنے کی طاقت نہیں رہی، بلکہ میری ادارت میں ''ندائے حرم'' رسالہ کو بمبئی سے دوبارہ جاری کرنے کی خواہش ظاہر کی، حتی کہ دفتر خرید نے اور کام شروع کردینے پر آمادگی ظاہر کی۔

''ندائے حرم'' ایک زمانہ میں دہلی سے خود نکالتے تھے، اس کی ترتیب کا کام مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط کے ذمہ تھا، مولانا فارقلیط صاحب میرے قیام لاہور کے زمانہ میں مولانا کے واقعات بیان کیا کرتے تھے اور مجھ سے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کی سوانح لکھنے کی خواہش کی اور کہا کہ میں آپ کی مدد کروں گا، افسوس کہ ان کاموں میں کوئی کام نہ ہوسکا، اور مولانا دنیا سے چلے گئے، ان کے فرزند برادر محترم مولانا محمد شمیم صاحب ان کے جانشین ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور مولانا محمد شمیم صاحب کو ان کا صحیح جانشین بنائے، وہ چاق وچوبند اور باشعور عالم ہیں، ان سے بڑی توقعات ہیں۔

مولانا مرحوم جن گوناگوں صفات کے حامل تھے، ان سے وہ حضرات کما حقہ واقف ہیں، جن سے مولانا کا تعلق رہ چکا ہے، وہ اگر ایک طرف جید عالم تھے تو دوسری طرف اردو فارسی کے بہترین ادیب تھے، ان کی تحریریں اور مدرسہ سے متعلق سالانہ رپورٹیں اور مضامین اعلیٰ ادبی ذوق اور پختہ زبان دانی کا شاہکار ہوتی تھیں، ۱۳۶۴ھ میں مدرسہ صولتیہ کی نظامت کا بارِ عظیم سنبھالا اور پورے ۵۲/ باون سال نہایت ایثار وخلوص، عزم وہمت اور حکمت وتدبر کے ساتھ کعبہ کے زیر سایہ پاک وہند کی اس درس گاہ کو بام ترقی پر پہونچایا، جس کا سنگ بنیاد اب سے ۱۰۷/ سال قبل مجاہدِ اسلام حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ نے رکھا اور جس کو آٹھ سال تک شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانویؒ مہاجر مکی کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا، اس طرح بلاشک وشبہ مولانا محمد سلیم صاحب ان دونوں جامع شریعت وطریقت عظیم روحانی بزرگوں کے جانشین تھے اور حق ہے کہ انہوں نے مدرسہ صولتیہ کی خدمت کا حق ادا کردیا:

ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ان کے مرتب کردہ نصاب تعلیم کو بلاد عربیہ واسلامیہ کے تمام ماہرین اور تعلیم

اداروں نے خراجِ تحسین پیش کیا، ان کے بے پناہ خلوص وایثار کی بنا پر رب العزت کی تائید ونصرت ان کے اور مدرسہ کے شامل حال تھی کہ سخت سے سخت حالات میں کبھی انھوں نے مدرسہ کے وقار اور وجود پر آنچ نہیں آنے دی اور انتہائی صبر آزما حالات میں اپنی جان کو خطرات میں ڈال کر ہر نوع کے مصائب کا مقابلہ کیا، درد دل کے ان اشاروں کو وہی صاحبِ دل سمجھ سکتے ہیں، جو اس فتن ومصائب سے بھرپور زمانہ میں باطل طاقتوں کے مقابلہ میں علوم محمدیہ اور معارف اسلامیہ کے چراغ کی روشنی کو برقرار رکھنے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ مولانا کے عہدِ نظامت میں مدرسہ صولتیہ اگر ایک طرف عظیم تعلیمی تربیت گاہ تھا تو دوسری طرف حج کے زمانہ میں تمام عالمِ اسلامی سے آنے والے اور خاص طور پر پاک وہند کے حجاج کا بے حد اہم خدماتی مرکز، مولانا کی اور مدرسہ کی ان خدمات سے وہ تمام حجاج بخوبی واقف ہیں، جو سالہائے گذشتہ میں ان سے فائدہ اٹھا چکے ہیں، مولانا مرحوم کی پچاس سالہ خدمات کے تذکرہ کے لیے تو سیکڑوں صفحات درکار ہیں، ان کی زندگی کے اصل باقیات صالحات وہ ہزاروں طلبائے علم ہیں، جو ان کے دورِ نظامت میں اطرافِ عالم سے مدرسہ صولتیہ میں آکر مستفید یا فارغ التحصیل ہوئے اور مولانا کی سرپرستی ان کو حاصل رہی، قحط الرجال کے اس دور میں درحقیقت مولانا محمد سلیم کی وفات ایک عظیم سانحہ ہے، دلی دعا ہے کہ اللہ رب العزت حضرت مولانا کی قربانیوں اور ایثار وخلوص کو قبول فرما کر آخرت کے اعلیٰ مدارج سے نوازے اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کی زمانہ کے شرور وفتن سے حفاظت فرما کر اس کو اپنے تاریخی روایات کے ساتھ دائم وقائم رکھے، آمین۔

(البلاغ ستمبر ۱۹۷۷ء)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ

۱۹/ اکتوبر ۱۹۷۷ء

گذشتہ ماہ اسی کالم میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر جمیل آیا تھا، کیا معلوم تھا کہ اتنی جلد ان کا ماتم بھی کرنا پڑے گا، اور قلم ان کے مناقب ومحاسن میں متبسم تھا، وہ آج ان کے نوحہ وغم میں اشکبار ہو جائے گا۔

مرحوم ۳/ ذوالقعدہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۷/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو راولپنڈی کے ایک دینی اجتماع میں شریک ہوئے، وہیں دل کا دورہ پڑا اور ۲/ دو دن کے بعد واصل حق ہو گئے، نعش کراچی لائی گئی اور اپنے مدرسہ اسلامیہ نیوٹاؤن کے قریب دفن کیے گئے، اللہم اغفرلہ وارحمہ رحمۃً واسعۃً۔

وہ صحیح معنی میں حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین اور تلمیذ رشید تھے، یوں تو علامہ کشمیری کے حاملین وتلامذہ کی ایک جماعت کثیر ہے، جس میں نامی گرامی علماء وفضلاء اور اربابِ تصانیف ہیں مگر ان کے علوم کی جو جامعیت مولانا محمد یوسف صاحب بنّوری کی ذات گرامی میں تھی، وہ کسی میں نہیں تھی، وہ اپنے شیخ کے علوم وفنون کے حقیقی ترجمان تھے، اور آثار معارف شرحِ ترمذی کے ذریعہ خاص طور سے حضرت شاہ صاحب کے محدثانہ وفقیہانہ علوم ومعارف کو دنیائے اسلام میں عام کیا، مرحوم اپنی خصوصیت وجامعیت میں ہندوپاک کے علماء میں فردِ واحد اور یکتائے روزگار تھے، ان کے بعد ان کے ٹکرّ کا کوئی عالم ہندوپاک میں نہیں رہ گیا ہے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے زمانۂ قیام میں ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا، اس کے بعد میں متعدد ملاقاتیں بمبئی اور حرمین شریفین میں ہوئیں، اس سال خیال تھا کہ کراچی میں حاضر ہوکر ان سے نیاز حاصل کروں گا مگر افسوس کہ دل کی تمنا دل ہی میں رہ گئی اور وہ دنیا سے سدھار گئے۔ (البلاغ نومبر ۱۹۷۷ء)

والد ماجد میاں جی حاجی محمد حسن مبارکپوریؒ

۲۸/فروری ۱۹۷۸ء

یاایتها النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربک راضیة مرضیّة

آہ ثم آہ کہ ہمارے والد ماجد جناب محمد حسن صاحبؒ نے شبِ چہار شنبہ ۲۱/ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق ۲۸/فروری ۱۹۷۸ء کو وفات پائی، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور اس حادثہ فاجعہ کی خبر بیس دن کے بعد وطن سے کئی ہزار میل دور افریقہ میں ملی، اللّٰھم اغفر لہ ثم ارحمہ، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے والد مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے کر ہم کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ اللھم لاتحرمنا ولا تفتنا بعدہ، اس وقت دل ودماغ پر کیا گذر رہی ہے؟ بس مختصر یہ ہے کہ بس ہم اپنے والد کے فراق میں محزون وغمگین ہیں، اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں، ساتھ ہی یہ افسوس زندگی بھر رہے گا کہ تقریباً ۶۰/ساٹھ سال تک ان کے سایۂ رحمت وعاطفت میں رہنے کے باوجود آخری وقت ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکا، نہ ہی ان کی تجہیز وتکفین میں شرکت کی سعادت حاصل ہوسکی اور وہ بار بار یاد کرتے ہوئے دنیا سے گذر گئے۔

چند دن پہلے ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ گھر کے باہر والے کمرے کے مغربی شمال گوشہ میں ایک چھوٹا سا نہایت خوبصورت اور نہایت سفید چمکدار صندوق رکھا ہوا ہے جس کی چمک دمک عجیب قسم کی ہے، اس میں والد مرحوم کے جسم کے بعض اجزاء بحفاظت رکھے ہوئے ہیں اور اس کو بڑے اہتمام سے بند کیا گیا ہے، اس خواب سے ان کے بارے میں سخت تشویش تھی، بعد میں جب مکان سے تفصیلی خط آیا، جس میں ان کی بیماری، آپریشن، اور صحت کی خبر تھی، تو خیال ہوا کہ اس خواب کی یہی تعبیر ہے، مگر اب معلوم

ہوا کہ وہ والد مرحوم کا جنازہ تھا، والغیب عند اللہ اس کے بعد پھر ایک خواب پریشاں دیکھا جسے والد صاحبؒ کی بیماری میں اپنی پریشان خیالی پر محمول کیا۔

ویسے ماشاء اللہ پچاسی ۸۵/سال سے زائد مدت تک دنیا میں رہے، سرد وگرم حالات دیکھے، بیٹوں، پوتوں، پڑپوتوں کو پھلتا پھولتا دیکھا، اس پیرانہ سالی میں بھی صحت اچھی تھی، کھاتے پیتے چلتے، پھرتے تھے اپنے چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور سب کے بعد دنیا سے گئے۔ پوری زندگی رزقِ حلال اور نماز روزہ کی پابندی میں بسر کی، خاندانی روایت کے مطابق خدمتِ خلق، خاص طور سے اصلاح ذات البین کا مشغلہ جاری رکھا، آخری چند سالوں سے نوافل وتہجد اور اوراد وظائف سے غیر معمولی شغف پیدا ہوگیا تھا، اکثر مسجد میں رہا کرتے تھے، گھر کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ پر نظر رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کو دینی، علمی اور دنیاوی برکتوں سے نوازا ہے، جس پر بہت ہی مطمئن اور خوش رہتے تھے، ان کے بیٹوں اور پوتوں نے ان کی خوب خدمت کی، سب سے راضی وخوش رہ کر دنیا سے گئے، آخری وقت تک ہوش حواس بالکل بجا رہے اور حسن خاتمہ کے بہت سے آثار وعلائم مبشرات بن کر ظاہر ہوئے، خاص طور سے اس وقت والدہ ماجدہ حمیدہ بنت مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری متوفیہ سہ شنبہ ۲۲/ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ رحمہ اللہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کے ظہور نے پورے خاندان اور متعلقین کے رنج وغم کو مسرت اور خوشی سے بدل دیا اور اس سے سب کو بڑا ہی صبر وسکون حاصل ہوا، اور رنج وغم کے بارسے بیٹھا ہوا دل خوشی سے اچھل پڑا، انتقال سے تقریباً دو ماہ پہلے سلسل البول پھر حبس البول کا مرض ہوا۔ آپریشن کے بعد بظاہر صحت ہوگئی مگر انتقال سے دو دن پہلے یک بیک کمزوری بڑھنے لگی، والد مرحوم کے وصال اور اس وقت کے احوال ومبشرات کے سلسلے میں برادر عزیز قاضی حیات النبی نے لکھا ہے۔

والد صاحبؒ آپریشن کے بعد جامعہ اسپتال بنارس سے کامیابی کے ساتھ گھر آئے، کوئی شکایت نہیں تھی، خود کہتے تھے کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں بس اتنا ہو جائے کہ

مسجد میں آنے جانے لگوں تو اطمینان ہو جائے دو روز پہلے آواز میں کچھ فرق ہوا۔ تیسرے دن عصر کے وقت یک بیک طبیعت بدل گئی، اوپر کی طرف دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر کہا کہ آتے ہو تو آؤ، یہ بات تین مرتبہ کہی، اس کے بعد بار بار کہتے رہے کہ اب میری طبیعت بدل گئی ہے، تم سب لوگ ہر وقت موجود رہنا کہیں جانا مت، جب پوچھا جاتا کہ کوئی تکلیف ہے تو ہر مرتبہ یہی کہا کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے مگر پتہ نہیں چلتا کہ اب میں کہاں ہوں، شاید اب میرا وقت قریب آ گیا ہے، تم لوگ نہ گھبراؤ، مجھے بڑا اطمینان ہے اور میں تم سے خوش ہوں، تم سب نے میرے لیے بہت کچھ کیا، ہر وقت کلمۂ طیبہ اور اللہ اللہ کا ورد کیا کرتے تھے، دوسرے دن شام کو گھر کے ہر چھوٹے بڑے کو ایک ایک کر کے بلایا، روزہ نماز کی اور مل جل کر رہنے کی تاکید بار بار کی، خود دعا کی اور دعا کے لیے کہا، بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ اب تھوڑا وقت اور باقی ہے، اب دوا کی ضرورت نہیں ہے، اس طرح کہتے سنتے رات کے آٹھ بج گئے، اس کے بعد صرف پندرہ منٹ خاموش رہنے کے بعد ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے، آپ کو اتنا یاد کیا کہ ہم لوگوں پر اس کا گہرا اثر ہے، سلمان اور خالد کمال کو پوچھا کرتے تھے، دوسرے دن ظہر کے بعد غسل کے لئے نکالے گئے تو چہرہ ہشاش بشاش اور پورا بدن نہایت نرم تھا، معلوم ہوتا تھا کہ سوئے ہوئے ہیں۔ غسل دیتے وقت جسم کے ایک حصے میں معمولی خراش سے خون نکل آیا، نماز جنازہ میں بہت زیادہ آدمی تھے، لمبی لمبی تیرہ صف لگی تھی۔

ہاں والدہ محترمہ کی لاش مبارک والد صاحب کے پاؤں کی طرف پوربی حصہ میں سر کی طرف سے نکل آئی تھی اور پورا جسم جانب دکھن تھا۔ سر کے بال محفوظ، چہرہ موجود، پورا جسم کفن میں لپٹا ہوا، کفن میلا ہو گیا تھا، بغلی والی دیوار اپنی جگہ پر، دور تک کشادہ جگہ، بدن اور کفن پر مٹی کا نام نہیں، میں نے جھانک کر دیکھا تو قبر نہایت صاف شفاف تھی۔ کچھ لوگوں نے سر اور بال پکڑ کر دیکھا، خوب لمبے لمبے پورے بال شانوں پر لٹک رہے تھے، جسم درمیانی درجہ کا نرم تھا، اللہ اللہ تیری شان! والدہ محترمہ اسی کی حقدار تھیں، بے شمار ہجوم

ہوگیا تو تختہ رکھ کر بند کر دیا گیا۔ حالاں کہ میں جب والد صاحب کی قبر کی جگہ بتانے گیا تو گورکن کو بتادیا تھا کہ نیچے والدہ کی قبر ہے اس کے اوپر کھودنا، اس نے اسی طرح کھودا، مگر اللہ کو دوبارہ دکھلانا منظور تھا، والحمدللّٰہ علی ذٰلك۔

اور عزیز ظفر مسعود سلمہ نے لکھا ہے.......... یہ روح فرسا خبر بھی لکھنی پڑ رہی ہے کہ دادا صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے، انا للہ، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ جہاں یہ تھا وہیں ایک عجیب کرامت ظاہر ہوئی، جس سے تمام لوگوں نے ایک عجیب خوشی اور لذت محسوس کی، بس اس کو محسوس کیا جاسکتا ہے لکھا نہیں جاسکتا، یعنی ۴۵ سال کے بعد کل ہم لوگوں نے دادی مرحومہ کی میت کی زیارت کی۔ ہاتھ سے چھویا گیا اور تمام لوگوں نے بیک زبان کہا کہ یہ تمہاری دادی ہیں جو اس کی حقدار تھیں، خدا نے ان کو ان کی جگہ دی۔ واقعہ اس طرح ہے کہ جب دادا کی قبر کھودی جارہی تھی تو لوگوں نے کہا کہ یہاں ان کی قبر ہے جب بغلی کے قریب پہنچ گئی تو اس قبر کے دکھنی اور پوربی کونے پر کدال یک بیک اندر چلی گئی اور کدال ہٹائی تو وہاں آپ کا سر اور پوری میت مع کفن کے بالکل صحیح وسالم نظر آئی قبر کھودنے والا بھاگا گھر آیا، سب لوگ گئے، اندر جاکر دیکھا گیا چھویا گیا تو کفن تو لپٹا ہوا تھا جو میلا ہو گیا تھا، مگر معلوم ہوتا تھا کہ کپڑے میں کوئی لاش ابھی ابھی رکھی گئی ہے۔ اندر بالکل خلا تھا، جہاں تک نظر گئی ہر طرف سے ایک ایک بالشت مٹی کفن کو چھوڑے ہوئے ہے۔ اور اندر بالکل صاف ستھرا، ایک روئی مٹی کا نشان نہیں، یہی تازہ مٹی جو کھودنے میں گر گئی تھی، موجود تھی۔ جب سر پر ہاتھ رکھا تو لوگوں نے بتایا کہ بال کی ملائمیت تک باقی ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ تیل لگایا ہوا ہے، سر پر ذرا انگلی سے زور دیا تو بتایا کہ چمڑے کا احساس ہوتا ہے، پھر آگے بے حرمتی کے ڈر سے کچھ نہیں کیا گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اتنا سب ہوا مگر کسی کے ہاتھ میں مٹی کا غبار نہیں لگا، اور نہ ہی اتنے زمانہ کا کفن پھٹا، اتنے میں ہر طرف شور ہو گیا اور لوگ چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے، ہجوم کو روکنے

اور یہ سلسلہ بند کرنے کے لیے فوراً تختہ رکھ کر مٹی سے بند کر دیا گیا۔

دادا صاحب کی بیماری میں پورے خاندان نے زیادہ سے زیادہ خدمت کا خیال کیا، دادا صاحب بھی خوش و خرم گئے اور ہم لوگ بھی خوش کہ نہ ان کو کوئی تکلیف ہوئی، نہ ان کی کوئی خواہش باقی رہی۔ ایک گھنٹہ پہلے تمام چھوٹوں بڑوں کو بلایا، روزہ نماز کی تلقین اور میل و محبت سے رہنے کی تاکید کی، اور کہا کہ میں سب سے خوش ہوں، سب لوگوں نے میری اتنی خدمت کی کہ میں اس حال میں بھی کوئی تکلیف محسوس نہیں کر رہا ہوں، مجھے نہ کوئی خواہش ہے، نہ تمنا اب میرا وقت قریب ہے، میری طبیعت بدل گئی ہے اور مجھ کو دوسرے آثار معلوم ہو رہے ہیں، تم لوگ میری طرف سے کوئی فکر نہ کرنا، ادھر کئی روز سے آپ لوگوں کو بار بار پوچھا کرتے تھے، آخری دن جب سب لوگ ان کے قریب جمع ہو گئے تو کہا کہ سب لوگ آ گئے، کہا گیا کہ ہاں تو کہنے لگے کہ مولوی بھی آ گئے؟ کہا گیا کہ بس وہ آنے والے ہی ہیں؟ کہنے لگے کہ اچھا سب لوگ ہر جگہ اچھی طرح سے رہیں۔ بار بار یہی کہتے رہے کہ اب مجھے نہ کوئی خواہش ہے اور نہ کوئی تکلیف ہے مگر اب معاملہ بدل چکا ہے، بات چیت ہوش و حواس میں کرتے تھے اور سب کو پہچانتے تھے، ہم لوگوں نے نہایت صبر و شکر کے کے ساتھ اللہ کی امانت اس کے حوالہ کر دی، جنازہ میں بیشمار آدمی تھے۔

مذکورہ بالا احوال احادیث صحیحہ کی رو سے خاتمہ بالخیر کی بشارت اور علامت ہیں، آخر وقت میں سکون و اطمینان، ہوش و حواس کی برقراری، استغفار اور کلمہ طیبہ کے ساتھ اللہ کے نام کا ورد چہرے بشرے کی بشاشت، نماز روزہ کی بار بار تلقین اور عین اسی وقت والدہ مرحومہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا ظہور یہ سب باتیں نفس مطمئنہ کی علامت اور خاتمہ بالخیر کی علامت ہیں۔ والحمدللہ۔ (البلاغ مئی ۱۹۷۸ء)

ماہر القادری

مئی ۱۹۷۸ء

کراچی میں جناب ماہر القادری صاحبؒ مدیر فاران ہمارے خاص ملنے والوں میں تھے، کوشش کے باوجود ان سے ملاقات نہ ہوسکی، لاہور آنے پر معلوم ہوا کہ جناب احسان دانش صاحب اور وہ جدہ مشاعرہ میں جا چکے ہیں، وطن آنے پر اخبارات سے معلوم ہوا کہ جناب ماہر القادری صاحب جدہ میں واصل بحق ہوگئے اور حرم محترم میں ان کی نماز جنازہ ہوئی اور جنت المعلی میں سپرد خاک کئے گئے رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

مرحوم ماہر القادری اردو ادب کے مستند شاعر و ادیب تھے یہی نہیں تھے بلکہ وہ اپنے دینی اور علمی ذہن و مزاج کے اعتبار سے بڑے مسلمان آدمی تھے۔ اپنے رسالہ ''فاران'' کے ذریعہ انھوں نے شعر و ادب کے ساتھ دین کی خوب خدمت کی ان کے نعتیہ کلام سے ان کے عشق رسول اور قلبی سوز و گداز کا پتہ چلتا تھا، ان کا حسن خاتمہ بھی اسی کی دلیل ہے۔

افسوس کی کراچی پہونچ کر بھی ان سے ملاقات نہ ہوسکی اور وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے ریاض رسول ﷺ کے اس بلبل کی روح کو ہر طرح سکون دے۔ آمین

(البلاغ مئی ۱۹۷۸ء)

مولانا محمد صاحب ادروی

۲۵/اپریل ۱۹۷۹ء

افسوس کہ ۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ مطابق ۲۵/اپریل ۱۹۷۹ء سہ شنبہ صبح نو بجے ہمارے ایک نہایت مخلص اور باغ و بہار دوست مولانا محمد صاحب ناظم مدرسہ دارالسلام ادری، ضلع اعظم گڑھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

آپ کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی، ۱۳۵۴ھ ادری کے دو طالب علم جو یک قالب دو جان تھے، مدرسہ احیاء العلوم میں داخل ہوئے اور اپنے حسن سیرت، حسن ذوق اور حسن کردار سے تھوڑے ہی دنوں میں طلبہ و اساتذہ میں بے حد مقبول ہو گئے، ایک یہی مولانا محمد صاحب تھے، ''دوسرے مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی تھے''، ان دونوں سے راقم کے تعلقات اسی زمانہ میں ذاتی حیثیت سے گزر کر گھریلو حیثیت کے ہو گئے تھے۔

مولانا محمد صاحب مرحوم میں انتظامی صلاحیت، معاملہ فہمی اور کام کی دھن کے ساتھ بذلہ سنجی، نکتہ آفرینی، اور شعر و سخن کا نہایت ستھرا ذوق تھا، انہوں نے مدرسہ دارالسلام کو اپنی زندگی کا مرکز بنا کر پوری زندگی قومی و ملی اور جماعتی کاموں میں گزاری، وہ واقعی اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، اور ان کی محفل میں جی لگتا تھا۔ دوستوں کی مجلس ان کی بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی سے باغ و بہار اور گل گلزار رہا کرتی تھی، ادھر پچھلے دنوں بیماری اور نقاہت کے باوجود مرحوم نے مدرسہ دارالسلام میں تعمیری کام زور و شور سے شروع کروا دیا تھا کہ اسی میں وقت موعود آپہونچا اور اپنے رب سے جا ملے، اللہ تعالیٰ ان کے ان دینی کاموں کی تکمیل کی صورت پیدا فرما دے، اور ان کی روح کو اعلیٰ علیین میں سکون بخشے آمین۔ (البلاغ مئی ۱۹۷۹ء)

مولانا حکیم محمد صابر ندویؒ مبارکپوری

۴؍ جون ۱۹۷۹ء

۴؍ جون ۱۹۷۹ء کو ہمارے قصبہ کے مشہور طبیب مولانا حکیم محمد صابر صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۸۲؍ سال کی عمر میں انتقال کیا، مولانا مرحوم نہایت متواضع وقانع اور بزرگ انسان تھے، پوری زندگی طبابت کے ذریعہ خدمتِ خلق میں صلہ وشہرت سے بے نیاز ہوکر بسر کی، فن طب میں مجتہدانہ حیثیت رکھتے تھے، ان کے شاگردوں میں کئی مشہور طبیب ہوئے۔ راقم کے ننہال اور مولانا مرحوم کے خاندان سے قدیم دینی وعلمی تعلقات تھے، راقم بھی عربی کی ابتدائی تعلیم ہی کے زمانہ سے ان کے یہاں جاکر استفادہ کرتا تھا۔ اور بڑی شفقت ومحبت سے ملتے تھے، یہ تعلق آخری وقت تک وضعداری کے طور پر جانبین سے قائم رہا اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، ان کے ساتھ مبارک پور سے فن طب بھی ختم ہوگیا اور اب یہاں کوئی قابلِ ذکر حکیم وطبیب نہیں رہا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (البلاغ جولائی ۱۹۷۹ء)

مولانا سید محمد الحسنی

۱۴؍ جون ۱۹۷۹ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے عربی ادب کے معلم عربی رسالہ ''البعث الاسلامی'' کے مدیر ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے صاحب زادے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے بھتیجے اور کئی عربی اردو کتابوں کے مصنف، مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ نے جوانی میں مختصر علالت کے بعد انتقال کیا۔ مرحوم نہایت ذی استعداد، باخلاق، مخلص اور خاموش عالم ومصنف تھے، عربی ادب میں خاص طور سے ہندوپاکستان میں اہم مقام رکھتے تھے، اور ان کے علمی وقلمی افادات سے عالمِ اسلام مستفید ہو رہا تھا، دینی وعلمی خدمات میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے دست راست تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور ان کا نعم البدل دے اور ان کے خاندان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازے۔ (البلاغ جولائی ۱۹۷۹ء)

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلویؒ

جون ۱۹۸۲ء

آہ ثم آہ کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوگیا، اورعلم وفضل، دین ودیانت تقویٰ، طہارت، خلوص وایثار، انسانیت وشرافت کا ایک ایسا روشن چراغ جو عرب وعجم بلکہ پوری دنیا میں ضوفشاں تھا، بجھ گیا، رحمہ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ وادخلہ فی الجنۃ

اس میں شک نہیں کہ حضرت شیخ الحدیث اس دور کے جامع المناقب عالم دین تھے، اور بلامبالغہ کروڑوں انسانوں کوان کی ذات سے بلاواسطہ یابالواسطہ دین ودیانت، زہد وتقویٰ کی دولت ملی، اورحضرت کی ذات سے بڑا فیض پہونچا، اس بارے میں موجودہ دور میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں تھا، حضرت مولانا حدیث وفقہ کے زبردست عالم ومصنف اور استاد، احسان وتصوف اور روحانیت کے روشن مینار اور اخلاق نبوی کا نمونہ اور پرتو تھے، علمی دنیا میں ان کی تصانیف میں اہم ترین تصنیف ''اوجز المسالک شرح موطا امام مالک'' یادگار رہے، اور تبلیغی نصاب کو جو قبولیت عامۃ المسلمین میں ہوئی، اس دور میں اس کی مثال مشکل ہے، ان کے علاوہ حضرت کی متعدد تصنیفی یادگاریں ہیں، ہزاروں شاگرد لاکھوں متبعین ان سے فیض یافتہ ہیں، اسلامی ہند خاص طور سے جہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے غمزدہ ہے، وہاں اس کو فخر ہے، اس دور میں ایک ایسا عالم دین اٹھا، جس نے پورے عالم اسلام کی دینی وروحانی رہنمائی فرمائی اور عمر طبعی سے زیادہ عمر پاکر دین کی خوب خوب خدمت کی، اللہ ورسول کے دربار میں ان کی مقبولیت کا سب سے بڑا نشان یہ ہے کہ مدینۃ الرسول ﷺ میں ان کی وفات

ہوئی، اور جنت البقیع میں دفن ہوئے، جہاں مرنے کی تمنا میں ہزاروں گئے، اور مدتوں وہاں رہے، مگر ان کی قسمت میں دیار پاک میں آسودہ خواب ہونا نہیں تھا، اور وہ اپنے دیار میں فوت ہوئے، ان کی بے پناہ مقبولیت، ان کے مقبول بارگاہ خداوندی کی دلیل ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو بندہ بندوں میں مقبول ومحبوب ہوتا ہے، وہ عنداللہ بھی مقبول ہوتا ہے، اور جس کا تذکرہ اچھے طور پر دنیا والے کرتے ہیں، آسمان والے بھی اس کو اچھے انداز میں یاد کرتے ہیں۔

حضرت اقدس مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، ان کے بعد ان کا کوئی جانشیں نہیں رہا، یہ ملت اسلامیہ کے لیے بڑا ابتلاء ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے فضل وکرم سے خیر بنا دے۔ (انقلاب بمبئی ۱۱ر جون ۱۹۸۲ء)

مولانا حکیم محمد یوسف نذیری

۲۳/ نومبر ۱۹۸۱ء

۲۵/ محرم ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۳/ نومبر ۱۹۸۱ء دوشنبہ کو بمبئی کے مشہور حکیم وطبیب جناب حکیم محمد یوسف نذیری رحمۃ اللہ علیہ نے انتقال کیا۔ اس حادثہ فاجعہ کی خبر مجھے مبارکپور میں ''انقلاب'' کے ذریعہ ہفتوں بعد ہوئی۔ میں ۲۸/ ذوالحجہ ۱۳۶۸ء کو بمبئی پہنچا تھا، اس کے چند ماہ کے بعد حکیم صاحب مرحوم سے جو علمی ودینی مراسم وتعلقات قائم ہوئے تو آخر تک نہایت اخلاص محبت اور وضعداری کے ساتھ قائم رہے۔ مرحوم نہایت ذی علم، خلیق، وضعدار اور اہل علم وفن کے قدردان تھے، وہ بمبئی کے ان چند اطباء وحکماء میں سے تھے جن کے نام سے وہاں طب یونانی کا بھرم قائم تھا، اپنے معاصر نامی گرامی اطباء میں وہ آخری فرد رہ گئے تھے، ان کے بعد اب اس صف کا کوئی حکیم وطبیب باقی نہیں رہ گیا ہے، لے دے کے نظر حکیم مختار احمد صاحب اصلاحی پر پڑتی ہے، جو بمبئی میں طب کو علم و فن کی حیثیت سے زندہ کیے ہوئے ہیں۔ حکیم نذیری صاحب متنور، صاحب علم، اور علم دوست وادب نواز بزرگ تھے۔ ان میں وہی علمی وفنی بے نیازی تھی جو اہل علم وفن کو روکھی پھیکی زندگی پر قانع بناتی ہے۔ انھوں نے اپنے فن ومزاج کا سودا نہیں کیا حالاں کہ بمبئی کے بازار میں بڑی بڑی شخصیتیں سستے داموں میں آسانی سے خرید لی جاتی ہیں۔

حکیم صاحب مرحوم سے جب بھی اور جہاں بھی ملاقات ہوئی کوئی نہ کوئی علمی گفتگو اور دینی بات ضرور آجاتی تھی، اور وہ اس میں حصہ لیتے تھے، مگر اس طرح کہ ان کا انداز استفادہ کا ہوتا تھا افادہ کا طرز نہیں ہوتا تھا۔ اپنے بڑوں میں احساس کی یہ لطافت بہت کم پائی جاتی ہے۔ الغرض حکیم صاحب اپنی ذات سے بہت خوب آدمی تھے۔ کمزوریوں سے کون خالی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اور ان کے ساتھ اپنے خاص فضل وکرم کا معاملہ کرے۔ آمین

(انقلاب ممبئی)

حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب بنارسی

۱۷؍جنوری ۱۹۸۶ء

افسوس صد افسوس کہ جناب مولانا محمد اسحاق صاحب بنارسی رحمۃ اللہ علیہ ۵؍جمادی الاولیٰ مطابق ۱۷؍جنوری ۱۹۸۶ء کو اپنے وطن بنارس میں انتقال کر گئے، اللھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ

مولانا محمد اسحاق بنارسی بزم علم وفضل کے آخری حلقہ نشینوں میں تھے، اور کم وبیش پچاس پچپن سال تک اپنے علم وفضل کی بزم سجائے رہے، وہ بنارس کے مشہور علمی ودینی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحبؒ بنارس کے مفتی اعظم اور امام جامع مسجد تھے، پوری زندگی تقویٰ، طہارت، درس وتدریس اور عبادت وریاضت کے ساتھ فقہ وفتویٰ میں بسر کی، ان کے چاروں صاحب زادے عالم وفاضل ہیں، جن میں مولانا محمد اسحاق صاحب سب سے بڑے تھے، اس خاندان نے علم دین کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا، بلکہ دینی خدمت کے ساتھ تجارت اور کاروبار کرتے رہے، اور نہایت خوش حال زندگی بسر کرتے رہے، مولانا محمد اسحاق صاحبؒ ہمارے مخلص ترین بزرگ دوستوں میں سے تھے، خوش اخلاق، خوش پوش، خوش خور اور خوش مذاق عالم تھے، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ظاہری حسن وجمال سے بھی نوازا تھا، ایک زمانہ میں ہندوستان کے مشہور واعظ ومقرر تھے، ان کی مجلس بڑی پرکشش اور دلچسپ ہوتی تھی، احباب نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، بچوں میں بچے اور بڑوں میں بڑے تھے، علمی گفتگو ہر مجلس میں کسی نہ کسی عنوان سے کیا کرتے تھے، ۱۹۵۱ء سے بمبئی میں بغرض تجارت تقریباً ۱۵؍سال مقیم رہے، اس زمانہ میں ان کا کاشانہ علماء ادباء، تجار، اہل سیاست کا مرکز بنا رہتا تھا، ایسے بااخلاق، متواضع اور ساتھ ہی خوددار تھے کہ کبھی ان صفات میں فرق نہیں آنے دیا، ان سے باقاعدہ ملاقات ۱۹۴۶ء میں لاہور میں ہوئی تھی، جب کہ راقم

مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم کی زیر نگرانی سہ روزہ زم زم میں کام کرتا تھا، اور مولانا محمد اسحاق صاحب حضرت دانش کے مکتبہ سے اپنی تصنیف ''حکمات اکابر'' چھپوا رہے تھے، مہینوں ساتھ قیام رہا، اس کے بعد جب بمبئی تشریف لائے، تو رات دن ساتھ رہتا تھا، آخری ملاقات انتقال سے آٹھ دس دن پہلے بنارس میں ان کے گھر پر ہوئی، بڑھاپے کے عوارض میں مبتلا تھے، پھر بھی علمی ودینی باتیں کرتے رہے، بلکہ امام سمعانی کی کتاب الانساب خریدنے اور پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا، جو ۱۳ر جلدوں میں حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، خاندانی روایت کے مطابق ان کے دونوں صاحب زادے مولوی جنید احمد اور مولوی عبدالباسط سلمہا بھی عالم فاضل ہیں، اور تجارتی کاروبار کے ساتھ ہر کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا محمد اسحاق صاحب کی بال بال مغفرت فرمائے، اوران کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، اوران کے پس ماندگان کو صبر جمیل اوران کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین

(انقلاب بمبئی ۱۵ فروری ۱۹۸۶ء)

مولوی مہیش پرشاد

ہمارے ملک کے علمی اورادبی حلقہ میں یہ خبر نہایت افسوس اورغم کے ساتھ سنی جائے گی کہ مولوی مہیش پرشاد ایک طویل علالت کے بعد الہ آباد میں انتقال کر گئے۔ ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ آخری مرتبہ بمبئی میں گذشتہ سال یوم اکبر کی صدارت کے سلسلہ میں تشریف لائے تھے، موصوف ہندو ہونے کے باوجود مولوی، عالم، فاضل وغیرہ مسلمانوں کی عربی، فارسی، اور دینی علوم کے امتحانات دے چکے تھے، اسلامی علوم پر اچھی خاصی نظر رکھتے تھے، ہندو یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے، ان کو غالب سے بڑا تعلق تھا۔ ''خطوط غالب'' کی پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے شائع کی۔

نہایت سادے اور ملنسار آدمی تھے، کھانے پہننے میں نہایت بے تکلف تھے، دل و دماغ پر علمی فضا اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ سیاسی الجھنوں میں پڑنے کی فرصت نہ ملی، حتیٰ کہ اخبارات تک نہیں پڑھتے تھے، پرتاپ گڈھ یا جون پور کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ یہ ملک کی علمی، فنی اورادبی ناقدری ہے کہ اتنے عالم وفاضل کے مرنے پر عشر وعشیر بھی نہ ہوسکا، جو ایک سیاسی لیڈر، سرمایہ پرست، سانپ اور فسادی منڈھ کے مرنے پر ہوتا ہے۔

اس قسم کی باتوں سے قوم کے مزاج کی بلندی یا پستی کا اندازہ ہوتا ہے اور فیصلہ کیا جاتا ہے کہ قوم میں کہاں تک صلاحیت ہے۔ (انقلاب ممبئی)

مولوی معین الدین صاحب اعظمی

۶؍رمضان

رمضان المبارک کے بابرکت ایام میں دوشنبہ کے مبارک دن میں سحر کی پاکیزہ گھڑی میں وطن سے بہت دور خاندان والوں دوستوں اور رشتہ داروں کے ایک جم غفیر کے ہوتے ہوئے سب سے بے نیاز ہوکر ہمارے مولوی معین الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ چھ رمضان المبارک کی سحر کو بمبئی کے ایک اسپتال میں انتقال فرماگئے ۔ رحمة الله عليه رحمةً واسعة

مدتوں سے جمیعۃ علماء کے دفتر کے انچارج تھے، گذشتہ سال فالج کا معمولی سا حملہ ہوا تھا، علاج ومعالجہ کے لیے اپنے وطن اعظم گڈھ تشریف لے گئے اور سالوں تک رہ کر کئی ماہ ہوئے پھر اپنی جگہ پر آگئے تھے کہ رمضان المبارک کے ایک دن پہلے پھر ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا، جو ایک ہفتہ بعد انتقال کا سبب بنا، فالج لگتے ہی سینٹ جارج اسپتال میں داخل کرادئے گئے، اس وقت سے آخر تک شاید دو چار لفظ بول سکے ہوں، یا کسی طرف دیکھ سکے ہوں، ہمارے مولوی معین الدین صاحب کوئی بہت بڑے جبہ و دستار والے مولانا نہیں تھے اور نہ سبحہ وسجادہ بردار عابد وزاہد تھے، مگر اپنے عمل کی وجہ سے دونوں ہی تھے، دفتر کی ملازمت کرتے ہوئے وہ ایک جھمیلے میں رہتے تھے مگر ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے کبھی اس ہنگامہ کو اپنایا نہیں بلکہ اپنے کو ملازمت تک متعلق رکھ کر ہمیشہ الگ رہے، زندگی بھر نماز پنج وقتہ باجماعت بمبئی میں اچھے اچھے عابدوں اورزاہدوں کے بس میں نہیں ہوسکتی، اگرچہ وہ یہاں کی زندگی میں مل کر رہے مگر یہ بات ہمارے مولوی معین الدین صاحب کی زندگی بھر ان کا امتیاز بنی رہی، قرآن حکیم کی تلاوت ان کے معمولات زندگی میں بڑی اہم تھی، یہ بھی ان کی بہت اہم بات تھی، مصلح

وقت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب خلیفہ حکیم الامت (مولانا اشرف علی تھانوی) سے نسبت رکھتے تھے، اور ذکر و شغل بھی رکھتے تھے، غرض کہ مرحوم بہت ہی نیک بڑے شریف اور نہایت اچھے آدمی تھے، وہ سب سے بے نیاز ہوکر گئے۔ اللھم اغفر له وارحمه.

انکساری و کسر نفسی ان کا خاص وصف تھا، وہ جیسے نیک تھے ایسے ہی نیک حال میں دنیا سے گئے، فالج ناگہانی بیماری سے حضرت کی موت ایک قسم کی شہادت کا درجہ رکھتی ہے، مسافرت اور غربت کی موت بھی شہادت کا درجہ رکھتی ہے، مسافرت اور غربت کی موت بھی شہادت کی ایک قسم ہے، رمضان شریف میں دوشنبہ کے دن سحر کے وقت ایسے حال میں جان نکلی کہ اسپتال میں کوئی ان کے آگے پیچھے نہیں تھا، اور اسپتال ہی سے جنازہ بھی قبرستان میں یوں پہنچا کہ بہت ہی کم لوگوں کو خبر ہوسکی، حالاں کہ ویسے ان کے سب لوگ ہی یہاں کے موجود تھے، جمعیۃ العلماء کے ارکان جن میں رہ کر انھوں نے زندگی بسر کی، دوست و احباب، خاندان کے لوگ مگر ان کی بے نیازی آخر تک یوں قائم رہی کہ بہت کم لوگوں کی ایک مٹھی مٹی کا احسان بھی لیا، یہ ان کے درجات کی بلندی کی علامت ہے، اور ان کے دوست، احباب اور متعلقین کی محرومی اور بدنصیبی ہے، وہ جیسے بے تکلف سیدھے سادے اور ہلکے پھلکے تھے وہ دنیا سے ایسے انداز میں تشریف لے گئے، انشاء اللہ ان کا معاملہ اللہ رحمٰن الرحیم کی جناب میں اسی طرح ہلکے پھلکے اندازوں میں ختم ہوگیا ہوگا، اور رحمت الٰہی ان کی سادگی، غریب الوطنی اور ارباب دنیا کی خودغرضی اور طوطا چشمی پہ قابل رحم منظر دیکھ کر اپنی آغوش میں لے لیا ہوگا۔

اللھم اغفر له وارحمه.

(انقلاب ممبئی)

مولانا مہر خاں شہاب مالیر کوٹلوی ؒ

افسوس کہ ۲۵؍فروری کی شب میں مولانا محمد مہر خاں صاحب شہاب مالیر کوٹلوی نے بمبئی میں انتقال کیا۔اس وقت ان کی عمر تقریباً ۸۵سال کی تھی۔اللھم اغفرله وارحمه

مولانا شہاب صاحب پنجاب کے شہر مالیر کوٹلہ (ٹپیالہ) کے رہنے والے تھے۔غالباً ۱۹۲۵ء سے بمبئی میں تعلیمی خدمات کے سلسلے میں آئے تو یہیں کے ہوکر رہ گئے،ان کی تعلیم کہاں ہوئی اورکس اساتذہ سے انھوں نے پڑھا؟ یہ معلوم نہیں،ان کوسب سے پہلے ہم نے طالب علمی کے زمانہ میں رسالہ''ادبی دنیا''لاہور سے جانا، ان کے ادبی مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔بمبئی میں آنے کے کچھ دنوں کے بعد ہی ان سے نیاز حاصل ہوا،اوران کی شفقت ومحبت نے بہت قریب کردیا، مولانا مرحوم یہاں کے علمی حلقہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے،علم وتحقیق اورمطالعہ کے عاشق تھے،پوری زندگی گویا طالب علمی میں بسر کی،لکھنے کا بھی اچھا ذوق تھا،اردو ادب سے خاص دلچسپی تھی،ان کے بہت سے علمی وتحقیقی مقالات ومضامین اونچے رسالوں میں شائع ہوتے تھے،بعض کتابیں بھی اسی نہج پر تصنیف کی ہیں،بمبئی سے بعض رسالے بھی جاری کیے،اخلاق ومروت،وضعداری اور رکھ رکھاؤ کے گویا مجسمہ تھے،وہ اپنی وضع قطع میں قدامت پسند تھے مگران کے افکار وخیالات میں وسعت اورجدت تھی اس لئے اہل علم کے قدیم وجدید دونوں طبقوں سے ان کے تعلقات تھے اوردونوں طبقہ ان کی علمیت اور وسعتِ معلومات کے معترف تھے،ہر طبقہ کے اہل علم سے ان کومحبت تھی،وہ نہایت فراخ دلی اورانشراح کے ساتھ بڑوں کی طرح چھوٹوں کے علمی کاموں کی قدر کرتے،ان کی خدمات کوسراہتے اور ہمت افزائی فرماتے،ہرقسم کے علمی اجتماعات میں شرکت ہوکرافادہ واستفادہ

کرتے، علمی اور اخلاقی اوصاف کے ساتھ ان کا سب سے بڑا وصف خودداری اور بے نیازی ہے، جو اس شہر مال و زر میں جنس نایاب کی حیثیت رکھتا ہے، دوسرے اہل علم کی طرح (راقم) سے بھی بڑی محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے تھے، بعض افکار و خیالات میں ان سے اختلاف رائے کے باوجود نہایت قدردانی فرماتے تھے، بعض اوقات کتابوں کے سلسلے میں بلا تکلف وقت بے وقت کمرے میں چلے آتے تھے، یہ بات بھی ان کے خاص اوصاف میں تھی کہ اختلاف رائے کو انھوں نے اخلاق و مروت اور تعلق کی راہ میں حائل نہیں سمجھا، معارف، برہان، صدق، البلاغ، انقلاب وغیرہ میں شائع ہونے والے میرے مضامین و مقالات کو بالاستیعاب اور بغور پڑھتے اور جب ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے ان کے بارے میں اظہار رائے کر کے خوب خوب ہمت افزائی کرتے، ہر صاحب علم کے ساتھ ان کا یہی معاملہ رہتا تھا، کچھ راقم کے ساتھ ہی یہ بات نہیں تھی۔ اس شہر میں مولانا شہاب صاحب اپنے طرز کے ایک ہی عالم تھے، نصف صدی سے زائد کی علمی ادبی شخصیتوں، اداروں اور تحریکوں سے ان کو تعلق تھا، اپنے عہد کی تاریخ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

(انقلاب ممبئی)

علامہ شیخ محبّ الدین الخطیب

افسوس کہ شوال کے آخر میں علامہ شیخ محبّ الدین الخطیب نے قاہرہ میں انتقال کیا رحمۃ اللہ علیہ مرحوم نصف صدی سے زائد عرصہ سے عرب ممالک بلکہ دنیائے اسلام کے ان علمائے کبار میں شمار ہوتے تھے، جو سیاست صحافت ارشاد ودعوت اور کتاب وسنت میں جامعیت رکھتے تھے، اور اپنی زندگی کے مختلف الانواع علمی اور دینی کارناموں سے ایک انجمن تھے، آپ نے اپنی علمی زندگی کی ابتدا مکہ مکرمہ میں ہاشمی سلطنت یعنی شریف کے دور میں شروع کی اور مکہ مکرمہ سے ایک اخبار ''القنلبہ جاری کیا، غالباً جزیرۃ العرب میں پہلا اخبار تھا پھر شام کے چند آدمیوں کو لے کر مکہ مکرمہ میں المبطعۃ السلفیۃ اور المکتبہ السّلفیہ قائم کیا، جہاں کتابیں چھپتی تھیں،

ادھر ایک مدت سے قاہرہ میں مستقل طور سے مقیم ومتوطن ہو گئے تھے، جہاں طباعت، انشاء وتحریر، تصنیف وتالیف تعلیق وتحشیہ اورنشر واشاعت کی خدمت انجام دیتے تھے، قاہرہ میں بھی ایک پریس مطبعۃ الفتح کے نام سے جاری کر کے الفتح نامی رسالہ جاری کیا تھا۔

(انقلاب بمبئی)

مولانا حافظ حکیم سید مشتاق احمد میرٹھی

اواخر جون میں مولانا حافظ حکیم سید مشتاق احمد صاحب میرٹھی نے انتقال کیا۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ملی وملکی تحریکات میں پیش پیش رہتے تھے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ ان سے بمبئی میں بارہا ملاقات ہوتی تھی۔ اور بڑے اخلاق ومحبت سے پیش آتے تھے۔ آخری ملاقات ندوہ میں ہوئی تھی جب کہ وہ ندوہ کے جشن میں آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب علمائے دین وملت کی مغفرت فرمائے اور ملت مسلمہ کو ان کا نعم البدل دے۔ آمین (انقلاب ممبئی)

حافظ محمد اسماعیل اعظمی

۶/مارچ ۱۹۶۰ء

مرحوم حافظ محمد اسماعیل صاحب ہمارے ضلع اعظم گڑھ کے ایک بزرگ تھے، جن کا انتقال ۶/مارچ کو شہر اعظم گڑھ میں ہوا، مرحوم اسلاف کی یادگار تھے اور ان کی پوری زندگی دینی امور میں بسر ہوئی، پرانی وضع کے بزرگوں کے صحیح نمونہ تھے، مرحوم کوئی زبردست عالم نہیں تھے، مگر اپنی زندگی میں کسی عالم سے کم کام نہیں کیے، اطراف و جوانب میں متعدد مکاتب و مدارس قائم کیے، مسجدیں بنوائیں، شاگرد بنائے اور حفاظ و قراء پیدا کیے، مدتوں برما میں رہے اور وہاں بھی علمی، تعلیمی، تبلیغی اور روحانی کام میں مشغول رہے، روحانی رشتہ حضرت میاں اصغر حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے رکھتے تھے، ان کے اندر تمام وہ خوبیاں تھیں، جو پرانے طرز کے بزرگوں میں ہوا کرتی تھیں، اس معاملہ میں وہ ''اپنی ذات سے اِک انجمن تھے'' اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کی راہ پر چلنے کی توفیق دے، ہماری قدیم اسلامی طرز کی محفلوں سے ان شمعوں کے بجھنے سے جو تاریکی آرہی ہے، ہمارا فرض ہے کہ اس کے ازالہ کے لیے کوشش کریں تاکہ ہمارے بزرگوں کی وفات ہمارے لیے ابتلاء کا باعث نہ بنے۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا محمد یوسف کوکن عمریؒ

۶/ اکتوبر کو مدراس کے مشہور عالم و محقق اور مصنف افضل العلماء مولانا حافظ محمد یوسف کوکن عمری رحمۃ اللہ علیہ نے انتقال کیا، مولانا مرحوم قدیم وجدید کے جامع و محقق تھے، کچھ دنوں دارالمصنفین اعظم گڈھ میں رہ کر مولانا سید سلیمان ندوی کی نگرانی میں امام ابن تیمیہ کی مفصل و محقق سوانح عمری تصنیف کی، جس کا ایک نسخہ راقم کو بھی ہدیہ میں دیا تھا، وہ دارالمصنفین کی علمی کمیٹی کے رکن تھے، ان سے بمبئی، مدراس اور اعظم گڈھ میں متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں، ایک بار مبارک پور میرے ساتھ تشریف لائے تھے، آخری ملاقات بمبئی میں ہوئی، جب کہ وہ اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ جو خود بھی عالمہ تھیں، حج کے لیے جا رہے تھے، اور تامل ناڈو مسافر خانہ میں قیام پذیر تھے، انھوں نے اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں، اور علاقہ مدراس کے علم و علماء پر اچھا خاصا ذخیرہ جمع کرایا تھا، افضل العلماء مولانا عبدالحق مدراسی اور افضل العلماء مولانا عبدالوہاب بخاری رحمہما اللہ کے بعد افضل العلماء مولانا حافظ محمد یوسف کوکن عمری علمی مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ مرحوم احمد بہاء الدین داورکر صاحب، پروفیسر اسماعیل کالج جوگیشوری کے مکان پر مولانا محمد یوسف کوکن عمری اور کئی جدید تعلیم یافتہ باہر کے موجود تھے راقم بھی تھا، بات پاکی اور ناپاکی پر ہو رہی تھی، ایک صاحب نے کہا کہ پانی کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے اور اس پر یک گونہ تعجب اور افسوس کا اظہار کیا، راقم نے کہا کہ آپ لوگ ریسرچ اسکالر ہیں، یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ علمائے اسلام نے دینی نقطۂ نظر سے پانی کے موضوع پر اپنی تحقیقات سے معلومات کا اتنا زبرست ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ اگر ان کو کتابی شکل میں جمع کیا جائے، تو اس ایک موضوع پر معلومات کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) تیار ہو سکتا ہے، دنیا کے کسی مذہب نے پانی پر اتنی معلومات جمع نہیں کی ہیں، علمائے اسلام کی ان علمی اور تحقیقی کاوشوں کی داد دینی چاہیئے اور ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا علمی ناشکری اور خیانت ہے، اور یہ بات کچھ اس انداز سے کہی گئی کہ ان حضرات نے اعتراف کر لیا غور کرنا چاہئے کہ علمائے اسلام نے دینی مسائل و معاملات میں کس قدر کد و کاوش کر کے ایک ایک مسئلہ پر کتاب و سنت کی روشنی میں تحقیق کی ہے کہ دوسرے مذاہب میں جس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ (انقلاب بمبئی)

حضرت حافظ محمد صدیق دھولیویؒ

افسوس کی ۱۷ر ربیع الثانی مطابق ۶ر نومبر کو الحاج محمد صدیق صاحب دھولیوی رحمۃ اللہ علیہ نے نوے سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، حافظ محمد صدیق صاحب کا آبائی وطن یوپی میں پرتاپ گڈھ تھا، مگر آپ کا پورا خاندان دھولیہ میں پروان چڑھا اور وہیں مقیم ہو گیا، حافظ صاحب مرحوم نہایت متقی، پرہیزگار، عابد، زاہد اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ اسی کے ساتھ محبت، بے تکلفی اور مجلسی زندگی میں یکتا تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ بہت سے اہل اللہ اپنے مقام و مرتبہ سے واقف نہیں ہوتے شاید ان ہی میں حافظ محمد صدیق صاحب بھی ہوں۔

راقم ۱۹۵۰ء میں بمبئی گیا۔ غالباً اسی سال دھولیہ کے ایک مشاعرہ کی صدارت میں پہلی بار وہاں جانا ہوا جو محمد علی لائبریری کی طرف سے تھا، میری قیام گاہ پر حافظ محمد صدیق صاحب اور حافظ عبدالقیوم صاحب دونوں حضرات ملاقات کے لیے آئے، یہ ان حضرات سے میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کے اور اہل دھولیہ کے خلوص و محبت کی بات ہے کہ اس کے بعد سے آج تک ان حضرات سے نہایت مخلصانہ تعلقات رہے ہیں، اور ان کی کشش سے بار بار دھولیہ آنا جانا ہوا کرتا ہے اور کئی کئی دن تک وہاں قیام رہتا ہے۔ حضرت حافظ صاحب روحانی بزرگ تھے، اصلاح نفس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، متعدد بار حج و زیارت کی دولت پائی۔ ایک مرتبہ بیت المقدس، مصر، شام، ترکی وغیرہ کا دینی سفر کیا۔ دھولیہ کے مدرسہ سراج العلوم کے بانیوں میں سے ہیں، آخر تک اس کی ترقی کے لیے کوشش کرتے رہے، آخری ملاقات حافظ صاحب سے گذشتہ رمضان میں ہوئی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کہ اب شاید دوبارہ ملاقات اس عالم میں نہ ہو۔ ماشاء اللہ حافظ صاحب نے اپنے آل و اولاد کو پھلتے پھولتے دیکھا، سب کے سب نیک و دیندار اور آسودہ حال ہیں۔ ان کی عنداللہ مقبولیت کی یہ علامت ہے کہ ان کے جنازہ میں تقریباً ۱۵ ہزار مسلمان شریک تھے۔ اور بہت سے لوگوں کو اس کی سعادت سے کوشش کے باوجود محرومی رہی، صاحبزادہ حافظ محمد عابد صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور مومن قبرستان چالیس گاؤں روڈ میں دفن کیے گئے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

(انقلاب)

مولانا محمد داؤد برہان پوری

یکم شوال ۱۳۷۸ھ

ماضی قریب میں برہان پور میں جو علماء تھے اور جن کے فیض سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا ان میں مولانا شیخ محمد داؤد صاحب بھی تھے۔ وہ مولانا حافظ فیض اللہ صاحب برہان پوری کے شاگرد رشید تھے۔ ان کے علم و فضل سے آج برہان پور میں دینی و علمی زندگی باقی ہے، مرحوم نے اپنی تمام عمر درس و تدریس میں بسر کی اور تقریباً اسی سال تک بلا معاوضہ علوم دین پھیلانے میں کوشاں رہے۔ آپ نے ایک سو دو سال کی عمر میں یکم شوال ۱۳۷۸ھ یعنی عید کے روز صبح کو اس دار فانی سے رحلت فرمایا۔ قبر شیخ پورہ میں ہے۔ آپ کے شاگردوں میں مولانا امانت اللہ اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا احمد اللہ صاحب مرحوم اور دوسرے اہل علم ہیں۔ مولانا داؤد صاحب نے بڑی عمر پائی تھی۔ آپ کا نسلی تعلق سرزمین اعظم گڈھ سے ہے اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتے تھے جو ایک سو سال کے متعلق تھی۔ انگریزی حکومت کا شباب اور پھر زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دنیا کے سرد و گرم سے اچھی طرح واقف تھے، وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے جن میں برہان پور کے اچھے اچھے افراد پروان چڑھے۔

برہان پور کے بعض احباب کے خطوط سے ان کے کچھ حالات معلوم ہوئے، ان کو ہمارے سفر نامہ میں مولانا داؤد صاحب کا ذکر نہ آنے پر حیرت نہیں کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ برہان پور کے بارے میں میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب اپنی معلومات اور مطالعہ کی بنا پر ہے۔

بیشک محترم ریاضی صاحب اور دوسرے حضرات نے وہاں کی تواریخ اور تعمیرات کے بارے میں بہت کچھ بتایا مگر بزرگوں اور علماء کے حالات کا حصہ اپنے مطالعہ یا معلومات سے متعلق ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگوں کے نام اور حالات بتائے گئے ہیں اور کچھ حضرات کو کسی وجہ سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ علمی اور تحقیقی کاموں میں مصلحت کام نہیں کرتی۔

(انقلاب ممبئی)

حضرت مولانا محمد تقی امینی صاحبؒ

افسوس کہ ہندوستان میں فقہِ اسلامی کے مشہور عالم ومصنف اور محقق مولانا محمد تقی امینی (رحمۃ اللہ علیہ) علی گڑھ میں انتقال کر گئے، وہ ملک کے ان باصلاحیت اور ذی استعداد علماء میں تھے، جنھوں نے اپنی ذاتی جدوجہد سے اپنا مقام پیدا کیا، سُبیحہ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، ابتداء میں ناگپور میں امامت وخطابت کی خدمت انجام دی، اور وہیں ''اسلام کا زرعی نظام'' کے نام سے زراعت وکاشت کاری کے موضوع پر ایک اہم کتاب تصنیف کی، اس کے بعد دارالعلوم معینیہ اجمیر میں تدریسی خدمت انجام دی، کچھ دنوں تحقیقات ونشریات اسلام میں بھی کام کیا، اور آخر میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سنی دینیات کے پروفیسر ہوئے، اور یہاں آکر ان کے جوہر کھلے، اسلامی فقہ ان کا خاص موضوع تھا، اور اس میں متعدد اور اہم کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے اکثر ندوۃ المصنفین دہلی اور پاکستان سے شائع ہوئیں، اور بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا، بہترین مقرر تھے، مزاج خالص دینی وعلمی تھا، بڑے چاق وچوبند آدمی تھے، خوداعتمادی کے ساتھ خوش اخلاقی میں ممتاز تھے، ان سے پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی، جب اپنے والد کے علاج کے سلسلہ میں تشریف لائے تھے، پھر مسلم یونیورسٹی کے ایک اسلامی سیمینار میں ان کے یہاں مہمانی کا شرف حاصل ہوا، اور تین دن تک دلچسپ مجلسیں رہیں، مولانا عامر عثمانی مرحوم اور وحیدالدین خاں ان ہی کے مہمان تھے، اور دونوں میں شدید قسم کے اختلافات تھے، خان صاحب کا جواب عامر عثمانی تجلی میں بڑے اہتمام سے اپنے خاص انداز میں دیا کرتے تھے، مولانا محمد تقی صاحب نے دونوں کو یکجا کر کے بڑی حکمت سے

دونوں دوستوں کا پاس ولحاظ رکھا، خان صاحب سے راقم کی تفصیلی ملاقات وہیں ہوئی، اور ان کی افتادِ طبع کا بخوبی اندازہ ہوا، مسلم یونیورسٹی کے طلبہ مولانا امینی کا بے حد احترام کرتے تھے، میں نے بعض طالب علموں سے پوچھا کہ آپ لوگ ایک مولوی کے اس قدر گرویدہ ہیں، انھوں نے بتایا کہ ہمارے اساتذہ میں مولانا سب سے زیادہ بے تکلف اور شفیق ہیں، طلبہ کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں، ان کی ہر قسم کی مدد کرتے ہیں، اپنے بچوں کی طرح پیار بھی کرتے ہیں، ان کی شفقت وخلوص سے ہم کو بہت فائدہ ہو رہا ہے، اسلامی فقہ پر ان کی متعدد وقیع اور مستند کتابیں ہیں، اور اس موضوع پر بہت سے مقالات ہیں، جدید مسائل پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، اور اس موضوع پر وہ ممتاز حیثیت رکھتے تھے، ادھر کئی سال سے بیمار رہا کرتے تھے، حتیٰ کہ وقت موعود آ گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

(انقلاب بمبئی)

حضرت مولانا محمد نقی دیوبندی

یہ خبر نہایت رنج وافسوس کے ساتھ سنی گئی کہ حضرت مولانا محمد نقی صاحب دیوبندی مدیر جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد رحمۃ اللہ علیہ اس ہفتہ وصال فرما گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا محمد نقی صاحب ہماری علمی ودینی محفل کے ایک ممتاز بزرگ فرد تھے،ان کی وضع قطع ،بولی بات ،چال ڈھال سب کچھ سے عالمانہ شان نمایاں ہوتی تھی ،وہ بڑے گھن گرج کے بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی شفیق اورمہربان آدمی تھے،پوری زندگی علمی اوردینی کاموں میں بسر فرمائی،تعلیم وتدریس ،افتاء،وعظ وتلقین اورلوگوں کی خیرخواہی کے کام ان کی زندگی کا مقصد رہے،زندگی کا بیشتر حصہ مالیگاؤں میں گذرا،اورخوب خوب کام کئے ، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت ، مدرسہ محمدیہ کولھا پور کے اہتمام کے بعد جامعہ قاسمیہ مرادآباد کے مہتمم ہوئے ،اوراسی عہدہ پر وفات پائی ،بگڑتے اور بننے میں بچوں کی طرح تھے، پڑھنے اور پڑھانے میں بزرگوں کی یادگار تھے،میل جول اور خاطرداری ان کے خاص اوصاف میں سے تھے،اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے،اور پسماندگان کوصبرجمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

یادگار زمانہ تھے یہ لوگ

سن رکھو کہ فسانہ تھے یہ لوگ

(انقلاب ممبئی)

حضرت نوح ناروی رح

۱۲/اکتوبر۱۹۶۲ء

ہماری بزم دوشیں کی کئی شمعیں بجھ چکی ہیں۔کیفی، حسرت، جگر، سائل اور شعرو ادب کے کئی اور چراغ گل ہو چکے ہیں ۔ اب اس محفل کی ایک اور شمع بجھ گئی جو بعض خصوصیات کی وجہ سے اپنی مثال آپ تھی ۔۱۲/اکتوبر ۱۹۶۲ء کو حضرت نوح ناروی کا انتقال ہوا۔اور حضرت داغ دہلوی رح کی آخری تابش بھی ختم ہوگئی۔حضرت نوح نے بڑی زندگی پائی اور آخر وقت تک شعروادب کی سرپرستی کی، مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے ان کی ادبی اور فنی خدمات کی قدر کی اور وظائف دیے۔حضرت نوح ناروی حقیقی معنوں میں جانشین داغ تھے۔ زبان واسلوب اور سلاست وروانی کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی میں اپنے استاذ کے سچے متبع تھے۔وضع قطع اور رہن سہن میں بھی اپنے دور کی یادگار تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ دہلی کی بساط شعرو ادب ان کے دم سے اب تک ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔مرحوم کا وطن نارہ ضلع الہ آباد تھا۔ وہیں انتقال بھی ہوا۔حامیان اردو کے لیے یہ حادثہ یوں عظیم ہے کہ مکتب داغ کا آخری استاذ اُٹھ گیا اور اب اس کے طالب علم اس جیسا استاذ نہ پاسکیں گے۔ رحمۃ اللہ علیہ

(انقلاب ممبئی ۱۸/اکتوبر۱۹۶۲ء)

مولانا نذیر احمد املوی مبارک پوریؒ

۳۰ر مئی ۱۹۶۵ء

افسوس کہ ۳۰ر مئی ۱۹۶۵ء کو تین بجے دن میں حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی املوی مبارک پوری نے اپنے وطن املومبارک پور میں انتقال فرمایا۔ اور اسی رات کو گیارہ بجے دفن کردیے گئے .رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ.

مولانا املوی کا انتقال ہندوستان کی دینی وعلمی دنیا کا ایک عظیم سانحہ اور جماعت اہل حدیث کا عظیم نقصان ہے۔

مولانا مرحوم کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ مدرسہ رحمانیہ دہلی کے فارغ تھے۔ علم اور عمل دونوں کے جامع تھے۔ درس وتدریس کے نیک مشغلہ کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف میں مشغول رہا کرتے تھے۔ حدیث کے مباحث پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ وہ جامعہ سلفیہ بنارس میں مدت سے حدیث وفقہ کا درس دیتے تھے، اور آج جب کہ اچھے مدرس کا قحط پڑ رہا ہے۔ مولانا بہترین مدرس اور معلم تھے، ان کے مقالات و مضامین اور تصانیف ان کی علمی ودینی تحقیق کے گواہ ہیں۔ یوں تو وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، مگر ان کی کتاب ''انوار المصابیح بجواب رکعات تراویح'' ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اور ان کی اسی کتاب کے استدلالات اگرچہ راقم کے مسلک کے خلاف ہیں مگر حق یہ ہے کہ ان میں وزن ہے۔ اور ان سے مولانا مرحوم کی دقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ مبارک پوری علما کی صف میں وہ ممتاز مقام کے مالک تھے۔ ادھر بہت دنوں سے شرف ملاقات کا موقع نہیں مل سکا

پہلے جب بھی ملاقات ہوتی تھی بڑی محبت وشفقت اور کھلے دل سے ملتے تھے۔مرحوم کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے: ان کے جنازہ میں بنارس سے لے کر مئو مبارک پور اور اطراف وجوانب کے بہت زیادہ مسلمان شریک ہوئے۔مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری محدث صاحب تحفۃ الاحوذی اور مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری کے بعد جنازہ میں یہ مقبولیت تیسرے درجہ پر تھی۔جو بجائے خود بندے کی مغفرت ومقبولیت کیؒ بڑی علامت ہے۔مولانا کے صاحبزادے عزیز گرامی مولوی ہلال احمد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ زیر تعلیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو صبر وشکر کی توفیق دے، نیز جملہ متعلقین ومتعلقات کو صبر جمیل کی توفیق دے۔اور مولانا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔حدیث شریف میں سل والوں کو بھی شہدا میں شمار فرمایا گیا ہے۔

مولانا مرحوم کو شکم کی مزمن اور تکلیف دہ بیماری کی شکایت تھی اور اسی بیماری میں فوت ہوئے، انشاءاللہ یہ موت ان کے حق میں شہادت ہوگی۔

(انقلاب ممبئی)

ملک نصر اللہ خاں عزیز

جولائی ۱۹۷۶ء

افسوس کہ جولائی ۱۹۷۶ء کے شروع میں ملک نصر اللہ خان عزیز نے لاہور میں انتقال فرمایا، وہ غیرہ منقسم ہندوستان کے مشہور اہلِ قلم اور صحافی تھے اور ان کی صحافت نے مسلمانوں کی سیاسی، فکری اور ذہنی رہنمائی کے لیے بڑا کام کیا ہے، وہ پکے مسلمان تھے۔ اور مسلمانوں کا درد رکھتے تھے، سب سے پہلے ان کا نام اخبار ''مدینہ'' بجنور میں مولانا محمد عثمان فارقلیط کے ساتھ مجلس ادارات میں دیکھا تھا اور جوانی کے ذوق ومزاج کے مطابق ان مضامین سے استفادہ کیا، پھر وہ یہاں سے لاہور گئے اور اخبار ''زمزم'' میں کام شروع کیا، جس میں مولانا فارقلیط بھی تھے، انتظامی امور میں اختلاف ہوا اور مولانا علی احمد صاحب لاہوری کے فیصلے پر وہ ''زمزم'' سے الگ ہوکر ''عبدالمجید'' سوہدروی کے اخبار مسلمان میں چلے گئے، یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ راقم فراغت حاصل کر چکا تھا اور اس کی شاعری شباب پر تھی، ''زمزم'' ''اور مسلمان'' دونوں میں میری نظمیں اور غزلیں چھپتی تھیں، بعد میں (نومبر ۱۹۴۴ء تا اگست ۱۹۴۷ء) لاہور جانا ہوا تو ملک نصر اللہ خاں عزیز اور مولانا فارقلیط صاحب سے تعلق پیدا ہوا، میں اکثر تنہا اور کبھی کبھی مولانا فارقلیط صاحب کے ساتھ ملک صاحب کے دفتر واقع تھانہ گوال منڈی میں چلا جاتا تھا۔ بڑے محبت وشفقت سے ملتے تھے اور میرے اشعار کی تحسین کرکے انہیں شائع کرتے تھے۔ بعد میں مسلمان کا نام ''کوثر'' رکھا، اس میں زمزم کی طرح غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے بعد ملک صاحب نے اخبار تسنیم جاری کیا اور تقسیم ملک کے بعد اخبار ایشیا، نکالا پوری زندگی صحافت میں گزاری۔ افسوس کہ پرانے چراغ جلدی جلدی بجھتے جارہے ہیں اور نئے چراغ جل رہے ہیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (البلاغ اگست ۱۹۷۶ء)

سید نور اللہ صاحب

مرحوم سید نور اللہ صاحب پرو وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ گزشتہ دنوں دہلی میں فوت ہوگئے، مرحوم علاقہ مدراس کے رہنے والے تھے، تعلیمی معاملات میں بہت بصیرت رکھتے تھے، ان کی ذاتی قابلیت نے ان کو بہت بلند مقام دیا تھا، وہ پہلے اسی شہر بمبئی میں بی. ٹی. کالج کے پروفیسر تھے، پھر تعلیمی کمیشن کے چیرمین بنائے گئے اور ترقی کر کے ایک تعلیمی امتحان کے بعد وہ سربراہ بنے، اس کے بعد ان کی مدت ملازمت و کارکردگی میں توسیع دی گئی، حتیٰ کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ان کو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ بلالیا اور وہیں اپنی تمام صلاحیتوں کو اجاگر کرنے لگے۔

سید نور اللہ اگر چہ شہرت و ناموری کی سطح پر نہیں آئے مگر انہوں نے بنیاد بن کر تعلیمی کاموں کو بہت آگے بڑھایا اور اس طرح وہ اپنے ملک و قوم کے سچے خادم تھے۔ افسوس کہ جب تعلیمی معیار بری طرح گر رہا ہے سید نور اللہ جیسا ماہر تعلیم ہم سے جدا ہو گیا ہے۔

(انقلاب ممبئی)

مولانا نورالدین بہاری

ہندی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا ایک اور مخلص ہیرو ۲۳؍ستمبر کو بھوپال میں اپنی زندگی کے دن پورے کر کے موت کی ابدی نیند سو گیا، اس سے ہماری مراد حضرت مولانا نورالدین صاحب بہاری نوراللہ مرقدہ ہیں، مولانا ایک غیور محنتی اور دین دار عالمِ دین اور زبردست سیاسی رہنما تھے، بہار کی محفل زہد و تصوف سے اٹھنے والا یہ عالم دین، مرد مجاہد اور سیاسی رہنما آخری دم تک اس مقام سے نہیں ہٹا جسے گھر اور خاندان کی صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ عملی زندگی کے اکثر حصے دہلی کی فضا میں گذارے، سامراجی طاقت کے مقابلہ میں ہر قسم کی سرد و گرم ہوا برداشت کی، اور قید و بند سے دوچار ہوئے کچھ دنوں سے سیاست سے عملاً برطرف ہو کر بھوپال کے ایک گاؤں میں خاموش زندگی بسر کرنے لگے تھے، ادھر چند دن ہوئے اعلان آیا تھا کہ آپ پھر مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقت دینے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔

مولانا نورالدین صاحب بہاری صاحب اور ہمارے استاذ مرحوم حضرت مولانا شکراللہ صاحب دارالعلوم دیوبند میں ہم سبق تھے، اس روحانی اور علمی تعلق کی بناپر مولانا مرحوم ہم خادموں سے بھی بڑی فراخ دلی اور شفقت سے ملتے تھے، اور اپنی علمی اور دینی زندگی کے اکثر واقعات سنایا کرتے تھے، جن میں ہم جیسے طالب علموں کے لیے بہت سی کام کی باتیں ہوتی تھیں، اگر مولانا مرحوم ہندوستان کی سیاست میں کھل کر آگے بڑھنا چاہتے تو وہ ملک کے مسلم رہنما ہوتے پھر بھی مرحوم مدتوں دہلی کانگریس کے صدر رہے، اور آل انڈیا کانگریس کے ممبر تھے، اور جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے، اور سب سے بڑھ کر وہ ایک مخلص اور بے لوث عالم دین اور ملک و قوم کے بہی خواہ تھے، زندگی بھر رزق حلال کے لیے تجارت یا کھیتی باڑی کی اور اپنی قوت بازو کے بل بوتے پر دوسروں سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔

(انقلاب بمبئی ۲۵؍ستمبر)

سید نجیب اشرف ندوی

افسوس کہ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ۵ر ستمبر کو انتقال کر گئے اور ادبی و تعلیمی حلقہ میں ایک اہم شخصیت کی کمی ہوگئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، انھوں نے کہنا چاہئے کہ اپنی زندگی اسماعیل یوسف کالج بمبئی کی پروفیسری میں بسر کی، اس سے پہلے وہ چند سالوں تک دارالمصنفین اعظم گڈھ میں رہے، اور وہیں مقدمہ رقعاتِ عالم گیری وغیرہ کی تدوین کی، پھر کچھ دنوں دوسرے تعلیمی اداروں میں رہے، اسماعیل یوسف کالج سے علیحدہ ہونے کے بعد انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور اس کے تماہی رسالہ ''نوائے ادب'' کے اڈیٹر تھے، نیز کئی یونیورسٹی کے ممتحن تھے۔

اگر چہ وہ پرانے دور کی یادگار تھے، مگر خود انہوں نے اپنے کو نیا رکھا۔ علم اور اہل علم کے قدرداں تھے، طبیعت کی شگفتگی چند سالوں پہلے تک ہر محفل میں نمایاں رہا کرتی تھی، اردو ادب کے ادیب، عربی کے عالم اور انگریزی کے ماہر تھے، بہار کے مشہور علمی خاندان ''اہل دیسنہ'' کے ایک ممتاز فرد تھے، ادھر پچھلے سالوں سے ان کی صحت بہت گر گئی تھی، ضعیفی میں کئی اور اہم حوادث نے ان کو اور بھی بوڑھا کر دیا تھا، افسوس کہ سب کچھ ہوتے ہوئے انہوں سے بڑھاپے کا آرام بالکل نہیں پایا، اللہ تعالیٰ ان کی روح کو سکون واطمینان دے، اور ان کی مغفرت فرمائے۔

(انقلاب بمبئی)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ اعظمی

۲۵/نومبر ۱۹۶۷ء

برصغیر ہندو پاکستان کے علمی، دینی اور روحانی حلقوں میں یہ خبر بڑے درد و کرب کے ساتھ سنی گئی کہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ ۲۲/شعبان ۱۳۸۷ھ کی رات میں مظفری جہاز پر مکہ مکرمہ جاتے ہوئے وصال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا وصی اللہ صاحب مشترک ہندوستان کی وہ دینی اور روحانی دولت بے بہا تھے، جس کا بدل کہیں نظر نہیں آتا۔ رشد و ہدایت، ارشاد و تلقین، تزکیہ قلب و روح اور صفائی باطن کی روشنی آپ کے دم سے ہر طرف عام تھی۔ آپ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے روحانی فیوض و برکات کے حامل تھے، پوری زندگی زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں بسر کی۔

آپ تال نرجا فتح پور تحصیل گھوسی ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، آپ کے آباء واجداد اسلام کی دولت سے سرفراز ہوئے۔ آپ نے علوم دینیہ کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں فرمائی تھی، بچپن سے نیک طبع تھے، طالب علمی کے ایام بھی زہد و تقویٰ کا غلبہ تھا، آپ کے استاد مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ بلیاوی نے آپ کو حضرت تھانویؒ سے منسلک کر دیا، اور فراغت کے بعد ایک مدت تک حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خانقاہ میں رہے، یہ وہ زمانہ تھا، جب مولانا تھانویؒ نے جامع العلوم کان پور سے علیحدہ ہو کر خانقاہ تھانہ بھون کو اپنا مسکن بنا لیا تھا، اس مدت میں حضرت تھانویؒ کی بہت سی تصنیفات کی تبییض بھی کی۔

تھانہ بھون میں رہ کر مولانا وصی اللہ صاحبؒ نے معرفت و روحانیت کے منازل طے کیے اور تصوف و سلوک کے اونچے مرتبہ کو پہونچے، حضرت تھانویؒ نے ان کو خلافت عطا فرمائی، اس کے بعد آپ نے مبارک پور میں مدرسہ احیاء العلوم میں درس و تدریس

قبول فرمائی، اس وقت راقم کی عمر پانچ چھ سال کی رہی ہوگی، میں اپنے ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم کے ساتھ قاعدہ بغدادی لے کر مدرسہ جاتا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بزرگ دبلے پتلے سفید کرتا پائجامہ اور سفید دو پلی ٹوپی پہنے ہوئے مسجد کے اندر ٹہلا کرتے تھے، یہی بزرگ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ احیاء العلوم کی پرانی موجودہ عمارت تیار ہو چکی تھی، مولانا حکیم الٰہی بخش صاحب ناظم تھے اور مولانا شکر اللہ صاحب دار العلوم دیوبند سے نئے نئے پڑھ کر آئے تھے، اس زمانہ کے ان تلامذوں میں میرے ماموں مولانا محمد یحییٰؒ، مولانا عبد الحکیم صاحب جین پوری، مولانا محمد حسن مبارک پوریؒ وغیرہ تھے، اس کے بعد کچھ دنوں مدرسہ اشرف العلوم کان پور میں رہے۔ کچھ دنوں کے بعد اپنے پیر و مرشد کی طرح اپنے وطن فتح پور میں مستقل رہنے لگے اور خانقاہ آباد کر کے مدتوں خلق اللہ کی ہدایت کرتے رہے۔ اس زمانہ میں اطراف وجوانب کے علاوہ دور دور سے متوسلین و مریدین آتے اور آپ سے فیض پاتے، اس کے بعد آپ نے گورکھپور، کوپا گنج اور مئو میں رہ کر فیض رسانی کی، آخر میں الہ آباد چلے آئے اور کئی سال سے یہیں مستقل رہ کر خانقاہ آباد کی، الہ آباد کے بعد رشد و ہدایت کے لیے آپ نے بمبئی کا قصد فرمایا، پچھلے دو تین سال سے بمبئی کو اپنی ہدایت و روحانیت کا مرکز بنا یا اور بے پایاں فیض پہنچایا، کیا معلوم تھا کہ بمبئی کا قیام سفر آخرت کی تیاری کے لیے ہے، اور یہیں سے رب کعبہ کے در پر پہنچ جائیں گے اور زندگی بھر کی بے نیازی اور استغناء یوں رنگ لائے گی کہ دو گز زمین بھی قبر کے لیے نہ لے سکیں گے، بڑی آن بان اور جلال وجمال کے بزرگ تھے، جذب وسلوک کی کیفیات کے دونوں رنگ مولانا میں پائے جاتے تھے، اس سے پہلے آپ نے حج وزیارت کا فریضہ ادا فرمالیا تھا، اب کے پھر مع خاندان ومسترشدین کے تشریف لے جارہے تھے۔

راقم کے استاذ الاستاذ تھے، بڑی محبت وشفقت فرماتے تھے، جب بھی آپ سے ملا، انتہائی شفقت ومحبت فرمائی اور دعائیں دیں، آخر ناز سفر حج سے ایک دن پہلے حاصل

ہوا تھا، دیر تک سینے سے لگائے رکھا، سر پر ہاتھ پھیرتے رہے، اور دعائیں دیتے رہے۔ حضرت کی ساری زندگی اللہ کے ذکر وفکر میں گزری تھی، حتی کہ دنیا سے گئے، اب حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں ان کے انداز پر اصلاح وتلقین کرنے والا کوئی نہیں رہا۔

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے اور راقم کے نانا حضرت مولانا احمد حسین صاحب متوفی ۱۳۵۹ھ رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانویؒ کے اس دور کے اجل تلامذہ میں سے تھے، جب کہ آپ جامع العلوم کانپور میں پڑھاتے تھے، اور راقم کی نانی مرحومہ حضرت تھانویؒ سے روحانی نسبت وبیعت رکھتی تھیں، اور ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ متوفی ۱۳۸۷ھ مولانا وصی اللہ صاحبؒ کے تلامذہ میں سے تھے۔ اس طرح ان حضرات میں کئی طرح کی علمی دینی اور روحانی نسبتیں قائم تھیں، مولانا محمد یحییٰ صاحب کبھی کبھی فتح پور جایا کرتے تھے، مولانا مرحوم سے راقم کی پہلی باقاعدہ ملاقات کوپا گنج میں ہوئی، مولانا شمس الدین صاحب حسینی نائب ناظم مدرسہ احیاء العلوم ساتھ تھے، ہم لوگ عشاء کے بعد نیاز حاصل کرنے گئے، بڑے انشراح سے ملاقات فرمائی اور صبح کو ناشتہ پر بلایا، میں کسی وجہ سے نہ جا سکا تو آدمی بھیج کر تلاش کرایا۔

میں نے اپنی کتاب ''افادات حسن بصریؒ'' پیش کی تو اسی مجلس میں پڑھ کر سنایا اور اس دن کی مجلس کا بیشتر حصہ اسی کتاب کی نذر فرمادیا، بزرگوں کی اس شفقت ومحبت کا کیا ٹھکانا ہے؟ میں نے اسی مجلس میں عرض کیا کہ حضرت کوپا گنج کی جامع مسجد کی جدید تعمیر کے وقت منبر کے اوپر تاج محل کا جو ٹائل پر نقشہ بنا ہے، اس کے گنبد کے اوپر صلیب کا نشان ہے، جو غیر شعوری طور سے لگ گیا ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اسے کھرچ دینا چاہیے، حضرت نے فوراً حکم دیا کہ ہاں فوراً دیکھا جائے اور اسے زائل کیا جائے، چناں چہ جب راقم دوسری بار کوپا گنج گیا اور اسے دیکھا تو واقعی اسے کھرچ کر صلیب کا نشان مٹا دیا گیا تھا۔

ایک بار مئو میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی معیت میں نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا، تب بھی بڑی شفقت ومحبت سے ملے اور چلنے لگا جب تو فرمایا کہ تم

جاتے ہو؟ میرا تو خیال تھا کہ تم دو تین دن رہو گے، اگر رہتے تو تم کو موٹر پر سیر کراتا، بعد میں میں نے اپنے کتاب ''رجال السند والہند'' اور بعض دوسری کتابیں پیش کیں تو بڑی دعائیں دیں، بمبئی تشریف لانے کے بعد متعدد بار نیاز حاصل ہوا، اور جب بھی ملے نہایت انشراح وانبساط اور محبت سے شفقت کے ساتھ ملے اور دعائیں دیں۔

مولانا وصی اللہ صاحبؒ اپنے مرشد حضرت تھانویؒ کی طرح سلوک وتصوف میں کتاب وسنت اور علوم دینیہ کو پورے طور سے ساتھ ساتھ لے کر چلے، اور ایک قدم بھی اس جادہ سے دور نہیں رکھا، ارشاد وتلقین کے ساتھ ساتھ تعلیم وتدریس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رکھا اور جہاں رہے خانقاہ کو مدرسہ بنائے رکھا۔

آخری دنوں میں صبح کی مجلس میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

جان ٹھہری، آنے والی آئے گی — آنے والی کس سے ٹالی جائے گی

خاک بھی تم سے نا ڈالی جائے گی — پھول تربت پر مری ڈالو گے کیا

یہ اپنی جگہ درست ہے کہ کسی کو اپنی موت کے بارے میں خبر نہیں کہ کب اور کہاں ہوگی مگر اہلِ دل وار بابِ صفا کو ذوق وشوق کی طرف سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے، چناں چہ یہی ہوا کہ حضرت مولانا کا وصال ایسی جگہ ہوا کہ جہاں ان کی قبر پر واقعی مٹی ڈالنے کا سوال بھی نہیں تھا، اللہ تعالیٰ مولانا کو آغوش رحمت میں جگہ دے اور ان کے سلسلۂ رشد وہدایت کو تادیر باقی رکھے۔

(البلاغ جنوری ۱۹۶۸ء)

ڈاکٹر میر ولی الدین حیدرآبادی

۱۹۷۸ء

ڈاکٹر میر ولی الدین حیدرآبادی کا انتقال تین ماہ قبل حیدرآباد میں ہوا، وہ جدید فلسفہ کے ماہر اور عثمانیہ یونیورسٹی کے معلم تھے، ساتھ ہی اسلامی تصوف کے رمز شناسوں میں سے تھے اور اس پر ان کی متعدد علمی اور معیاری تصانیف ہیں، ان کی زندگی احسان وتصوف مں ڈوبی ہوئی تھی، اور دل تقویٰ کی روشنی سے منور تھا، ان کے انتقال سے ہندوستان کے علمی حلقہ میں خلا پیدا ہوگیا ہے، خصوصاً مسلمانوں کے لیے ان کی موت خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(البلاغ ۱۹۷۸ء)

الحاج ولی اللہ صاحبؒ (بھونڈی)

افسوس کہ بھیمڑی کی معزز و محترم شخصیت جناب الحاج ولی اللہ جان محمد صاحب نے ۱۰؍صفر کی رات میں ساڑھے نو بجے انتقال فرمایا۔ رحمه الله عليه رحمة واسعة. انتقال کے وقت محترم حاجی صاحب کی عمر ستر کے قریب تھی۔ حضرت حاجی صاحب اپنے اخلاص وایثار، دینداری، مہمان نوازی، اقراء پروری اور سادگی میں اپنی مثال آپ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے صالح اولاد کے ساتھ صالح مال بھی عطا فرمایا تھا اور ان میں خیر کے کاموں میں خرچ کرنے اور خرچ ہونے کا فضل بھی ودیعت رکھا تھا۔ حاجی ولی اللہ صاحب جہانا گنج ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے۔ تعلیم گو معمولی تھی مگر دینیات کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ تبلیغی جماعت اور مدرسہ مفتاح العلوم بھیمڑی ان کی آخری عمر کے لیے محبوب ترین مشغلہ تھا۔ محترم حاجی صاحب نے ابتداء میں بڑی عسرت کی زندگی بسر کی، اور اسی حال میں بال بچوں کی پرورش کی، مگر چوں کہ زندگی دینی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے آگے چل کر اپنے فضل و کرم سے خاص طور پر نوازا۔ اور اس فضل خداوندی کی قدردانی حاجی صاحب نے اس طرح کی کہ وہ ہر کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اور بڑے اخلاص کے ساتھ محنت اور دولت خرچ کرتے تھے، متعدد حج ادا کئے۔ کئی بچوں کو حج وزیارت کی برکتوں سے اپنی زندگی میں مستفیض کرایا۔ مدرسہ مفتاح العلوم حضرت حاجی صاحب کے اخلاص وایثار اور دینداری کی زندہ نشانی ہے۔ اس سال بھی گھر کے چار پانچ نفر کے ساتھ حاجی صاحب حج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ حجاز مقدس سے بیمار واپس آئے، اور اسی بیماری میں داعی اجل کو

لبیک کہا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے، اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، اوران کو مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے تا کہ یہ خاندان اپنی دینی اور علمی روایت کو برقرار رکھ سکے۔

ساتھ ہی مدرسہ مفتاح العلوم کے معزز کار پردازان محترم الحاج عثمان غنی، رحیم اللہ صاحب، الحاج ماسٹر مبین، عبد الغفور صاحب اور الحاج محمد صابر صاحب اور صاحبزادہ الحاج محمد یونس صاحب وغیرہ سے گذارش ہے کہ اب ان حضرات کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں اور مرحوم کے لیے بے پناہ اخلاص وایثار کے خلاء کو ان حضرات کو پر کرنا ہے۔ لہٰذا دینی کاموں میں خاص طور سے مدرسہ مفتاح العلوم کے بارے میں اب بڑے حوصلہ اور دل وجگر کی ضرورت ہے۔ قحط الرجال کے دور میں ہماری مجلسوں سے ایسے بزرگوں کا اٹھ جانا ہمارے لیے بڑے ابتلاء وآزمائش کا معاملہ ہے۔

(انقلاب ممبئی)

ہارون خوشتر صاحب

۱۷ دسمبر کو ہمارے نہایت مخلص ، بے تکلف ، اور باغ و بہار دوست جناب ہارون خوشتر نے انتقال کیا، بمبئی آنے کے بعد ہی ان سے تعلقات صحافت کی راہ سے ہوئے تو آخر تک قائم رہے، دین داری، وضعداری، صاف گوئی، احباب نوازی جیسے اوصاف ان میں موجود تھے، بے نیازی اور بے باکی نے ان کو سخت حالات میں بعض اوقات مبتلا کیا مگر وہ اپنی وضعداری پر قائم رہے ، اور اپنی آن پر حرف نہیں آنے دیا۔ اللہ تعالیٰ ہارون خوشتر کی مغفرت فرمائے اور اپنی رحمت سے نوازے۔ (انقلاب ممبئی)

حضرت یحییٰ اعظمی

۲۲ رفروری ۱۹۷۲ء

افسوس کہ ۶ رمحرم ۱۳۹۲ھ ۲۲ رفروری ۱۹۷۲ء کو ہمارے ضلع کے مشہور شاعر حضرت یحییٰ اعظمیؒ نے انتقال کیا، اور دبستانِ شبلی و سہیل کے ایک کامیاب ترجمان سے یہ بزم خالی ہوگئی، مرحوم مہراج گنج کے رہنے والے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور میں تعلیمی خدمت انجام دی۔ پھر دارالمصنفین اعظم گڑھ سے یوں وابستہ ہوئے کہ تقریباً ۴۵ رسال تک اس سے وابستہ رہ کر شہر ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور دارالمصنفین کی علمی و ادبی بزم کے رکن رکین بن کر رہے۔ مرحوم تہذیب و شرافت اور وضعداری میں اپنی مثال آپ تھے، وہ اپنی وضع قطع، بود و باش اور رکھ رکھاؤ میں شروع سے آخر تک ایک حالت پر رہے۔ اور بقول مولانا آزاد وہ فطری شاعر تھے، ان کی شاعری کا اصل میدان نظم تھا، وہ جس مکتب شعر و ادب کے نمائندے تھے، اس میں بڑا انکھار پیدا کیا، ان کے دو مطبوعہ دیوان ادبی و علمی یادگار ہیں وہ اسٹیج کے شاعر ہوتے تو ملک کے صف اول کے شعراء میں شمار ہوتے ، پچھلے چند سالوں سے ضغط الدم کی شکایت تھی ، اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔ (البلاغ مارچ ۱۹۷۲ء)

شیخ یوسف عبداللہ الفوزانؒ

مئی ۱۹۷۷ء

مئی ۱۹۷۷ء کی ابتداء میں جناب شیخ یوسف عبداللہ الفوزان نے مکہ مکرمہ میں انتقال کیا، مرحوم ہندوستان میں مملکت عربیہ سعودیہ کے پہلے ممثل اور سفیر تھے، ان کا آبائی وطن سعودی عرب تھا، ان کے والد شیخ عبداللہ الفوزان بہ سلسلہ تجارت بمبئی میں مقیم ہو گئے تھے، وہ اپنے وقت کے کامیاب عرب تاجر تھے، بمبئی میں ان کا ذاتی مکان ہے، ساتھ ہی شیخ عبداللہ الفوزان علم دوست اور علماء نواز تھے، ان کے تعلقات علامہ شبلی نعمانی سے بھی تھے، ان کے صاحب زادے شیخ یوسف الفوزان بمبئی میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم حاصل کی اور اسماعیل کالج سے بی، اے پاس کیا، بمبئی ان کا دوسرا وطن تھا، اردو گویا ان کی مادری زبان تھی، گھر کی زبان عربی تھی، اس لیے عربی زبان میں رواں دواں بولتے تھے، ابتداء میں جب وہ سعودی حکومت کے معتمد تھے، انجمن خدام النبی کے ممبروں کے ساتھ جہاز اور گودی پر حجاج کو پانی پلانے کی خدمت انجام دیتے تھے اور نہایت بے تکلفی اور اخلاص سے حجاج کی دیگر ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کے بعد شاہ سعود مرحوم کے دور میں ہندوستان میں سعودی حکومت کے قنصل بن کر بمبئی سے دہلی چلے گئے اور کار مفوضہ بوجوہ احسن انجام دینے کے نتیجہ میں سفارت کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یہاں کئی سال نیک نامی اور کامیابی کے باوجود اپنے اخلاق و کردار میں فرق نہیں آنے دیا۔ بڑے متواضع، خلیق اور ملنسار تھے، اپنے دوست احباب میں بڑی سادگی اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے، بمبئی میں راقم اور ان کے درمیان جو تعلقات تھے، آخر تک قائم رہے، مرحوم نے عزیزی مولوی خالد کمال سلمہ اللہ کے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ اور روانگی

کے سلسلہ میں ہر طرح کی قانونی اور اخلاقی مدد فرمائی تھی، اور اسی بے تکلفی سے سب کام کیا کرایا، جو پُر خلوص دوستی میں ہوتا ہے، آخری ایام میں مختلف امراض کا شکار ہو گئے تھے، اسپین تک علاج کے لیے گئے، اور درمیان میں افاقہ بھی ہوا مگر وقت موعود کون ٹال سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے آمین۔

(البلاغ جون ۱۹۷۰ء)

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالیؒ

مئی ۱۹۷۰ء

افسوس کہ گزشتہ ماہ مئی ۱۹۷۰ء میں حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ نے انتقال فرمایا، مرحوم حضرت مجدد الف ثانی سے نسبی تعلق رکھتے تھے، اور ان کی زندگی میں مجددی علم وعرفان کا رنگ نمایاں تھا، بڑی خاموشی اور اخلاص سے بھوپال میں رُشد و ہدایت میں مشغول تھے اور ان کی خانقاہ رشد و ہدایت اور کتاب وسنت کا مرکز تھی، ادھر پچھلے چند سالوں سے ان میں خالص کشش پیدا ہو گئی تھی اور اربابِ علم وفضل ان کے یہاں حاضری دے کر فیوض وبرکات حاصل کرتے تھے، وصال کے وقت عمر اسی سال سے زائد ہی تھی، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور مسلمانوں کو ان کا بدل دے۔

(البلاغ جولائی ۱۹۷۰ء)

حاجی یار محمد صاحبؒ

۱۳؍ذی الحجہ ۲۵؍مارچ کو مالیگاؤں کے معمر بزرگ اور حاجی یحییٰ زبیر صاحب کے والدمحترم جناب حاجی یار محمد صاحب انتقال کر گئے، انتقال کے وقت ان کی عمر ایک سو دس (۱۱۰) سال کی تھی، وہ اپنے دورصد سالہ کی تاریخ تھے، اس اعتبار سے وہ اپنے اطراف و جوانب میں واحد و تنہا بزرگ تھے۔ ادھر چند سالوں سے پیرانہ سالی کے باعث خیر ہی خیر اور برکت ہی برکت بن کر رہ گئے تھے، انھوں نے اپنے سامنے کم از کم اپنی تین نسلوں کو پھلتے پھولتے دیکھا، یہ خوش نصیبی بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، وہ الہ آباد کے ایک گاؤں سے مالیگاؤں آکر آباد ہو گئے تھے اور یوپی اور مہاراشٹر کی مشترک تہذیب کی یادگار تھے۔ پوری زندگی دین داری اور خیر میں بسر کی تھی۔ روس وغیرہ میں اس عمر کے بوڑھوں کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، اور اس کو اس زمانہ میں اہم خبر سمجھا جاتا ہے کہ کہیں کوئی انسان سو سال یا اس سے زائد عمر کا رہ گیا ہے، کم عمری کے اس دور میں واقعی اتنی عمر کے انسان یادگار ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ حاجی یار محمد صاحب کی مغفرت فرمائے، اور ان کے تمام چھوٹے بڑے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین

(انقلاب ممبئی)

اصغر گونڈویؒ

اصغر گونڈوی مرحوم ہماری زبان کے ایک بلند پایہ شاعر تھے وہ صحیح معنوں میں حقیقت نگاری، بلند خیالی اور اپنی ممتاز ترکیب اور بندش میں اپنے دور کے شاعروں میں امتیازی شان کے مالک تھے ایک زمانہ میں اصغر اور غالب کے موازنے خوب خوب ہوئے اس حال میں کہ اصغر کے صرف دو مختصر سے مجموعے ''نغمۂ روح'' اور نشاط زندگی'' ان کی ادبی زندگی اور شاعری زندگی کے نتیجہ میں ہمارے پاس موجود ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اصغر مرحوم اپنی بلند پرواز شاعری اور الفاظ وتراکیب میں منفرد تھے اوران کا رنگ اس قدر بلند تھا کہ اس دور کا مذاق شاعری وہاں تک نہ پہونچ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اصغر جیسا بلند شاعر اتنی جلد گویا بھلا دیا گیا معلوم ہوا ہے کی اصغر کے وطن گونڈہ میں جلد ہی ''یادگار اصغر'' کے نام سے اجتماع ہونے والا ہے جس میں ملک کے اچھے اچھے شاعر وادیب شریک ہورہے ہیں۔ یہ اجتماع ۳۰۔۳۱ مارچ کو ہونے والا تھا مگر چونکہ ان دنوں میں علی گڈھ میں کل ہند ادیبوں اور ادبی کارکنوں کی ایک کانفرنس ہورہی ہے، اس لئے یادگار اصغر کا پروگرام فی الحال ملتوی ہوگیا ہے، ہم اصغر مرحوم کے سلسلے میں اس اجتماع کو خوش آمدید کہتے ہوئے امید رکھتے ہیں کہ اصغر کے بھلانے والے اپنی غلطی کا احساس کریں گے۔ اصغر اس بات کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کی ادبی یاد قائم کی جائے اور ان کے ذوق سے ادبی محفل کو زیادہ سے زیادہ مالا مال کیا جائے۔

روزنامہ انقلاب ممبئی

عابد علی جعفر بھائی

مرحوم عابد علی جعفر بھائی واقعی شروع سے آخر تک ایک مخلص بے لوث اور خادم انسان کی طرح رہے اور مزدوری سے منسٹری تک ان کی وضعداری میں کوی فرق نہیں آیا، ان کی بے لوثی اور بے تکلفی بلکہ دین کے معاملہ میں احساس ذمہ داری کا ایک واقعہ سنئے۔

وہ مجھے جانتے تھے اور میں انھیں جانتا تھا، بارہا ملاقات بھی ہوئی تھی، ایک مرتبہ جب کہ میں انجمن اسلام ہائی اسکول میں دینیات کا مدرس تھا، کاغذات کا بستہ لئے ہوئے آئے اور مجھ سے کہا کہ میں دینی اور مذہبی معلومات نہیں رکھتا میں نے ''مزدور سے منسٹر تک'' میں حج وزیارت کا تذکرہ کیا ہے اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بارے میں کچھ تفصیلی باتیں لکھی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ یہ پورا حصہ آپ دیکھ لیں اور جہاں جہاں غلط ہو یا تبدیلی درکار ہو اس میں حک واضافہ کر دیں میں نے ان کے خلوص اور دینی شعائر کے احترام کو محسوس کرتے ہوئے مسودہ لے لیا۔ پھر اسے لینے کے لئے دوبارہ خود ہی اسکول پہونچے، مگر کچھ کام رہ گیا تھا تو اپنے صاحبزادے کو کمرہ پر بھیج کر تصحیح شدہ مسودہ منگایا اور وہی اپنی خودنوشت سوانح عمری ''مزدور سے منسٹر تک'' میں رکھا، معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانہ میں مرحوم مرکزی حکومت کے نائب وزیر تھے، وہ مجھے اپنے یہاں بلا سکتے تھے یا درمیان میں کسی کو واسطہ بنا کر درپردہ یہ کام کرا سکتے تھے مگر ان کی بے لوثی اور بے تکلفی نے براہ راست یہ کام کرایا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

روزنامہ انقلاب ممبئ

جگر بسوانی

۹رمئی کو ہندوستان کے مشہور شاعر اور امیر مینائی لکھنوی کے شاگرد حکیم افتخار علی صاحب صدیقی جگر بسوانی اپنے وطن ضلع سیتاپور میں انتقال کر لئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۹۸ سال کی تھی۔ آپ عرصہ سے علیل تھے۔ موت برحق ہے اور ہم سب کو اسی راہ سے گزرنا ہے البتہ اس کی نوعیت مختلف ہے اور اسی وجہ سے ہم مرحوم جگر بسوانی کی موت کو علم وادب کے لئے ایک نقصان سمجھتے ہیں مرحوم حضرت امیر مینائی کی یادگار تھے اور لکھنؤ اسکول کے کامیاب شاعر تھے اور آخر تک شعر وسخن سے وابستہ رہے اردو کے بارے میں جو کش مکش چل رہی ہے اس میں اردو کے محسنوں کا اٹھنا بڑا ہی اندوہناک معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جگر بسوانی کی مغفرت فرمائے اور اردو زبان کو فروغ دے۔ (روزنامہ انقلاب ممبئی)

مسٹر فضل الحق

یہ عبرت کی جا ہے

مشرقی پاکستان کے سابق گورنر اور غیر منقسم بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ بلکہ شیر بنگال مسٹر فضل الحق ۸۹ سال کی عمر میں ڈھاکہ کے ایک اسپتال میں ۲۰راپریل کی صبح کو انتقال کر گئے۔ ادھر وہ عرصہ سے بیمار تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، مسٹر فضل الحق مرحوم ایک زمانہ میں بڑی شہرت وعزت کے مالک تھے اور ہندوستان کے چند گنے چنے افراد میں ان کا شمار ہوتا تھا مگر تقسیم کے بعد ان کے اقبال کا ستارہ غروب ہونا شروع ہوا تو پھر تھم نہ سکا اور موت نے اقبال وادبار کی کشمکش کو ختم کر دیا۔

ادھر چند سالوں سے کہنا چاہئے کہ وہ ختم ہو چکے تھے اور مرنے سے پہلے ہی مر گئے تھے، ایسے افراد کی موت کے موقع پر خاص طور سے دنیا کے اقبال وعروج کی بے ثباتی اور عزت وشہرت کی ناپائداری کا یقین بڑھ جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ ظاہری شان وشوکت اور عزت وشہرت کا انجام کیا ہوتا ہے؟ (روزنامہ انقلاب ممبئی)

عبدالرحمٰن سرکھوت

نقوش ماضی کے مصنفؒ

رمضان کے آخر میں جناب عبدالرحمٰن سرکھوت عرف لالہ میاں نے انتقال فرمایا، انتقال سے دو چار ماہ پیشتر مرحوم نے اپنے نوجوان صاحبزادے جناب آزاد شریوردھنی کی وفات کا جانکاہ صدمہ برداشت کیا، شاید بڑھاپے میں یہ صدمہ برداشت نہ ہوسکا، اور آپ خود دوسروں کے لئے صدمہ جانکاہ بن گئے،

جناب عبدالرحمٰن صاحب سرکھوت مرحوم شریوردھن ضلع فلابہ کے مشہور و معروف آدمی تھے، اگرچہ تعلیم و تربیت بہت اونچی نہیں تھی، مگر دل و دماغ بڑے علمی اور عملی تھے، عمر کا بہترین حصہ افریقہ میں گزارا تھا، گاندھی جی کی افریقہ والی تحریک میں ساتھ ساتھ تھے، اور وہاں رہ کر گاندھی جی کے اصول کار کے ماتحت کام کیا تھا،

آخر میں اپنے آبائی وطن شریوردھن میں سکونت پزیر تھے، مطالعہ بہت وسیع تھا، تاریخی معلومات میں خاص مقام رکھتے تھے،

آپ نے اپنے علمی مذاق کی مدد سے ''نقوش ماضی'' کے نام سے شریوردھن اور اس کے اطراف کی تاریخ لکھی، جس میں بڑی محنت اور کاوش سے مواد جمع کئے ان کی سطر سطر سے تحقیق و جستجو اور علمی وادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے، مرحوم سے پہلی ملاقات ربیع الاول ۱۳۶۳ھ میں ہوئی، جب کہ عید میلا النبی کے سلسلے میں شریوردھن کی مجلس اتحاد کی دعوت پر وہاں جانا ہوا تھا، عمر ۷۰۔۸۰ کے قریب تھی، بدن نہایت فربہ تھا، اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل تھا، مگر ہر وقت نماز کے لئے مسجد میں جاتے تھے بڑے بااخلاق، اور مخلص آدمی تھے، ارباب علم وفضل کی
قدردانی میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھتے تھے، ان کی ذوق سلیم نے ان کو اہل علم سے بہت نزدیک کردیا تھا، اثر پذیری اور رقت قلب کا یہ عالم تھا کہ بات بات پر بے اختیار رونے لگتے تھے،

مرحوم کے مرحوم صاحبزادے جناب آزاد بھی باپ کی طرح کم تعلیم کے باوجود علمی وادبی ذوق رکھتے تھے، اردو میں اشعار کہتے تھے، چند ماہ پیشتر جوان بیٹے نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، پھر بوڑھے باپ نے وہی راہ اختیار کی، جو ہم سب کے لئے متعین ہے، افسوس کہ اس طرح نقوش ماضی کا مصنف خود نقش ماضی بن کر اپنی کتاب کا ایک باب بن گیا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (روزنامہ انقلاب ممبئی)

سرعبدالرحیم

غیر منقسم ہندوستان کے مشہور سیاسی اور ملکی کارکن سرعبدالرحیم نے ۸۵ سال کی عمر میں کراچی شہر میں انتقال فرمایا۔

سرعبدالرحیم مرحوم کے والد کا نام مولوی محمد یحییٰ تھا، ابتدائی تعلیم مدنا پور گورنمنٹ ہائی اسکول (بنگال) اور پھر پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں ہوئی ۱۹۰۸ء میں مدراس ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ کے موقعہ پر رائل پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر کئے گئے۔ کمیشن کے خاتمہ کے بعد بنگال ایکزیکٹیو کونسل کے ممبر ہوئے اور محکمہ انصاف اور جیل کے وزیر مقرر ہوئے ۱۹۳۰ء میں مرکزی لجسلیٹیو اسمبلی دہلی کے ممبر منتخب ہوئے وہاں انھوں نے ''آزاد پارٹی'' کی قیادت کی۔ ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں حزب مخالف کے لیڈر رہے، ۱۹۳۵ء میں مرکزی اسمبلی دہلی کے صدر بنائے گئے،

ملک کی سیاسی زندگی میں سرعبدالرحیم مرحوم نمایاں شخصیت کے مالک تھے اپنے دور کے بہترین قومی کارکن اور ملک کے سچے بہی خواہ تھے، عرصہ سے دنیا سے کنارہ کش ہوکر گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ تقسیم کے کے بعد ان کی زندگی کے بقیہ دن اور پھر جسم پاکستان کو ملا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

روزنامہ انقلاب ممبئی

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ

علمی، دینی اور روحانی حلقوں کے لئے یہ خبر بہت ہی افسوسناک ہے کہ حضرت مولانا عبدالغنی صاحب پھول پوری رحمتہ اللہ علیہ ۱۲/اگست کو دوشنبہ کے دن چھ بجے شام کو کراچی میں فوت ہوگئے، اور رات کے بارہ بجے سابوش نگر کے عام قبرستان میں دفن کر دیئے گئے، مولانا مرحوم پھولپوری ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے تلمیذ خاص حضرت مولانا ماجد علی صاحب مانی کلاں جونپور کے خصوصی شاگرد تھے، ہمارے استاذ حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری اور مولانا پھولپوری اس نسبت سے آپس میں استاذ بھائی تھے اور اسی نسبت سے مولانا پھولپوری ہمارے مدرسہ میں سالانہ امتحان لینے کے لئے ذوق وشوق سے آیا کرتے تھے۔ مولانا پھولپوری قدیم دور کی آخری یادگاروں میں سے تھے، علمی استعداد بہت ٹھوس اور معقولات میں بہت اونچے تھے۔ حضرت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے خلفاء میں تھے۔ مزاج میں تندہی وتیزی تھی۔ کپڑے وغیرہ میں بے حد سادگی تھی۔ تقسیم سے پہلے لیگ اور کانگریس کی کشمکش میں مولانا ایک طرف اپنی اسی تیزی وتندی کے ساتھ رہے، یہ ان کے مزاج کی بات تھی ہم لوگوں کی طالب علمی کے زمانہ میں جب مولانا پھولپوری سالانہ امتحان کے موقع پر مدرسہ میں ہوتے تو ہم لوگ لڑکپن کے مزاج کے موافق ان کی ہیئت وکیفیت کو دیکھ دیکھ کر آپس میں عجیب عجیب رائے قائم کرتے تھے۔ ان ہی ایام کی بات ہے کہ ہمارے استاد مولانا شکر اللہ صاحب نے ہمیں الٰہیات میں مولانا فضل خیر آبادی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب ''الجواہر الغالیہ'' شروع کرائی جو مدراس میں متروک ہو چکی تھی اور بڑی مشکل سے اس دو نسخے مبارکپور میں مل سکے، ایک مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی صاحب ''الافادات القدسیہ فی الفلسفۃ الالٰہیہ'' کے

پاس سے اور دوسرا نسخہ راقم کے نانہال رسول پور سے، جب ہم اس کا زبانی امتحان دینے کے لئے مولانا پھولپوری کے سامنے آئے اور مولانا نے یہ کتاب دیکھی تو فرط خوشی سے اچھل پڑے اور فرمانے لگے کہ اچھا اب بھی اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے والے موجود ہیں، پھر اس طرح جم کر ہمارا امتحان لیا جیسے ہماری ہی طرح مولانا نے تیار کر رکھی تھے، یہ ان کے علمی تبحر کی ایک مثال تھی کہ مدت دراز کے بعد کتاب کے سامنے آتے ہی اس طرح سوالات کئے جیسے تمام فلسفیانہ الٰہیاتی مضامین ازبر ہیں اور یہ کتاب ابھی ابھی ان کے مطالع میں آچکی ہے اب ایسے جامع علم وفن اور صاحب فضل وکمال لوگ کہاں ملیں گے۔ ان کے علمی ودینی ذوق کی یادگار مدرسہ بیت العلوم قصبہ سرائمیر ضلع اعظم گڑھ میں موجود ہے، رحمۃ اللہ تعالٰی

روزنامہ انقلاب ممبئی

ڈاکٹر عبدالوہاب عزام

ہندوستان اور مشرق وسطیٰ بلکہ پوری دنیا کے علمی وادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت رنج وافسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مصر کے بہترین ادیب اور سیاستداں اور علم ودوست ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کا حال ہی میں وصال ہوگیا۔ مرحوم عربی، انگریزی، فرانسیسی کے ساتھ اردو زبان کے بہترین عالم تھے، مرحوم نے علامہ اقبال کے اردو کلام کو عرب ممالک میں عام کرنے میں بڑی خدمات انجام دی ہیں اور ان کا ترجمہ براہ راست اردو زبان سے عربی زبان میں کیا ہے، پہلے وہ پاکستان میں مصری سفیر تھے۔ آج کل سلطان سعود کی اسکیم کے ماتحت ریاض میں ''سعود یونیورسٹی'' کی تشکیل کی نگرانی کررہے تھے،

گذشتہ سال لاہور میں اسلامی کانفرنس میں بھی شریک ہوئے تھے، مرحوم اسلامی علوم وفنون کے پرجوش ترجمان تھے اور دنیا کی موجودہ علمی اور تحقیقی دوڑ میں اسلامی علوم وفنون کو آگے دیکھنا چاہتے تھے افسوس کہ مرحوم کے انتقال سے عالم اسلام کی ایک زبردست علمی شخصیت اٹھ گئی اور اردو زبان کے اس مصری ماہر کے اٹھ جانے سے اردو ادب کے ایک سرگرم ترجمان کی کمی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

روزنامہ انقلاب ممبئی

(فاطمہ خاتون) زوجہ قاضی ضیاء النبی مبارکپوری مرحوم

سطور ہذا کی تحریر سے پندرہ بیس منٹ پہلے شام کے ۵ بجے مکان سے والد محترم الحاج محمد حسن صاحب اور ظفر مسعود سلمہ کا غم نامہ آیا کہ ہمارے چھوٹے بھائی ضیاء النبی سلمہ کی بیوی فاطمہ بنت حافظ محمود ۲۴ ردسمبر کو ۵ بجے انتقال کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اور اسی رات میں ۱۱ بجے اس کی تجہیز وتکفین کردی گئی ہم لوگوں نے صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہے۔ آپ لوگ بھی صبر ورضا سے کام لیں۔ ہم اپنے متعلقین دوست واحباب اور ناظرین کرام سے التجا کرتے ہیں کہ مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔

اور ہمارے برادر عزیز میاں ضیاء النبی سلمہ اور دیگر متعلقین کے لئے صبر جمیل کی توفیق کی دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے کے علاوہ انسان کے لئے کوئی چارہ نہیں ہے۔ چاروناچار صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے صدمہ کے عین وقت صبر کرنا باعث اجر وثواب ہے اور اس میں پسماندگان کے لئے دنیاوی راحت اور آخری اجر ہے مرحومہ کے انتقال سے پانچ دن پہلے اس کے چھوٹے بچے (دس ماہ) کا انتقال ہوا اب ایک بچی ''حسنیٰ'' رہ گئی ہے اللہ تعالیٰ اس کی اس نشانی کو زندہ رکھے اور نیک بنائے۔

اس موقع پر گھر کے ہم تینوں آدمیوں (قاضی اطہر، حیات النبی اور مولوی خالد کمال) کا پردیس میں ہونا بری طرح کھل رہا ہے کی جس دلہن نے ہمارے گھر آکر اپنی مقدرت کے مطابق ہم سب کی خدمت کی، ہم اس کی دو مٹھی مٹی بھی نہ دے سکے۔ اور وہ بن سنور کر اللہ تعالیٰ کے یہاں چلی گئی

خط میں لکھا ہے کہ انتقال کے عین وقت اس نے اپنی بچی ''حسنیٰ'' کو یاد کیا اور اس کے بارے میں متعلقین کو کچھ کہتی رہی۔ حتیٰ کہ جب آواز بند ہوگئی اور ہونٹ ہلتے نظر

آئے اور کان لگا کر سنا گیا تو ''حسنیٰ'' کی آواز سنائی دیتی تھی۔ یہ ہے ایک ماں کا اپنی اولاد سے تعلق! دنیا چھوڑنے کا آخری وقت ہے خویش واقارب، ماں باپ، بھائی بہن، شوہر اور دوسرے لوگ، آس پاس بیٹھے ہیں سب کی نگاہیں بیمار کے دم واپسیں پر جمی ہیں مگر بیمار ان سب کے ہوتے ہوئے صرف اپنی اولاد کو یاد کررہا ہے اور اس کی جدائی کا غم اس کی الجھن میں الجھن ڈال رہا ہے، اگر ایک ماں میں اپنی اولاد کے لئے یہ جذبہ نہ ہوتا تو یقین کرنا چاہئے کہ کوئی ماں اپنی اولاد کو نو ماہ تک شکم میں تکلیف ومشقت سے لئے نہ رہتی اور پھر اپنے خون سے اسے نہ سینچتی اور رات دن اس کے لئے ایک نہ کئے رہتی۔

اے اللہ! چار، پانچ دن کے درمیان مرنے والے اس ماں اور اس کے بچہ کو اپنی رحمت سے نواز اور ان کی پہلو بہ پہلو قبر کو مغفرت کے پھول سے بھر دے اور ان کی موت کو ہمارے لئے ابتلاء نہ بنا بلکہ اپنی رحمت سے اسے ہمارے لئے وسیلہ بلندیٔ درجات کردے اور ہمارے بھائی جو بہت زیادہ غمگین اور غم خوردہ ہے صبر جمیل کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! تو ہم غریب الوطنوں کی یہ دعا سن لے، تو ارحم الراحمین ہے اور تو ہی موت وحیات کا خالق اور ان کا مالک ہے۔

روزنامہ انقلاب ممبئی

قاضی حیات النبیؒ مبارکپوری

آہ ثم آہ کہ میرے چھوٹے بھائی الحاج قاضی حیات النبی ۲۰؍صفر ۱۴۰۲ھ (۱۸؍دسمبر ۱۹۸۱ء) بروز جمعہ صبح سوا سات بجے دنیا سے رخصت ہوگئے اور عصر کے وقت ان کو ہزاروں کے مجمع میں سپرد خاک کر دیا گیا، اللّٰہم اغفرلہ وارحمہ

مرحوم مجھ سے عمر میں بارہ تیرہ سال چھوٹے تھے وہ رسمی مولوی نہیں تھے مگر بہت سے مولویوں سے زیادہ علمی و دینی معلومات رکھتے تھے، سمجھ بوجھ، معاملہ فہمی، اصابت رائے، صاف گوئی، قوتِ فیصلہ اور عزم و حوصلہ میں خاص ملکہ رکھتے تھے، قصبہ مبارکپور اور اطراف و جوانب کے ہزاروں چھوٹے بڑے جھگڑے ان کی ذات سے ختم ہوئے۔ ان کی وفات اس اعتبار سے پورے علاقہ کے لئے بہت بڑا خلاء ہے اور ہر شخص اس کو شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے بھائی نے بڑی صاف ستھری اور شان دار زندگی گزار دی، عسرت کے بعد کشادگی کا دور دیکھا مگر ہر دور میں ان کا معیار قائم رہا۔ دینی اعتبار سے بھی الحمد للہ مردِ مومن ہی رہے۔ معمولی گزر بسر میں اللہ تعالیٰ نے پانچ مرتبہ حج و زیارت کی دولت سے نوازا، دو حج کی اور تمنا تھی حج و زیارت سے عشق کی حد تک شغف تھا۔ جسمانی اعتبار سے ضعیف البیان تھے ''رسالہ البلاغ'' اور حج و مناسک کی کتابوں کی کتابت کرتے تھے، بچوں میں اور بڑوں میں یکساں محبوب و مقبول تھے، قصبہ اور اطراف کے بڑے بڑے جھگڑے نہایت بے باکی اور نہایت غیر جانبداری سے طے کرتے تھے، گھر پر رہتے تو ہر وقت دس پانچ آدمی اپنے معاملات ان کے سامنے پیش کیا کرتے اور پنچایت میں ان کو مخالف و موافق دونوں گروہ بلا تامل ثالث مان لیتے کیوں کہ وہ صحیح بات

میں کسی بڑے چھوٹے، امیر وغریب، عالم وجاہل کی ذرہ برابر رُورعایت نہیں کرتے تھے، تقریباً تیس سال سے میرے ساتھ بمبئی میں رہتے تھے آخر میں اکثر گھر رہنے لگے تھے اور سال میں دو تین بار بمبئی آتے تھے، وہ میرے سب کچھ تھے۔ ''حبس بول'' کی پرانی کی پرانی شکایت تھی ۱۳؍نومبر کو پیشاب رک گیا بڑی تکلیف رہی۔ بنارس لے جاکر علاج کیا گیا تکلیف ختم ہوگئی مگر ضعف بڑھتا رہا اور وہی بظاہر ان کی موت کا باعث ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ اور لوگوں کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

ان کی وفات میری علمی زندگی کے لئے بڑے ابتلاء کا باعث ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کو دور فرمائے۔ ناظرین کرام سے گزارش ہے کہ میرے بھائی کی مغفرت کے لئے دعا اور ایصال ثواب کریں۔ مرحوم نے دو لڑکے اور بیوہ کو چھوڑا ہے جو الحمدللہ ذمہ دار زندگی بسر کر رہے ہیں ان کے لئے بھی دعا کریں۔

حسن خاتمہ

دنیا میں ہر بھائی اپنے بھائی کے کام آتا ہے مگر میرے بھائی قاضی حیات النبی مرحوم کا معاملہ میرے ساتھ کچھ اور ہی ساتھ تھا، ہم پانچ بھائیوں میں وہ سب سے زیادہ معاملہ فہم اور جری تھے ان کو سب کی فکر رہا کرتی تھی۔ ان کا غم بیحد ہے مگر اس سے پورا سکون واطمینان ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں حسنِ خاتمہ کی جو علامتیں بتائی گئی ہیں وہ تقریباً سب ہی ظاہر ہوئیں۔ انھوں نے انتقال سے ایک دن پہلے اپنے خاص دوست کو بلایا اور ہنس کر کہا کہ ''اب ہم تو چلے'' مجھ سے پوچھا آج کون دن ہے میں نے پنجشنبہ بتایا تو کہا ''جمعہ کو عصر کے وقت'' یہ بات انھوں نے بے خبری کی حالت میں بتائی چنانچہ اسی وقت

دفن کیے گئے۔شبِ جمعہ ان کے وصال کی رات نہایت سکون واطمینان سے گزری۔ چہرہ بشاش، پرسکون اور روشن تھا نہایت آرام سے سوتے رہے اور آخرت کا سفر طے ہوتا رہا۔ کسی قسم کی تکلیف، گھبراہٹ اور بے چینی بالکل محسوس نہیں ہوتی تھی اور وہی ضعف آخری نقطہ پر پہونچ کر ذریعۂ انتقال بن گیا۔ آناً فاناً پورے قصبہ اور اطراف و جوانب میں اس کی خبر پھیل گئی اور ان کے جنازہ میں اس کثرت سے مسلمان شریک ہوئے کہ مبارک پور میں ایسا جنازہ مشہودہ دو چار ہی دیکھنے میں آیا، اور معلوم ہوا کہ اللہ اپنے اس بندے کو اپنے بندوں میں کتنی مقبولیت عطا کی تھی اس سے پہلے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔

کئی مجبوریوں کی وجہ سے ان کا جنازہ جمعہ میں نہیں لے جایا جاسکتا، مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس سے کئی گنا زیادہ آدمی نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہوئے، اسی طرح ہم نے تشہیر و اعلان کے ذرائع استعمال نہیں کیے اس کے باوجود خلقت ٹوٹ پڑی اور والہانہ انداز میں ان کو آخری منزل تک پہونہایا یہ سب علامتیں مرحوم کے حسنِ خاتمہ اور اللہ کے نزدیک مقبولیت کی ہیں جس سے بڑا سکون ہوتا ہے۔

(روزنامہ انقلاب ممبئی ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۱ء)

مورّخِ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی مطبوعہ تصانیف کی فہرست

عربی تصانیف

(۱) رجال السند والهند الى القرن السابع:

ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ساتویں صدی ہجری تک کے ارباب فضل وکمال کا تذکرہ جو تاریخ وتذکرہ اور سیرت وجغرافیہ کا عطر ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ۳۲۸ رصفحات پر مشتمل محمد احمد میمن برادران بمبئی نے مطبع حجازیہ سے شائع کیا۔ دارالانصار قاہرہ (مصر) نے ۱۹۷۸ء میں اضافہ شدہ ایڈیشن دو جلدوں میں چھاپا، جو ۵۸۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) العقد الثمين فى فتوح الهند ومن ورد فيها من الصحابة والتابعين:

ہندوستان میں جو صحابہ وتابعین، محدثین وفقہا تشریف لائے، ان کی خدمات کی مبسوط تاریخ، ۱۹۶۸ء میں پہلی بار ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی بمبئی نے ۳۳۵ رصفحات میں دوسری بار دارالانصار قاہرہ (مصر) نے ۱۹۷۹ء میں طبع کرایا، جو ۲۳۱ رصفحات پر مشتمل ہے۔

(۳) الهند فى عهد العباسيين:

اس سے عہد عباسی میں ہندوستان کے تعلقات و روابط کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ ۸۷ رصفحات میں دارالانصار قاہرہ (مصر) نے ۱۹۷۸ء میں شائع کرایا۔

(۴)جواهر الاصول فی علم حدیث الرسول:

حدیث کے اصول پر اہم علمی کتاب جو حوالہ جاتی کتب میں سے ایک اہم کتاب ہے۔ مورّخِ اسلامؒ نے اس کی تحقیق وموازنہ میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔۱۹۷۳ء میں ۱۶۰ر صفحات پر شرف الدین الکتبی واولادہٗ بمبئی نے چھاپا۔اس کی طبع ثانی دارالسّلفیہ بمبئی اور مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ نے طبع ثالث کی۔

(۵)تاریخ اسماء الثقات:

ابن شاہین بغدادی کا مخطوطہ ہے۔ جسے قاضی صاحب کے مقدمہ کے ساتھ شرف الدین الکتبی واولادہٗ بمبئی نے شائع کیا۔ یہ کتاب متنی تحقیق کی عمدہ مثال ہے۔ ۱۹۸۶ء میں ۲۳۵ر صفحات پر مشتمل اشاعت پزیر ہوئی۔

(۶) العرب والهند فی عهد الرساله:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب سے عہد رسالت میں عرب و ہند کے درمیاں گونا گوں تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ دراصل یہ کتاب مورّخِ اسلامؒ کی اُردو تصنیف ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' کا عربی ترجمہ ہے۔ جسے مصر کے ایک ازہری عالم شیخ عبدالعزیز عزت نے ترجمہ کیا ہے۔انہوں نے جامعہ ازہر میں اُردو زبان پڑھی تھی۔شاہ فاروق کے زمانہ میں شعبۂ اُردو کو ایک ازہری عالم محمد حسن مبارکپوری اعظمی نے جامعہ ازہر میں قائم کیا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں الهيئة المصريه العامة للكتاب قاہرہ سے شائع ہوئی، جو ۱۴۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۷) حکومات العرب فی السند والهند:

جیسا کہ عنوان سے پتہ چلتا ہے، عربوں کی اسلامی حکومتیں ہندوستان میں اسلام کی ابتدائی صدیوں میں تھیں۔عربوں نے ہندوستان پر اسلامی علوم وفنون اور اپنی تہذیب کے کیا

اثرات چھوڑے ہیں، یہ کتاب اسی کی جھلکیاں پیش کرتی ہے۔

یہ کتاب مورّخِ اسلامؒ کی اُردو تالیف (ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں) کا عربی ترجمہ ہے۔ جسے مصر کے مشہور عالم ڈاکٹر عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے کیا ہے۔ سعودی عرب ریاض سے یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۵ء میں طبع ہوئی۔

(۸) دیوانِ احمد:

مولانا کے نانا مولانا احمد حسین رسول پوری کے عربی کلام کا مجموعہ ہے۔ جو مورّخِ اسلامؒ کی ترتیب ومقدمہ کے ساتھ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ مولانا محمد یحییٰ رسول پوری کا علمی تعاون بھی مولانا کو حاصل رہا۔ یہ دیوان ۴۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔

اُردو تالیفات

(۹) اسلامی شادی:

خیر القرون میں اسلامی شادی بیاہ اور حقوق زوجین کی نوعیت احادیث کی روشنی میں بتائی گئی ہے۔ یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جو صرف ۳۵ رصفحات کا ہے۔ اس کو ۱۹۸۵ء میں مکتبۃ الحق جوگیشوری بمبئی نے شائع کیا تھا۔ دوبارہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا اور فرید بک ڈپو دہلی نے ۲۰۰۵ء میں چھاپا، جو ۵۶ رصفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۰) اسلامی نظام زندگی:

ایک مسلمان کو دنیا میں کس طرح زندگی گزارنی چاہیے اس کا بیان ہے۔ کتاب جیبی سائز ۲۵۶ رصفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو الحاج عبداللہ سمکری ابن حاجی احمد مکی نے رفاہِ عام کے لیے اپنی طرف سے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا تھا۔ ادارہ فیضان معرفت بلساڑ گجرات نے مارچ ۲۰۰۴ء میں طبع کیا۔ جو بڑے سائز کے ۱۶۰ رصفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۱) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ:

ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون، مسلمانوں کی علمی ودینی اور تاریخی وتمدنی سرگرمیوں کے حوالے سے اہم پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا وجود ہندوستان کے لیے موسم بہار ثابت ہوا۔ یہ کتاب ۲۴۳ رصفحات پر مشتمل ہے۔ ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

(۱۲) افاداتِ حسن بصری:

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و واقعات میں ۵۶/صفحات کا کتابچہ ہے۔جس کو دائرہ ملیہ اسلامیہ مبارکپور نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا تھا۔دوبارہ فرید بک ڈپوئی دہلی سے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا گیا۔

(۱۳) ائمہ اربعہ:

اس میں امام ابوحنیفہؒ، امام حنبلؒ، امام شافعیؒ اورامام مالکؒ کے حالات وفقہ پر اجمالی بحث کی گئی ہے۔کتاب ۲۵۵/صفحات پر مشتمل ہے۔جس کو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۹ء میں اہتمام سے طبع کراکے شائع کیا ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن مکتبہ تنظیم اہل سنت لاہور نے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔

(۱۴) آثار واخبار:

چار علمی، دینی، تاریخی مقالات کا مجموعہ ہے۔جو ۱۵۰/صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں تین مقالات آل عبدالرحمٰن سلیمانی، آل ابومعشر سندی اورآل مقسم قیقانی بصری کا تعلق قدیم اسلامی ہند کے علمی و دینی خانوادوں سے ہے، جوقدیم زمانے سے عرب میں مقیم تھے۔چوتھا مقالہ امام ابوالحسن مدائنی کے سوانح پر ہے، جواسلامی ہند کے پہلے مورخ ہیں۔یہ کتاب نومبر ۱۹۸۸ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے اشاعت پزیر ہوئی۔

(۱۵) آسودگانِ خاک:

ان معروف وگم نام لوگوں کا تذکرہ ہے جو پیوند خاک ہو چکے ہیں۔ان کی چالیس سالہ علمی زندگی میں روزنامہ انقلاب اور ماہنامہ البلاغ ممبئی میں ان کی اشاعت ہو چکی ہے۔ یہ کتاب ۳۲۲ صفحات پر مشتمل ہے، ناشر قاضی اطہر اکیڈمی مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ، اترپردیس، انڈیا

(۱۶) بناتِ اسلام کی علمی و دینی خدمات:

یہ کتاب خواتین اسلام کی دینی و علمی خدمات پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کو بمبئی کے مشہور مکتبہ شرف الدین الکتبی واولادہ' نے شائع کیا تھا۔ دوبارہ اس کو دائرہ ملیہ مبارک پور کی طرف سے شائع کیا گیا۔ تیسری بار اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی سے ۲۰۰۶ء میں مطبوع ہوئی جو ۱۰۴ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۷) تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں:

اس کا موضوع نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جو صرف ۳۵ر صفحات کا ہے۔ اس کو ۱۹۸۵ء میں مکتبۃ الحق جوگیشوری بمبئی نے شائع کیا تھا۔ دوبارہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا اور فرید بک ڈپو نئی دہلی نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا، جو ۱۳۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۸) تدوین سیر و مغازی:

یہ کتاب ۳۲۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اپنے موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ جو علم و تحقیق کا شاہکار ہے۔ اس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۸۰ء میں اور فرید بک ڈپو نئی دہلی نے ۲۰۰۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔

(۱۹) تذکرۂ علمائے مبارکپور:

یہ قاضی صاحب کی پچیس سالہ تحقیق و تلاش کا ثمرہ ہے۔ اس سے مبارکپور کی ساڑھے چار سو سالہ تاریخ، مدارس و مساجد اور شخصیات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب ۲۹۲ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو دائرہ ملیہ مبارکپور نے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا تھا۔ ترمیم و اضافہ کے بعد ۲۰۰۸ء میں دوبارہ شائع ہو رہی ہے اور ۵۷۳ر صفحات پر شامل ہے۔ ناشر قاضی اطہر اکیڈمی مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ، اتر پردیش، انڈیا۔

(۲۰) جواہر القرآن:

مورّخِ اسلامؒ نے مسلسل چالیس سال تک روزنامہ انقلاب بمبئی کے لیے جواہر القرآن کے عنوان سے قرآن مجید کی آیات کی تفسیر لکھی۔ جس میں عصری حالات و مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔ یہ کتاب مولانا کی قرآن فہمی اور تفسیری علوم پر ان کی مکمل دستگاہ کی تحریری دستاویز ہے۔

(۲۱) حج کے بعد:

یہ مختصر سا رسالہ ہے۔ جو ۴۰ر صفحات کا ہے۔ انجمن خدام النبی بمبئی نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا تھا۔ دانش بک ڈپو ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر نے جون ۲۰۰۴ء مین اور فرید بک ڈپو نئی دہلی نے ستمبر ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔

(۲۲) خلافت راشدہ اور ہندوستان:

خلافت راشدہ کے عہد مبارک میں ہندوستان میں مسلمانوں سے تعلقات کی نوعیت، علمی و دینی اور فکری و تمدنی اخذ و استفادہ اور سیاسی و سماجی حالات کا بیان ہے۔ یہ کتاب ۲۸۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو شائع کیا۔ بعد میں تنظیم فکر و نظر سندھ پاکستان نے اس کا نیا ایڈیشن چھاپا۔

(۲۳) خلافت بنوامیّہ اور ہندوستان:

یہ بھی عرب و ہند تعلقات اور مسلمانوں کی علمی و دینی سرگرمیوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قاضی صاحب کے قلم نے ماضی کے نہاں خانوں کی خوب سیر کرائی ہے۔ یہ کتاب ۶۷۱ر صفحات پر مشتمل ہے۔ ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔ پھر تنظیم فکر و نظر سندھ پاکستان نے اپنے یہاں سے اس کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔

(۲۴) خلافت عباسیہ اور ہندوستان:

اس میں عباسی دورِ خلافت میں مسلمانوں اور ہندوستان کے درمیان کے تعلقات کی وضاحت ہے۔ یہ تاریخ وتذکرہ نگاری کی عمدہ روایت اور اسلامی اثرات کا نادر نمونہ ہے۔ کتاب ۵۵۸ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ دوبارہ تنظیم فکرونظر سندھ پاکستان نے اپنے اہتمام میں چھاپا۔

(۲۵) خواتین اسلام کی علمی ودینی خدمات:

یہ کتاب پہلے ''بنات اسلام کی علمی و دینی خدمات'' کے نام سے شرف الدین الکتبی بمبئی اور دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا۔ بعد میں کچھ حک واضافہ کے بعد اس کو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے شائع کیا۔ کتاب میں مزید معلومات کا اضافہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲۶) خیر القرون کی درسگاہیں اور اُن کا نظام تعلیم وتربیت:

اس کتاب میں خیر القرون کی اسلامی درسگاہوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ عہد رسالت سے دورِ صحابہ وتابعین تک کے علمی حلقوں، طریقۂ تدریس اور نظامِ تعلیم کا بیان تاریخ وسیر کی کتابوں کی مدد سے کیا گیا ہے۔ ۳۹۲ر صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۹۵ء میں شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے اس کو شائع کیا۔ دوبارہ فرید بک ڈپوئی دہلی سے ۲۰۰۴ء میں اشاعت پزیر ہوئی۔

(۲۷) دیارِ پورب میں علم اور علماء:

پوربی اضلاع کی سات سوسالہ علمی ودینی تاریخ، یہاں کے علمی خانوادوں کی خدمات، اہم تصنیفی کارناموں کی تفصیلات، علماء وصوفیاء کے تمدنی آثار، مدارس وخانقاہوں کے احوال مستند کتابوں کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۴۸۲ر صفحات پر مشتمل ہے۔ جس

میں مشرقی ہندوستان میں علمی سرگرمیوں کا محققانہ تذکرہ ہے۔اس کو بھی ندوۃ المصنفین دہلی نے پہلی بار ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔دوسری بار ۲۰۰۸ء میں البلاغ پبلیشرز دلی نے شائع کیا جو ۵۱۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲۸) صالحات:

یہ بھی ۶۴ر صفحات کا کتابچہ ہے۔ جو خاص طور پر خواتین کے لیے لکھا گیا تھا۔ یہ پہلی بار بمبئی سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔دوبارہ انصار گرلس انٹر کالج مبارکپور ضلع اعظم گڑھ نے شائع کیا۔

(۲۹) طبقات الحجاج:

یہ ۱۹۵ر صفحات کی کتاب ہے۔جس کو انجمن خدام النبی صابو صدیق مسافر خانہ بمبئی نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا اور فرید بک ڈپو دلی نے ۲۰۰۶ء میں طبع کرایا۔جو ۳۶۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۳۰) عرب و ہند عہد رسالت میں:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عرب و ہند کے درمیان جو مختلف نوع کے تعلقات تھے، ان پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔۱۹۶۴ء میں اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔اس کو مصر کے ایک مشہور عالم الدکتور عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے عربی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۷۳ء میں الھیئۃ المصریہ قاہرہ نے اس کو شائع کیا۔سندھ (پاکستان) کی تنظیم فکر و نظر نے اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کرکے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔کراچی کے ایک ادارہ مکتبہ عارفین نے بھی اسے طبع کرایا۔فرید بک ڈپو نئی دہلی نے مئی ۲۰۰۴ء میں اور مکتبہ الحق جوگیشوری بمبئی نے ۲۰۰۷ء میں اس کی اشاعت کی۔

(۳۱) علمائے اسلام کی خونیں داستانیں:

پہلی صدی ہجری سے موجودہ دور تک کی اسلامی تحریکوں اور مسلم حکومتوں کے فتنوں میں علمائے اسلام کو دارورسن کی جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا، اُس کی داستان اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب احسان دانش کے اصرار پر لکھی گئی تھی، مگر اس کی اشاعت تقسیم ہند کے ہنگاموں کی نذر ہو گئی تھی۔ ساٹھ سال بعد اس کا مسودہ دستیاب ہوا اور ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی، جو ۲۴۸ر صفحات پر مشتمل ہے، ناشر قاضی اطہر اکیڈمی مبارکپور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش انڈیا۔

(۳۲) علمائے اسلام کے القاب وخطابات:

یہ کتابچہ علمائے اسلام کے القاب وخطابات پر انتہائی تحقیقی مقالہ ہے۔ جس کو کتابی شکل دی گئی ہے۔ یہ مقالہ آپ کی کتاب (مآثر ومعارف) میں شامل ہے۔ خاص طور سے اس سے مدارسِ عربیہ کے طلباء عزیز استفادہ کر سکتے ہیں۔ تاریخی اور تحقیقی طور پر بتایا گیا ہے کہ کون سا لقب کب اور کس کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ کی شکل میں ۴۸ر صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۴ء میں پہلی بار فرید بک ڈپو دلی نے شائع کیا ہے۔

(۳۳) علی وحسین:

یہ چھوٹے سائز کے ۳۳۶ر صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک کتاب کی تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کو ۱۹۶۰ء میں مکتبہ دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا۔ پاکستان سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی اور اسلامک بک فاؤنڈیشن دلی نے بھی ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔ جو ۲۹۶ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۳۴) قاضی اطہر مبارکپوری کے سفرنامے:

یہ سفرنامہ مورّخ اسلامؒ کے اُن علمی ودینی اور تہذیبی وتاریخی دَوروں کی تفصیل بیان

کرتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ہندوستان اور بلادِ اسلامیہ وعربیہ اور ممالک افریقہ کے حوالے سے مولانا کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئے۔ یہ سفرنامہ عام سفرناموں سے مختلف اور انتہائی معلوماتی و تحقیقی ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ مورّخِ اسلامؒ کی نظر اسلامی و دینی پہلوؤں کی طرف خاص طور سے اُٹھتی تھی اور ان کا قلم علوم و معارف کی کہکشاں بناتا تھا۔ اس کو قاضی اطہر اکیڈمی لکھنؤ نے اگست ۲۰۰۵ء میں ۳۴۹ر صفحات پر مشتمل شائع کرایا۔

(۳۵) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک:

یہ قاضی صاحب کی خودنوشت نہایت مختصر آپ بیتی ہے۔ پہلے اس کو دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا۔ پھر مکتبہ صوت القرآن دیوبند نے دوسرا صاف ستھرا ایڈیشن شائع کیا۔ اس کے صفحات ۵۶ر ہیں۔

(۳۶) کاروانِ حیات:

خودنوشت سوانح حیات کو ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپور نے اپنے قاضی اطہر مبارکپوری نمبر اگست تا دسمبر ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔ دوبارہ الگ سے کتابی صورت میں فرید بک ڈپو دہلی نے ۲۰۰۴ء میں بہت خوب صورت انداز میں چھاپ کر شائع کیا۔ اس میں ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ جو ۲۳۸ر صفحات پر مشتمل ہے۔

(۳۷) مآثر و معارف:

یہ پچیس مقالات کا مجموعہ ہے۔ مختلف موضوعات مثلاً حدیث کی جمع و تدوین، دارِارقم کی علمی مرکزیت و حیثیت، تاریخ و رجال، فرقہ و مکاتب فکر، یوروپ میں مسلمانوں کی علمی خدمات وغیرہ پر محققانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ۲۷۱ر صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کو ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔

(۳۸) محمد کے زمانہ کا ہندوستان مع ہندوستان صحابہ کے زمانہ میں:

ناشر فرید بک ڈپو دلی۔ صفحات ۳۶۶ رسن طباعت ۲۰۰۵ء۔ اصل میں یہ کتاب مورّخِ اسلام کی دو کتابوں کی تلخیص ہے۔ پہلا حصہ ''عرب و ہند عہد رسالت میں''۔ دوسرا حصہ ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' سے ملخص ہے اور دونوں کو ایک جلد میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کی تلخیص وتسہیل کرنے والے ایک پاکستانی عالم جناب مولانا ابومجاہد شمشیر ہیں۔ یہ کتاب پہلے مکتبہ ارسلان بنوری ٹاؤن کراچی پاکستان سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد فرید بک ڈپو دلی نے اسی کا عکسی ایڈیشن طبع کرایا۔

(۳۹) مسلمان:

اسلامی آداب معاشرت پر ایک عام فہم انداز کا ۶۴ رصفحات پر مشتمل کتابچہ ہے۔ جس کو جمعیۃ المسلمین جنجیرہ بمبئی نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا تھا۔ دوبارہ انصار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر اکیڈمی مبارکپور نے ۱۹۷۶ء میں پھر انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی نے شائع کیا۔ ساجد لکھنوی نے بھی لکھنؤ سے شائع کیا۔ فرید بک ڈپوئی دہلی نے ۲۰۰۴ء میں اور انجمن شیخ الہند قاسم آباد انجان شہید ضلع اعظم گڑھ یوپی نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا۔

(۴۰) مسلمانوں کے ہر طبقے میں علم وعلماء:

یہ کتاب ۲۲۸ رصفحات میں قاضی صاحب کی وفات کے بعد چھپی اور اس پر مقدمہ بھی قاضی صاحب کے قلم سے ہے۔ اس کو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے بڑے خوب صورت انداز میں ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔

(۴۱) مطالعات وتعلیقات:

اس میں مورّخِ اسلام کے وہ مقالات ہیں جو ماہنامہ البلاغ ممبئی کی ۲۶/سال تک آپ کی اڈیٹری میں مستقل عنوان سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ کتابوں کے مطالعہ کے بعد تعلیقات وتبصرہ کی صورت میں یہ مضامین نہایت پرمغز اور تحقیقی ہوا کرتے تھے۔

(۴۲) معارف القرآن:

توحید، رسالت، کتاب اور دینی زندگی کے عنوانات پر قرآن کریم کی ایک سو آیات کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔ یہ ۱۵۰/صفحات کی کتاب ہے۔ جس کو تاج کمپنی بمبئی نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا۔ کتب خانہ فیض ابرار انکلیشور ضلع بھروچ گجرات نے ۲۰۰۶ء میں دوبارہ چھاپا۔

(۴۳) مکتوبات امام احمد بن حنبل:

اس کتابچہ میں امام احمد بن حنبل کے مکتوبات ہیں۔ جو مختلف اوقات میں مختلف طبقہ کو قرآن وحدیث کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ یہ مکتوبات ایمان ویقین کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس رسالہ کو فہیم بک ڈپو مئو ناتھ بھنجن یوپی نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا ہے۔ جو ۴۸/صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴۴) مئے طہور:

قاضی صاحب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جو ''مئے طہور'' کے نام سے مرتب ہوکر مولانا قمر الزماں مبارکپوری کے مبسوط مقدمہ کے ساتھ فرید بک ڈپو دہلی کی طرف سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوچکا ہے۔ جو ۴۵۸/صفحات پر مشتمل ہے۔ ناشر قاضی اطہر اکیڈمی مبارکپور ضلع اعظم گڑھ اتر پردیش انڈیا۔

(۴۵) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں:

جیسا کہ عنوان کتاب سے متبادر ہے۔اس کتاب میں عربوں کی حکومت اور ہندوستان کی سیاسی وسماجی، علمی ودینی اورتمدنی زندگی پراسلام کے اثر ونفوذ کی مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ۳۴۰ رصفحات پر مشتمل ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ عارفین کراچی نے شائع کیا۔تنظیم فکرونظر سندھ پاکستان نے اس کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا۔مصر کے دکتورعبدالعزیزعزت عبدالجلیل نے اس کا عربی میں ترجمہ کرکے ’’حکومات العرب فی السند والهند‘‘ کے نام سے شائع کیا اوراس کواسلام آباد یونی ورسٹی پاکستان کے مجلّہ الدراسات العلمیۃ نے قسط وار شائع کیا۔پھر مکتبہ آل یداللہ بکر یہ ریاض نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

(۴۶) ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت:

یہ رسالہ اصل میں ایک مقالہ ہے۔ جوسندھ پاکستان کی ادبی سندھی کانفرنس منعقدہ ۱۹۸۴ء میں مورّخِ اسلامؒ نے خود شریک ہوکر پڑھا تھا۔ اس میں پوری تحقیق کی گئی ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث ابتداء اسلام میں آیا ہے۔ جب اسلام کی روشنی سندھ میں پہنچی تو ساتھ ہی یہ بہار بھی آئی۔ناشر فہیم بک ڈپو مئوناتھ بھنجن صفحات ۴۸ رطباعت ۲۰۰۶ء۔ناشر فرید بک ڈپو دلی صفحات ۴۸ رطباعت ۲۰۰۶ء۔